سلسلۂ مطبوعات نمبر ۲

مضامین سید سلیمان ندوی

حصہ اوّل

مرتبہ

ابو سلمہ شفیع احمد بہاری

شایع کردہ
مکتبہ علم و حکمت سکونت کلاں بہار شریف (پٹنہ)
قیمت ---- للعبر

۲۹۹۷۲

فہرست مضامین

13 JUL 1963
۷۳
CHECKED

نمبر شمار	مضامین	صفحہ
۱	عرض مرتب	۲
۲	اسلام	۱
۳	قرآن پاک کا تاریخی اعجاز	۱۱
۴	اسوۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم	۱۸
۵	حقیقت صوم	۳۰
۶	کیا قرآن رسول کا کلام اور انسانی تعلیمات سے ماخوذ ہے؟	۳۸
۷	وحی از روئے قرآن اور مدعی کا تضاد بیان	۵۴
۸	وحی کے اقسام	۷۲
۹	علوم القرآن	۸۹
۱۰	پھر واقدی، امام زہری پر الزام۔ پروفیسر گولیم انگلینڈ کا خط	۱۲۳
۱۱	خلیل اللہ کی بشریت	۱۵۳
۱۲	ذبح عظیم	۱۷۵
۱۳	قربانی کا اقتصادی پہلو	۱۸۲
۱۴	اسلام میں حیوانات کے ساتھ سلوک	۱۹۱

نمبر شمار	مضامین	صفحہ
۱۵	اسلام اور سوشیلزم	۲۰۰
۱۶	رومن کیتھولک تاریخ کی چند من گھڑت کہانیاں	۲۳۳
۱۷	نئی صورت حال کی ایک پرانی دستاویز	۲۴۷
۱۸	اندراج نکاح و طلاق اور تقرر قضاۃ	۲۴۹
۱۹	تاج محل اور لال قلعہ کے معمار	۲۷۵
۲۰	عربوں کی بحری تصنیفات	۳۲۷
۲۱	عربیا اور امریکہ	۳۵۰

عرض مرتب

میں مخطوطات اور کتب نادرہ کی تفحص و تلاش اور اس کی نشر و اشاعت کے ساتھ گہری دلچسپی رکھتا ہوں لیکن ایک بے بضاعت اور محدود وسائل ہستی کے لئے اس پر خطر وادی کی پابجولی آسان نہیں ہے۔ میں بلا تصنع کہتا ہوں کہ ظاہری اسباب کچھ بھی نہیں۔ صرف میری بلند ہمتی اور پختگی عزم ہے۔ جو قدم میں لغزش نہیں آنے نہیں دیتی۔ نیز اکابرین کی حوصلہ افزائی بھی ہمارے عزم و ارادہ کو مستحکم بنائے ہوئے ہے۔ حضرت مولانا مناظر احسن صاحب گیلانیؒ اس طرح میرے جذبات کو برانگیختہ کرتے ہیں:۔

> ”آپ کے خط کو پڑھ کر میں تو اچھل پڑا۔ بہارا! یارا ازیں گیاہ ضعیف ایں گمان نہ بود۔ میرے دل کی آرزو گویا آپ نے چھین لی“

پھر بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہمت و ارادہ کی پختگی پائے ثبات میں لغزش آنے تو نہیں دے سکتی۔ لیکن راہرو کے قدم میں حرکت کس طرح پیدا کر سکتی ہے۔ چنانچہ ہمارے اکابرین میری بے سروسامانی پر مضطر ہیں حضرت مولانا ابو الکلام آزاد ایک گرامی نامہ میں فرماتے ہیں:۔

> ”غیر مطبوعہ کتابوں کی اشاعت کا کام بلاشبہ اہم ہے

لیکن جب تک سر وسامان نہ ہو کیا ہو سکتا ہے"

حضرت مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی رقمطراز ہیں :-

" یہ تو فرمائیے، اتنی بڑی ہمت آخر کس بنیاد پر ہے
خدا کرے اللہ کا کوئی بندہ آپ کو مل گیا ہو۔ بڑا کام
کر گذرینگے "

اور یہ میری بے سروسامانی خود میرے لئے بھی عقدہ لاینحل ہے۔

لیکن ہم نے خدا کا نام لے کر کام شروع کر ہی دیا اور اس سلسلہ کا سب سے پہلا قدم "معرفۃ السنن والآثار" للبیہقی کی تصحیح وطباعت ہے۔ یہ کتاب مسائل فقہیہ کا دائرۃ المعارف اور ایک قابل قدر کتاب ہے جو عرصہ سے نایاب تھی۔ گرچہ یہ کام میرے حسب منشا انجام نہ پا سکا۔ اور کما ینبغی اس کی تصحیح وتکمیل نہ ہو سکی۔ لیکن اس علمی کساد بازاری کے دور میں یہ بھی امر غنیمت ہے۔

اس کے بعد ابن حبان کی تصانیف اور کتاب الالزامات علی الصحیحین للدارقطنی پر کام کر ہی رہا تھا کہ ہندوستان انقلابی دور سے گذرا۔ اور عام مسلمانونکی تحیر وتنزل کو دیکھتے ہوئے اردو میں مذہبی اور علمی مضامین کے ذریعہ مسلمانونکو اسلامی تعلیمات سے روشناس کرانا وقت کا اہم تقاضا ہو گیا۔ چنانچہ وقت کی اس پکار پر لبیک کہتے ہوئے میں نے قدم اٹھایا اور علامہ سید سلیمان صاحب ندوی مد اللہ اجلہ کے مضامین شائع کرنے کا ارادہ کیا۔ میں حضرۃ الاستاذ علامہ سید سلیمان صاحب ندوی کا نہایت مشکور ہوں کہ انھوں نے ہر وقت میری دستگیری فرمائی۔ اور انکی تو ہمیشہ مجھ پر نظر شفقت رہا کی ہے یہ انکا خاص لطف وکرم ہے کہ مجھے

اپنے تمام مضامین کی اشاعت کی اجازت مرحمت فرمایا اور یہ حضرت کا وہ خاص فیض ہے جس میں کوئی دوسرا سہیم نہیں۔ فللہ الحمد وجزاہ اللہ خیر الجزاء

اس سلسلہ میں اپنے ادارہ کے دو اور محسنوں کا تذکرہ کئے بغیر "عرض مرتب" ختم کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ دونوں شخصیتیں ادھر توجہ نہ کرتیں تو ادارہ کا باقی رہنا ہی ناممکن ہو جاتا اور اب جو کچھ اسکی ہیئت کذائی ہے وہ انہی دونوں حضرات کی رہین منت ہے۔

ایک ہمارے حقیقی بھائی مشتاق احمد سلمہ مالک فیض موٹر الکٹریکل ورکس ہیں جو عمر میں گرچہ ہم سے چھوٹے ہیں مگر کام ان کا ہمیشہ "بڑے" ہی کا ہوتا ہے۔ ہماری تحریک پر پوری جرأت اور ہمت سے کام لیا اور جو کچھ کر سکتے تھے وہ کیا۔

دوسری شخصیت بہار کی وہ ممتاز ہستی ہے جو صوبہ کے چالیس لاکھ مسلمانوں کی امید گاہ بنی ہوئی ہے۔ اور ہر آڑے وقت میں انکے سہارا کا کام دیتی ہے۔ یعنی عالیجناب آنریبل مسٹر عبد القیوم صاحب وزیر امور عامہ حکومت بہار آپ کی توجہ سے کام کی رفتار بہت تیز ہو گئی۔ جزاھما اللہ خیر الجزاء

ترتیب مضمون، کتابت، طباعت، تصحیح کے متعلق میں اس سے زیادہ کچھ عرض کرنا نہیں چاہتا کہ جو کچھ ہو گیا وہ بسا غنیمت ہے۔ پھر پریس سے میں اضطراراً اس قدر دور جا پڑا کہ کچھ نہیں کر سکا۔ جس کا مجھے خود افسوس ہے۔ دوسرے حصوں میں سب کی

تلافی ہو جائے گی۔ ان شاء اللہ العزیز

دوسری جانب میں مخطوطات کی طباعت سے بھی غافل نہیں ہوں۔ البتہ اگر سرعت رفتاری کے ساتھ نہیں تو کم از کم خراماں خراماں ہی یہ کام چلتا رہے۔ اور اب تو کتاب الالزامات للدارقطنی رح اس منزل تک پہونچ چکی ہے کہ عنقریب پریس میں جائے گی۔ فللہ الحمد اولاً و آخراً

خادمکم

ابو سلمہ شفیع احمد

ناظم مکتبہ علم و حکمت بہار شریف پٹنہ

انتباہ

اس کتاب کے حقوق اشاعت۔ اخذ۔ نقل۔ اقتباس مضامین
طباعت بحق مرتب محفوظ ہیں

طبع اول .... ایک ہزار
سنہ ۱۹۵۰ء

پیش لفظ

بیا جامی رہا کن شرمساری
ز صاف و دُرد پیش آر آنچہ داری

میرا مدت سے خیال تھا کہ اپنے مضامین کا مجموعہ کسی خاص ترتیب کے ساتھ شایع کروں۔ میری علمی مضمون نویسی کا دور ۱۹۰۲ء سے ہے جسکو نصف صدی ہوا چاہتا ہے۔ اس طویل عرصہ میں خدا جانے قلم سے کیا کیا نکلا اور کہاں کہاں منتشر ہے۔ بہرحال الندوہ اور معارف میں جو کچھ ہے وہ بہت کچھ یکجا ہے۔ اور انکا مجموعہ چھاپنا آسان ہے۔ لیکن خیال یہ تھا کہ ان مضامین کی تقسیم علوم پر ہوتی اور جہاں جہاں کوئی لفظی یا معنوی غلطی ہے اسکی بھی تصحیح کر دی جاتی۔ مگر زمانہ کا تیز رفتار مرکب جس سرعت سے آگے بڑھ رہا ہے اسکو دیکھتے ہوئے اتنی فرصت میسر نہیں آتی کہ ان بکھرے ہوئے موتیوں کو کسی سلک ترتیب میں پرویا جا سکے۔ اس حالت میں جو کچھ تیار ہو جائے قدردانوں کی نگاہوں میں اگر پسند آجائے تو بہرحال اس پراگندگی سے یہ مختصر ترتیب نافع و مفید ہے پھر خدا جانے مستقبل کا انقلاب اسکا بھی موقع دے یا نہ دے اسلیے اس وقت جو کچھ حاضر ہے وہ احباب کے پیش نظر ہے۔

دار القضا۔ بھوپال
۲۰۔ جمادی الاولیٰ ۱۳۶۷ھ

فقیر ہیچمداں
سید سلیمان ندوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلام

دونوں جہان کی بادشاہی

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں دین اور دنیا دونوں کی برکتیں لے کر آئے۔ آپ نے صرف آسمانی بادشاہی کی خوشخبری نہیں سنائی، بلکہ آسمانی بادشاہی کے ساتھ دنیا کی بادشاہی کی بھی بشارت دی تاکہ دنیا میں خدا کی بندگی بے خوف و خطر کی جا سکے اور خدا کی بادشاہی دنیا میں قائم ہو۔

وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا	خدا نے اُن سے جو ایمان لائے
مِنْکُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ	اور اچھے عمل کیے یہ وعدہ کیا کہ
لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ	وہ ان کو زمین میں حاکم بنائے گا
کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ	جیسا کہ ان کو حاکم بنایا تھا جو
قَبْلِھِمْ وَلَیُمَکِّنَنَّ لَھُمْ	پہلے تھے۔ اور ان کے
دِیْنَھُمُ الَّذِی ارْتَضٰی لَھُمْ	دین کو جس کو

وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ط يَعْبُدُوْنَنِيْ وَلَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا (نور - ۷)	پسند کیا ہے جما دیگا اور ان کو انکی اس بے امنی کے بدلے امن دیگا۔ میری بندگی کرینگے، میرا کسی کو ساجھی نہ بنائیں گے۔

اور اس کے لئے خدا کے نافرمانوں سے لڑائی لڑی جائے تاکہ سارا حکم اوسی ایک کا ہو جائے۔

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ (انفال۔ ۵)	اور ان سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فساد نہ رہے اور سب حکم اللہ کا ہو جائے۔

قرآن نے خدا کے بعض نیک بندوں کی یہ دعا بتائی ہے۔

رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ (بقرہ۔ ۲۵)	اے ہمارے پروردگار ہم کو دنیا میں بھلائی دے اور آخرت میں بھلائی دے اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا۔

آخرت کی بھلائی تو معلوم ہے۔ لیکن دنیا کی بھلائی ہمارے مفسروں نے یہ بتائی ہے۔ علم و عبادت۔ تندرستی۔ روزی۔ مال و دولت۔ فتح و نصرت۔ اولاد صالح۔ مگر یہ بھی خدا کے اطلاق کی تحدید ہے۔ دنیا کی بھلائی، دنیا کی ہر وہ بھلائی ہے جو خدا کی شریعت میں جائز ہے ایک اور جگہ فرمایا۔

لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ
الدُّنْيَا حَسَنَةٌ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ
خَيْرٌ وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ ۝
(نحل-۴)

اور جنھوں نے نیک کام کیے ان کے
لئے دنیا میں بھلائی ہے اور آخرت کا
گھر سب سے اچھا ہے اور پرہیزگاروں
کا گھر کیسا اچھا ہے۔

مقصود یہ ہے کہ نکوکاروں کے لئے دنیا کی بھلائی اور عزت بھی ہے اور آخرت کی بھی۔ لیکن آخرت کی بھلائی دنیا کی بھلائی سے زیادہ بہتر اور زیادہ خوب ہے۔

جن لوگوں نے خدا کی راہ میں اپنی جانوں کی بازی لگائی ہے ان کو بشارت ہے۔

فَاٰتٰهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا
وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ وَاللّٰهُ
يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ

تو اللہ نے ان کو دنیا کا ثواب اور
آخرت کا بھلا ثواب عنایت کیا اور
اللہ نیکی والوں کو چاہتا ہے۔

دنیا کا ثواب فتح و نصرت، ناموری و عزت، مال و دولت اور حکومت و سلطنت ہے۔

جنھوں نے خدا کی راہ میں اپنا گھر بار چھوڑا اور خوشی خوشی ہر طرح کی تکلیف جھیلی، خدا نے ان کو دونوں جہان کی نعمتیں بخشیں۔

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْۢ
بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي
الدُّنْيَا حَسَنَةً وَلَاَجْرُ

اور جنھوں نے گھر چھوڑا اللہ کیلئے
ستائے جانے کے بعد۔ ہم ان کو
دنیا میں اچھا ٹھکانا د

اَلْاٰخِرَۃُ اَکْبَرُ ؕ (نحل-٦)	بے شک آخرت کی مزدوری سب سے بڑی ہے۔

دنیا کا اچھا ٹھکانا، دنیا کی ہر جائز نعمت اور سطوت و حکومت ہو۔

ان سب آیتوں میں یہ بات خیال کے قابل ہے کہ ایمان اور نیکی والوں کو گو دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی کی امید دلائی گئی ہے مگر ہر جگہ یہ بتا دیا گیا ہے کہ دنیا کی ہر بھلائی سے آخرت کی بھلائی اونچی، اچھی اور پائدار ہے۔ اسی لئے دنیا کی بھلائی ہماری زندگی کا اولین مقصد نہیں بلکہ ثانوی مقصد ہو۔ یعنی آخرت کے کاموں کے صدقہ میں ہو ورنہ اگر دنیا ہی کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا تو دنیا تو مل جائے گی مگر آخرت ہاتھ نہ آئے گی۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۔ (ہود-٢)	جو کوئی دنیاوی زندگی اور اس کی آرائش چاہے تو ہم ان کے عمل ان کو اسی دنیا میں بھر کر دیتے ہیں اور کمی نہیں کی جاتی۔ یہ وہ ہیں جن کے لئے آخرت میں دوزخ کے سوا کچھ نہیں۔ اور وہاں جو کیا تھا مٹ گیا اور ان کی کمائی اکارت ہوئی۔
مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ	جو کوئی آخرت کی کھیتی چاہتا ہو تو ہم

نَزِدْ لَهٗ فِیْ حَرْثِهٖ ج وَمَنْ كَانَ
يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ
مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ
مِنْ نَّصِيْبٍ (شوریٰ-۲)

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ
عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَاۗءُ لِمَنْ
نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ
يَصْلٰىهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا
وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى
لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰۗئِكَ
كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا۔
(بنی اسرائیل-۲)

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا
فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا
وَالْاٰخِرَةِ
(نساء-۱۹)

اسکی کھیتی بڑھاتے ہیں اور جو دنیا کی
کھیتی چاہتا ہو تو ہم دنیا میں اسکو
کچھ دیتے ہیں اور آخرت میں اسکا
کچھ حصہ نہیں۔

جو کوئی چاہتا ہو دنیائے عاجل کو
تو ہم جلد دے دیتے ہیں جسکو چاہتے
ہیں۔ پھر ہم نے اس کے دوزخ کو
بنایا ہے وہ اس میں داخل ہوگا
برا ہوکر ڈھکیلا جاکر۔ اور جو کوئی
آخرت چاہے اور اسکی پوری کوشش
کی اور وہ ایمان والا ہو تو وہی ہیں
جن کی کوششوں کی قدر کی جائے گی۔

تو جو کوئی دنیا کا ثواب چاہتا ہے
تو (اسکو معلوم ہو کہ) اللہ کے
پاس دنیا اور آخرت دونوں
کا ثواب ہے۔

پھر وہ کتنا احمق ہے جو صرف دنیا کے ثواب کا طالب ہے
حالانکہ خدا کے پاس تو دونوں جہان کے خزانے ہیں۔
غرض یہ ہے کہ جو تنہا دنیا کا طالب ہے وہ آخرت سے

محروم ہے لیکن جو آخرت کا طلبگار رہے اس کے لئے دونوں گھروں کے دروازے کھلے ہیں۔

اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت حکومت اور سلطنت اور دنیا کی سیاست داری ہے۔ یہاں تک کہ کتاب اور نبوت کی دولت کے بعد اسی کا درجہ ہے۔

فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا (نساء - ۸)	تو ہم نے ابراہیم والونکو کتاب اور حکمت دی اور بڑی سلطنت بخشی۔

حضرت موسیٰ ع اپنی قوم کو کہتے ہیں۔

يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا	اے میرے لوگو! اپنے اوپر اللہ کے احسان کو یاد کرو۔ جب تم میں نبی بنائے اور تم کو بادشاہ بنایا۔

یہ نعمت کسی کے لینے دینے سے نہیں ملتی۔ اس کا مالک اللہ تعالیٰ ہے وہ جس کو چاہے دے اور جس سے چاہے چھین لے

اَللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ (آل عمران - ۳)	اے اللہ! اے سلطنت کے مالک! تو جسے چاہے سلطنت بخشے۔ اور جس سے چاہے چھین لے۔

وہ دیتا کس کو اور چھینتا کس سے ہے اسکے متعلق اس نے

اپنا قاعدہ کلیہ بتا دیا ہے۔

اِنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُوْنَ اِنَّ فِيْ هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِيْنَ

(انبیاء۔ ۷)

بیشک زمین کے مالک میرے صالح بندے ہوتے ہیں۔ اس اعلان میں خدا کے فرمانبردار بندوں کے لیے پیام ہے۔

مسلمانوں کو جب اس نعمت کے ملنے کی بشارت ملی تھی تو ساتھ ہی یہ بتا دیا گیا کہ یہ نعمت اُن کے کاموں کا معاوضہ ہے۔ فرمایا۔

وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ۝

(حج۔ ۶)

اور البتہ خدا اسکی مدد کریگا جو اسکی مدد کرتا ہے بیشک اللہ زبردست قوت والا ہے۔ وہ کہ ہم اگر انکو زمین میں جما دیں تو وہ نماز کھڑی کریں۔ زکوٰۃ دیں۔ اچھے کامونکو کہیں اور بُرے کاموں سے روکیں اور ہر کام کا انجام خدا کے اختیار میں ہے۔

اور ظاہر ہے کہ جو اچھے کاموں کو کہے گا اور برے کاموں سے روکے گا وہ پہلے خود اچھا ہوگا اور بُرے کاموں سے باز رہتا ہوگا۔ خدا کی مدد کرنے کے معنی یہ ہیں کہ خدا کے دین حق کی مدد کی جائے۔ جو لوگ حق کی مدد کے لئے اُٹھتے ہیں خدا انکی مدد فرماتا ہے۔ ان آیتوں سے یہ اشارہ بھی نکلا کہ مسلمانوں کے ہاتھوں میں خدا کے قانون کے اجرا کی طاقت ہونی چاہیئے

چنانچہ اسلام میں سارے حدود اور تعزیرات اسی منشأ کے مطابق ہیں زنا کی حد میں فرمایا:-

وَلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ (النور-١)	اور تم کو ان دونوں (زانیوں) پر اللہ کی حد جاری کرنے میں کوئی ترس نہ آوے اگر تم اللہ اور پچھلے دن پر یقین رکھتے ہو۔

سود کے اسلامی قانون کو جو نہ مانے اس کو اللہ اور رسول سے لڑائی کے لئے تیار ہونا چاہیئے۔

فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (البقرہ-٣٨)	تو اے سود کھانے والو! اللہ اور اسکے رسول سے لڑنے کیلئے خبردار ہو جاؤ۔

اسی لئے نجران کے عیسائیوں سے آپ نے صلح کا جو معاہدہ کیا تھا اسکی ایک دفعہ یہ تھی کہ اگر وہ سودی لین دین کریں گے تو یہ معاہدہ ختم ہو جائے گا۔ (ابوداؤد باب اخذ الجزیہ)

* * *

قرآن پاک کا تاریخی اعجاز

دنیا کے ہر پیغمبر نے اپنی امت کے سامنے حیرت انگیز معجزے پیش کیے ہیں حضرت نوح کی دعا نے عالم کو غرقاب کر دیا۔ حضرت شعیب اور لوط کی دعاؤں نے آتش فشاں پہاڑوں کے دہانوں سے آگ برسائی حضرت موسیٰؑ کے معجزہ نے فرعون کو بحر احمر کا طعمہ بنایا۔ عصائے موسیٰؑ کی کار فرمائی نے چٹانوں کی چھاتی سے پانی کا دودھ بہایا اور بحر احمر کے سیل رواں کو روک کر بیچ میں خشکی کی دیوار کھڑی کر دی۔ دم عیسیٰ نے جنم کے اندھوں کو بینا اور کوڑھیوں کو چنگا کیا۔ فرش موت کے سونے والوں کو جگایا اور قبر کے مردوں کو بِاِذنِ اللّٰہ کہہ کر جلا دیا۔

یہ واقعات دنیا میں پیش آئے اور ختم ہو گئے۔ برق کا شرارہ تھا جو دم کے دم میں چمکا اور بجھ گیا۔ لیکن ایک ایسا پیغمبر بھی آیا جس کے حیرت انگیز معجزہ نے قوموں کو ہلاک کرنے کے بجائے ان کو حیات تازہ بخشی۔ پتھر دلوں کو موم، عقل کے اندھوں کو بینا اور بنی آدم کی پوری جمعیت کو غفلت و بیہوشی کی نیند سے جگا کر ہشیار اور کفر و شرک کی ہلاکت سے بچا کر زندہ کیا۔ یہ حیرت انگیز واقعہ بجلی کی چمک کی طرح

دفعتہً ظاہر ہو کر غائب نہیں ہو گیا۔ یہ ید بیضا، عصائے موسیٰ اور دمِ عیسیٰ کی طرح اپنے امکان اور وقوع میں فلسفیانہ موشگافیوں اور عقلی نکتہ سنجیوں کا محتاج نہیں یہ روزِ روشن کی طرح واقعہ کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اور ہزار سال تک مستند و متواتر واقعیت بنکر دنیا اور اہل دنیا کے سامنے جلوہ گر رہا۔

محمد رسول اللہ صلعم آخری دین اور آخری صحیفہ لیکر اور نبوت کی عمارت کی آخری اینٹ بن کر اس دنیا میں تشریف لائے۔ آپ کے بعد نہ کوئی نیا دین آنے والا، نہ کوئی نئی کتاب اترنے والی اور نہ کوئی نئی نبوت مبعوث ہونے والی تھی۔ اسلئے ضرورت تھی کہ دوسرے انبیا علیہم السلام کی طرح آپ کا خاص معجزہ وقتی اور عارضی نہ ہو بلکہ جب تک اس دنیا میں آپ کی نبوت کا نور چمکتا ہے اسکی روشنی بھی قائم رہے چنانچہ وقتی اور عارضی معجزوں کے علاوہ آپ کو ایک ایسا خاص معجزہ بخشا گیا جو قیام قیامت تک قائم اور باقی رہنے والا ہے قرآن نے تحدّی کی ہیں اپنے رسول و پیغمبر کی صداقت کی گواہی ہوں۔ جن و انس مل کر بھی چاہیں تو مجھ جیسی کتاب بلکہ مجھ جیسی کتاب کی ایک سورہ بلکہ ایک آیت بھی بنا کر پیش نہیں کر سکتے۔ اس اعلان پر پوری چودہ صدیاں گذر چکی ہیں مگر اب تک فضائے بسیط کے ہر گوشہ میں اسکے جواب میں خاموشی چھائی ہے۔

یہاں بھی عقل و فلسفہ کی منطقیانہ نکتہ آرائیوں سے بچکر

آئیے تاریخ کے آئینہ میں واقعیت کا چہرہ دیکھیں قرآن پاک دنیا
کی سب سے تاریک سرزمین میں، سب سے جاہل قوم پر اترا جو
علم و تمدن سے عاری، دولت و ثروت سے خالی، سامان و اسلحے سے
محروم اور ہر قسم کی دنیاوی اور مادی طاقت سے تہی مایہ تھی۔ قرآن نے
تیرہ برس تک کبھی پہاڑوں کے غاروں سے اور کبھی پہاڑونکی چٹانوں
سے انسانیت کو آوازیں دیں۔ اس طویل مدت میں اسکی پکار کے
جواب میں سب و شتم، سنگریزے اور پتھر، تیر و تبر اور تیغ و خنجر کی
بارش ہوتی رہی لیکن جونہی کہ چودھویں برس کا چاند طلوع ہوا اسکی
روشنی ماہ شب چہاردہم بن کر نمودار ہوئی اور چند سال کے عرصہ میں
دیکھا تو عرب کا گوشہ گوشہ بقعۂ نور بن گیا۔

قرآن کا سب سے بڑا تاریخی معجزہ یہ ہے کہ ۲۳ برس کی تعلیم میں
ایک ان پڑھ اور جاہل قوم کو دنیا کی عالم ترین اور متمدن ترین قوم بنا دیا
جس کی عظمت نے دنیائے قدیم کے دونوں بازو قیصر و کسریٰ کو توڑ دیا
چالیس برس کی مدت میں جب خلافت راشدہ کا دور ختم ہوا قرآن کے
ماننے والوں نے جو بحر سندھ کے دہانہ سے لیکر بحر اطلانٹک کے ساحل
تک پھیلے ہوئے تھے، دنیا کی کایا پلٹ دی۔ تاریکی کی جگہ نور۔ جہالت
کے بدلے علم۔ شرک و کفر کے بجائے خدا پرستی آئی۔ دنیا کی سب سے
غریب و مفلس قوم سب سے بڑی دولتمند اور سب سے ناداں و جاہل و وحشی
قوم سب سے بڑی عالم و علم پرور اور متمدن ہوگئی۔ دنیا کی سب سے

ضعیف و کمزور قوم سب سے قوی اور سب پر غالب ہو گئی۔ وہ قوم
جس کو دنیا میں کبھی سیاسی عزت و جاہ و جلال نصیب نہیں ہوا تھا
اس نے دنیا کی شہنشاہی کا تاج اپنے سر پر رکھا۔

عرب و عجم۔ ترک و دیلم، حبش و زنگ، ہند و سندھ جس نے بھی
قرآن کو اپنے سینہ سے لگایا اسنے فتح و ظفر کا پرچم ہاتھ میں لیا۔ تخت شاہی
اپنے دونوں پاؤں کے نیچے بچھایا اور حکومت کا تاج اپنے فرق شاہی
پر رکھا۔ عربوں کی کیا بساط تھی۔ دیلم کو کون جانتا تھا۔ سلجوق سے
کون واقف تھا۔ غوری و خلجی و تغلق کس شمار میں تھے۔ کرد کس گنتی میں
تھے۔ خوارزمشاہی۔ اتابکی اور مصر کے بحری ممالیک اور ہندوستان کے
ترکی غلاموں کی حیثیت کیا تھی۔ اور مٹھی بھر آوارہ گرد ترک قبیلہ کا سردار
عثمان خاں جس کی اولاد نے یورپ ایشیا اور افریقہ دنیا کے تین براعظموں
پر چھ سو برس تک حکومت کی۔ اسلام سے پہلے کیا تھا مگر جب انھوں نے
اپنی عقیدت کا سر قرآن کے آگے جھکایا تو دنیا کی شہنشاہیوں نے انکے
آگے اپنی گردنیں جھکا دیں۔

عربوں کا تمدن کیا تھا! افریقہ کے وحشیوں کا رتبہ کیا تھا۔ بربر کی
بربریت کی داستانوں سے کون آگاہ نہ تھا۔ ترک و تاتار کی درندگی کے
واقعات سے کس کے کان آشنا نہ تھے مگر دیکھو کہ جب قرآن نے
اُن کے سر پر سایہ ڈالا تو انہی کے ہاتھوں سے عظیم الشان سلطنتوں کی
بنیادیں پڑیں بڑے بڑے متمدن شہر آباد ہوئے۔ علوم و فنون کی درسگاہیں

کھلیں اور تمدن و تہذیب کے نقش و نگار اور آثار نمودار ہونے لگے
فلسفہ و عقل کی جلوہ آرائی ہوئی۔ علم و فن نے ترقی کی بیسیوں نئے علوم
اختراع ہوئے۔ پچھلے علوم نے رونق تازہ پائی اور ان کی بری اور بحری
تجارتوں نے دنیا کی منڈیوں پر قبضہ کر لیا۔

ان سب سے ماورا اور مادہ و مادیات سے ہٹ کر انسانی اخلاق
آداب نے ابھی قرآن کی تعلیم و ہدایت سے تکمیل کا درجہ پایا۔ عدل و
انصاف اور اخوت و مساوات کے سبق ازبر ہوئے۔ اور اہل جہان کی
آنکھوں کو وہ منظر دکھا دیا جس کو آغاز آفرینش سے آج تک انھوں نے
کبھی نہیں دیکھا تھا۔ مغرب کی قوموں کو مشرق سے اور مشرق کی بستیوں کو
مغرب سے ملا دیا۔ اور حسب و نسب قومیت وطن پستی و بلندی اور شاہی
و گدائی کے ہر قسم کے نشیب و فراز کو مٹا کر قرآن والوں کی ایک برادری
اور واحد قومیت پیدا کر دی۔ جس کا وطن دنیا کا ہر ملک اور جس کا
مسکن دنیا کا ہر گوشہ تھا۔

باطل پرستی کے ہر طلسم کو توڑ دیا۔ بتوں کے ہیکل مسمار کر دیئے
ستارہ پرستی کا چراغ گل کر دیا۔ انسانی جانوں کی قربانی موقوف کر دی
دختر کشی کی رسم کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دیا۔ عورتوں کو عزت،
غلاموں کو آزادی، اور غریبوں کو بشارت دی۔ اور سب کے لیے ایک
ایمان اور عمل صالح کو ہر قسم کی ترقیوں اور سعادتوں کا زینہ بنایا اور
بتایا کہ انسانی سعادت کی شاہراہ غاروں، خلوتوں اور پہاڑوں سے ہو کر

نہیں گذری ہے بلکہ شہروں، بازاروں، مجمعوں اور انسانی بھیڑ بھاڑ کے اندر سے گذری ہے۔ حق کی نصرت، انسانوں کی بھلائی، یتیموں کی سرپرستی، غریبوں کی امداد، گرتوں کی دستگیری، مظلومونکی فریادرسی اور غلامونکی آزادی ہی نیکیوں کی جڑیں ہیں اور اس راہ میں ہر قسم کی جدوجہد، زحمت کشی و محنت اور ایثار و قربانی، اصلی نفس کشی و ریاضت ہے۔

اور سب کے آخر میں اور سب سے بڑھ کر اس نے مسلمانونکو اللہ کے ایک آستانۂ قدس کے سوا دنیاوی قوت کے ہر آستانہ سے بے نیاز کر دیا۔ خدائے قادر کی قدرت کے سوا ہر قدرت سے وہ بے نیاز اور ہر قوت سے وہ بے پرواہ ہو گئے۔ انھوں نے فرعونوں کو دریا میں ڈھکیل دیا۔ نمرودوں کے تخت الٹ دیئے۔ ہامانونکی سلطنتیں چھین لیں اور شدادیوں کی بہشت پر قبضہ کر لیا۔ اور یہ سب کچھ وہ اسلئے کر سکے کہ انھوں نے ان سب جھمیلونکے ساتھ ہر رشتۂ محبت کو توڑ کر صرف خدا سے اپنا رشتہ جوڑا تھا۔ ان کے ہر عمل کی غایت اللہ کی خوشنودی اور رضامندی تھی تو اللہ بھی اُن سے خوش ہوا۔ اور اپنی خوشنودی کا ہر خزانہ اِن کے لئے کھول دیا۔

قرآن نے اللہ والوں کی جماعت پیدا کی جو اللہ ہی کے لئے کرتی اور چھوڑتی تھی۔ اللہ ہی کے لئے دیتی اور لیتی تھی۔ اور اسی کے لئے جیتی اور مرتی تھی

مسلمانو! ربّانی قوت کا یہ سرمایہ اب بھی تمھارے پاس ہے
اور اللہ کے اس خزانۂ رحمت کی کنجی اب بھی تمھارے ہاتھوں میں ہے
ہمت کرو اور ادب سے اس کے اوراق کو کھولو
اسکے معنوں کو سمجھو، اس کی باتوں پر یقین کرو
اور اس کے حکموں کو مانو اور عمل کرو پھر دیکھو کہ
تم کہاں سے کہاں پہونچتے ہو
والسلام علیٰ من اتبع الہدیٰ

تذکار نزول قرآن

اسوۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْ أُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْآنُ

يا ايها الذين أمنوا كتب عليكم الصيام كما كتب على الذين من قبلكم لعلكم تتقون (بقره)

شهر رمضان الذى انزل فيه القرآن هدًى للناس و بينات من الهدٰى والفرقان فمن شهد منكم الشهر فليصمه ومن كان مريضًا او على سفر فعدة من ايام اخر يريد الله بكم اليسر ولا يريد

مسلمانو! تم پر روزے اوسی طرح لکھے گئے جس طرح تم سے پہلی امتوں اور قوموں پر اس سے پہلے لکھے گئے تھے تاکہ تقوٰی تم میں پیدا ہو۔

شہر رمضان وہ ہے جس میں قرآن اترا جو لوگوں کے لیے سرتاپا ہدایت ہے، جو ہدایت و تمیز حق و باطل کی نشانی ہے۔ پس جو اس مہینہ میں زندہ موجود رہے وہ روزہ رکھے اور جو مریض یا مسافر ہو وہ ان کے بدلے دوسرے دنوں میں پھر روزہ رکھ لے

بکم العسر ولتکملوا العدۃ
ولتکبروا اللہ علی ما ھداکم
ولعلکم تشکرون (بقرہ)

خدا آسانی چاہتا ہے سختی نہیں چاہتا
تاکہ تم روزوں کی تعداد پوری کرسکو۔
اور روزے اس لئے فرض ہوئے کہ تم
اس عطائے ہدایت پر خدا کی بڑائی کرو
اور شکر بجا لاؤ۔

مکہ سے تین میل کی مسافت پر کوہ حرا واقع ہے۔ آج سے ۱۳۴۴ برس پہلے ایام رمضان[1] میں جب سخت گرمی کے دن تھے اور شدت حرارت سے ریگستان بطحا کا ذرہ ذرہ تنور بن رہا تھا اُسی کوہ حرا کے ایک تیرہ و تاریک غار میں مادیات عالم سے ایک کنارہ کش انسان سر بزانو تھا۔

وہ بھوکا تھا، لیکن بھوکا نہ تھا کہ اُس کے پاس کھانے کی وہ چیز تھی جس کو کھا کر پھر انسان کبھی بھوکا نہیں ہوتا۔ وہ پیاسا تھا لیکن پیاسا نہ تھا کہ اُس کے پاس پینے کی وہ چیز تھی جس کو پی کر پھر انسان کبھی پیاسا نہیں ہوتا۔ وہ[2] تین تین چار چار دن کھانا پینا چھوڑ دیتا تھا۔ اُسکے جاں نثار بھی اُسکی محبت میں کھانا پینا چھوڑ دیتے تھے۔ لیکن وہ ان کو منع کرتا تھا کہ

---

[1] رمضان کے معنی شدت حرارت کے ہیں اس سے اور دیگر اسمائے مشہور کے قرینہ سے مستنبط ہوتا ہے کہ عرب میں قبل اسلام ناقص طور سے شمسی مہینے جاری تھے اس لیئے رمضان گرمی کا مہینہ ہوگا۔

[2] صوم وصال۔

یکم مثلی، ابیت یطعمنی ربی ویسقینی (رواہ البخاری ومسلم فی صحیحیہما)

تم میں کون میری طرح ہے۔ میں بھوکا ہوتا ہوں تو میرا آقا مجھکو کھلاتا ہے میں پیاسا ہوتا ہوں تو میرا آقا مجھکو پلاتا ہے (حدیث صحیح)

کوہ حرا کا مقدس عزلت نشین اسی طرح بھوکا پیاسا سربزانو تھا کہ ایک نور بے کیف[1] نے تیرہ و تار غار کو روشن کر دیا۔ وہ نور بے کیف کیا تھا؟ ہدایت و فرقان کا ایک آفتاب تھا جو مطلع حظیرۃ القدس سے طلوع ہوکر اسکے سینہ میں غروب[2] ہوگیا فانہ نزلہ علیٰ قلبک (بقرہ) اور پھر اسکے سینہ سے نکلکر تمام عالم کو اسکی شعاعوں نے روشن کر دیا۔ وما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین (بقرہ)

صیام رمضان

وہ آفتاب جس کا مطلع حظیرۃ القدس تھا۔ وہ آفتاب جس کا مغرب سینہ نبوی تھا، وہ آفتاب جس نے عالم کو منور کیا قرآن مجید تھا جو ماہ مقدس کی شب مبارک میں آسمان سے زمین پر نازل ہونا شروع ہوا۔ وہ کون سا ماہ مقدس تھا جس میں خدا کا کلام بندوں کو پہونچنا شروع ہوا؟ وہ ماہ رمضان تھا۔

---

[1] وحی قرآن ۱۲

[2] نزول قرآن کی ابتدا رمضان میں ہوئی کما سیاتی۔

شهر رمضان الذی انزل فیه القرآن، هدی للناس وبینات من الهدی والفرقان (بقرہ)

رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن اترا جو لوگوں کیلئے سراپا ہدایت ہے جو ہدایت و تمیز حق و باطل کی نشانی ہے۔

پس ان ایام میں ہماری بھوک، ہماری پیاس، ہمارا مادیات عالم سے اجتناب، اس یادگار میں ہے کہ ہم تک جو خدا کا پیغام لایا۔ وہ ان دنوں بھوکا اور پیاسا تھا اور وہ تمام لذائذ مادی سے مجتنب تھا۔

فمن شهد منکم الشهر فلیصمه (بقرہ)

پس جو اس مہینہ میں زندہ و موجود ہو وہ روزہ رکھے۔

یہ اسکا حال تھا جو کہ فارآن[1] (کوہ حرا) کی چوٹی سے جلوہ گر ہوا تھا (محمد صلعم) لیکن وہ جو سینا سے آیا (موسیٰؑ) وہ بھی تورات لینے کیلئے جب پہاڑ پر چڑھا تھا وہاں چالیس روز بدلی کے درمیان خداوند کے حضور رہا تھا۔ (خروج ۲۴-۱۸) اسی طرح وہ بھی جو کوہ سعیر (کوہ زیتون) سے طلوع ہوا تھا (مسیحؑ) اس سے پہلے کہ وہ خدا کی منادی شروع کرے جنگل میں چالیس روز دن رات بھوکا اور پیاسا رہا تھا۔ (متی ۴-۲) پس ضرور تھا کہ وہ جو کوہ فاران سے جلوہ گر ہونے

---

[1] اشارہ ہے تورات کی اس بشارت کی طرف "خداوند سینا سے آیا اور سعیر سے طلوع ہوا اور فاران کے پہاڑ سے جلوہ گر ہوا۔ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا اور اسکے داہنے ہاتھ میں ایک آتشیں شریعت تھی (تورات۔ سفر التثنیہ ۳۳-۲)

الا تھا وہ بھی اس سے پہلے کہ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ وہ آئے ورااُس کے داہنے ہاتھ میں آتشیں شریعت ہو۔ وہ خداوند کے حضور بھوکا اور پیاسا رہے تاکہ جو لکھا گیا ہے وہ پورا ہو

یاایھا الذین اٰمنوا کتب	مسلمانو! تم پر روزہ اوسی طرح
علیکم الصیام کما کتب علی	لکھا گیا ہے جس طرح تم سے
الذین من قبلکم (بقرہ)	پہلوں پر لکھا گیا تھا۔

پس رمضان کی حقیقت کیا ہے؟ وہ ماہ مقدس جس میں داعی اسلام حسب اتباع نوامیس نبوت، متحمل نزول قرآن کے لئے ضروریات مادۂ عالم سے مستغنی رہا اور اس لئے ضروری ہوا کہ پیروان ملت اسلامیہ اور متبعین طریقت محمدیہ ان ایام میں ضروریات مادیۂ عالم سے مستغنی رہیں کہ اوس توفیق و ہدایت کا شکریہ و ممنونیت اور اظہار اطاعت و عبودیت ہو جو اُن کو اس ماہ مقدس میں عطا ہوئی۔

شھر رمضان الذی انزل	ماہ رمضان وہ ہے جس میں قرآن
فیہ القراٰن ھدی للناس	اُترا جو لوگوں کے لیئے ہدایت ہے۔
و بینٰت من الھدیٰ والفرقان	جو ہدایت و تمیز حق و باطل کی
فمن شھد منکم الشھر فلیصمہ	نشانی ہے۔ پس جو اس مہینہ
ومن کان مریضا او علیٰ سفر	میں زندہ و موجود ہو وہ روزہ
فعدۃ من ایام اخر۔ یرید	رکھے، جو بیمار یا مسافر ہو وہ انکے
اللہ بکم الیسر ولا یرید	بدلے اور دنوں میں روزے رکھ لے

بکم العسر ولتکملوا العدۃ
ولتکبروا اللہ علی ما ھداکم
ولعلکم تشکرون (بقرہ)

خدا تمھارے ساتھ آسانی چاہتا
ہے سختی نہیں چاہتا تاکہ تم روزوں
کی تعداد پوری کرسکو اور روزے
کیوں فرض ہوئے اسلیئے کہ تم خدا
کی ہدایت پر اس کی بڑائی کرو اور
شکر ادا کرو۔

ہم کو صاف بتا دیا گیا کہ مفروضیت صیام رمضان صرف اس لیئے ہے کہ ہم اس عطائے ناموس فرقان و ہدیٰ (قرآن) پر خدا کا شکر بجا لائیں اور اُس کے نام کی تقدیس کریں۔ پس کون مسلم ہے جو خدا کے اس احسان اکبر اور نعمت عظیم کے شکر کے لیئے طیار نہیں؟ اور اُسکی تقدیس کے لیئے آمادہ نہیں۔ اُس کی تقدیس و تمجید میں خود کو فراموش کر دو اُس کے کلام کی عظمت کو یاد کرو جس نے تم جیسی نزار و نزار و کمزور قوم کو اپنی تسلی سے قوی کیا جو پھر کبھی کمزور نہ ہوگی۔ جس نے ۱۳۴۳ برس ہوئے کہ توحید کی آگ تمھارے سینوں میں روشن کی۔ جو پھر کبھی نہیں بجھے گی۔ جس نے تمھارے سر پہ تاج خیر الامم رکھا۔ جو کبھی نہیں اتر سکتا۔

شب قدر

وہ کون سی شب مبارک تھی جس میں خدا کا کلام سرچشمہ پر ور ایک الشان کے مونھ میں ڈالا گیا؟ وہ لیلۃ القدر یعنی عزت و حرمت کی رات تھی
بے شک وہ عزت و حرمت کی رات تھی

وہ رات تھی جو ہزار مہینہ سے بہتر تھی کہ اس میں خداوند گویا ہوا۔ وہ فرشتوں کی آمد کی رات تھی کہ آسمان کی باتیں زمین والوں کو سنائیں۔ وہ امن وسلامتی کی رات تھی کہ اس میں دنیا کے لئے امن و سلامتی کا پیغام اترا۔

انا انزلنہ فی لیلۃ القدر
وما ادرٰک ما لیلۃ القدر
لیلۃ القدر خیر من الف
شہر تنزل الملئکۃ والروح
فیہا باذن ربہم من کل امر
سلٰم ھی حتی مطلع الفجر
(القدر)

ہم نے قرآن کو عزت و حرمت والی
رات میں نازل کیا۔ اور ہاں تمھیں
کس نے بتایا کہ عزت و حرمت والی
رات کیا ہے؟ وہ رات جو ہزار
مہینہ سے بہتر ہے۔ جس میں ارواح
مقدسہ اور فرشتے حکم خدا سے احکام
لیکر نازل ہوتے ہیں اس رات میں
طلوع صبح تک سلامتی ہے۔

وہ شب کیا عجیب شب تھی۔ دنیا عصیان و حق شناسی کی تاریکی میں مبتلا تھی۔ دیو باطل کا تمام عالم پر استیلا تھا، توحید کا چہرۂ نورانی کفر و شرک کی ظلمت میں محجوب تھا۔ نیکیاں بدیوں سے شکست کھا چکی تھیں دنیا کی تمام متمدن اور زبردست قومیں قوت الٰہی سے بغاوت کا اعلان کر چکی تھیں۔ ایک نحیف و ضعیف قوم بحر احمر کے کنارے کے ریگستانوں پر غفلت و جہالت کے بستروں پر پڑی سو رہی تھی لیکن اس ظلمت کدۂ عالم میں صرف ایک گوشہ تھا جو روشن تھا۔ وہ گوشہ غار حرا کا گوشہ تھا

اس بغاوت و طغیان عالم میں ایک شئے تھی جو قوت الٰہی کے آگے اطاعت و تسلیم کے ساتھ سر بسجود تھی۔ وہ عزلت نشین حرا کی جبین مبارک تھی اور ایک ہی قلب تھا جو بیدار تھا اور وہ محمد رسول اللہ صلعم کا قلب اقدس تھا۔

یہ کیا عجیب و غریب شب تھی جب قوموں کی قسمت کا فیصلہ ہو رہا تھا جب جبابرۂ عالم کی تنبیہ و تادیب کے لئے ایک نحیف و ضعیف قوم کا انتخاب ہو رہا تھا۔ جب نیکیوں کا لشکر دوبارہ مقابلہ کیلئے آراستہ کیا جا رہا تھا اور اس کی سر عسکری کے لئے وہ وجود اقدس منتخب ہو رہا تھا جو حرا کے غیر مصنوع حجرہ میں بیدار اور سر بسجود تھا اور رحمت کے محافظ فرشتے اسکے ارد گرد صف بستہ تھے۔

انا انزلناہ فی لیلة مبارکة
انا کنا منذرین۔ فیها
یفرق کل امر حکیم۔ امرًا
من عندنا انا کنا
مرسلین۔ رحمة من ربک
انه هو السمیع العلیم
(الدخان)

ہم نے اس کتاب مبین کو ایک مبارک شب میں اتارا کہ ہمیں انسانوں کو ڈرانا تھا۔ وہ مبارک شب جس میں پر از حکمت امور کا ہمارے حکم سے فیصلہ کیا جاتا ہے۔ انسانوں کے پاس اپنی رحمت سے ایک پیغام بھیجنا تھا کیونکہ ہم پکارنے والوں کی دعائیں سنتے ہیں اور دنیا کے ذرہ ذرہ کا حال جانتے ہیں

پس یہ وہ شب ہے جس میں اقوام عالم کی قسمتوں کا فیصلہ ہو۔

یہ وہ شب ہے جس میں برکات ربانی کی ہم پر سب سے پہلی بارش ہوئی یہ وہ شب ہے جب اُس سینہ میں جو خزینۂ نبوت تھا کلام الٰہی کے اسرار سب سے پہلے منکشف ہوئے اور رحمتہائے آسمانی نے زمین میں نزول کیا۔ پس ہر مسلم کا فرض ہے کہ وہ اس لیلۂ مبارک میں رحمتوں کا طالب ہو۔ اور اس رحمٰن و رحیم ہستی کے آگے سر نیاز خم کرے جبین پر معاصی کو زمین پر عجز و خاکساری سے رکھے اور بصد خضوع و خشوع دست تضرع دراز کرے کہ خدایا!

آمن الرسول بما انزل الیه
من ربه والمومنون کل آمن
باللّٰه وملئکته وکتبه ورسله
لانفرق بین احد من رسله
وقالوا سمعنا واطعنا
غفرانک ربنا والیک المصیر
لایکلف اللّٰه نفسا الا وسعها
لها ما کسبت وعلیها ما اکتسبت
ربنا لاتواخذنا ان نسینا او
اخطانا ربنا ولا تحمل
علینا اصرا کما حملته علی
الذین من قبلنا ربنا و۔

رسول جو کچھ اوس پر نازل ہوا اوس پر
ایمان لایا۔ اور اہل ایمان بھی ایمان لائے
سب خدا پر، اُسکے فرشتوں پر، اُسکی
کتابوں پر، اُسکے رسولوں پر ایمان لائے
اور پکار اٹھے پروردگار! تیری باتیں
سنیں تیری اطاعت کا عہد کیا۔ اب
تیری مغفرت کے طالب ہیں اور تو ہی
ہمارا مرجع ہے۔ کسی کو تو اُسکی قوت
سے زیادہ حکم نہیں دیتا۔ اور خیر و شر
سب انسان کی کمائی ہے۔ پس
اے پروردگار! اگر ہم سے بھول ہو
یا کوئی خطا ہو تو مواخذہ نہ کر۔

لا تحملنا ما لا طاقة لنا
به واعف عنا، واغفر لنا
وارحمنا انت مولانا
فانصرنا على القوم الكافرين
(بقرہ ع)

پروردگارا! ہم سے پہلوں کی طرح ہم کو گراں بار نہ بنا۔ پروردگارا! ہماری طاقت سے زیادہ ہم کو بوجھ نہ دے ہمیں معاف کر ہمارے گناہ بخش۔ ہم پر اے ہمارے آقا رحم فرما اور کفار پر ہمیں غلبہ نصیب کر۔

اعتکاف:-

مسلمان ان ایام میں مساجد کے گوشوں میں عزلت نشین (معتکف) ہوتے ہیں کہ غار حراء کا گوشہ نشین بھی ان دنوں عزلت نشین تھا۔ مسلمان ایام اعتکاف میں اس متکلم ازلی کے سوا جو ان راتوں میں معتکف حرا سے گویا ہوا تھا، کسی سے نہیں بولتے کہ ایسا ہی اس نے بھی کیا تھا، جس کے منہ میں اس متکلم ازلی نے اپنی بولی ڈالی جب وہ حراء کے ایک گوشہ میں سر بزانو معتکف تھا۔

پس ہر مسلم آبادی میں چند نفوس مسلم کے لئے ضروری ہے کہ اواخر عشرۂ رمضان میں مسجد کے ایک گوشہ میں شب و روز محویت اتباع نبوی۔ تلاوت کتاب عزیز۔ تفکر خلق سماوات و ارض۔ ذکر نعم الٰہی۔ تذکر اسمائے حسنیٰ اور تحیت و تسلیم و ادائے صلوات میں اسطرح بسر کریں کہ ان اوقات محدودہ کا کوئی لمحہ تذکر و تفکر سے خالی نہ ہو تاکہ ان اشخاص مقدسہ کا جلوہ اسکی آنکھوں میں پھر جائے۔

الذین یذکرون اللہ قیامًا وقعودا وعلی جنوبھم (ال عمران)	جو ہمیشہ اُٹھتے بیٹھتے لیٹتے خدا کو یاد کرتے ہیں۔
الذین اذا ذکروا بھا خروا سجدا وسبحوا بحمد ربھم وھم لا یستکبرون، تتجافی جنوبھم عن المضاجع یدعون ربھم خوفا وطمعًا (سجدہ)	وہ جو قرآن کی آیتیں جب اُن کو یاد دلائی جاتی ہیں تو وہ سجدے میں گر پڑتے ہیں اور خضوع و خشوع کے ساتھ اپنے رب کی حمد و ثنا کرتے ہیں۔ اُنکے پہلو راتوں کو بستر سے الگ رہتے ہیں اور وہ امید و بیم کے ساتھ خدا سے دعائیں کرتے ہیں۔
رجال لا تلھیھم تجارۃ ولا بیع عن ذکر اللہ۔	جن کو خرید و فروخت وغیرہ دنیاوی اشغال ذکرِ خدا سے غافل نہیں کرتے۔

اسماعیل و ابراہیم (علیہما السلام) کی سب سے پہلی مسجد جن اغراض کے لئے تعمیر ہوئی اُن میں سے ایک غرض یہ بھی تھی کہ وہ عزلت گزینان عبادت گذار کا مسکن ہو۔

وعھدنا الی ابراھیم و اسماعیل ان طھرا بیتی	ہم نے ابراہیم و اسماعیل سے عہد لیا کہ وہ میرے گھر کو

للطائفین والعاکفین والرکع السجود (بقرہ)	طواف، اعتکاف، رکوع اور سجود کرنے والوں کے لئے پاک رکھیں۔

پس اے فرزندان اسماعیل وابراہیم اپنے باپ کے عہد کو یاد کرو اور جب گھر کو رکوع وسجود کے لئے پاک رکھتے ہو اسے اعتکاف کے لئے بھی پاک رکھو کہ تمھارے باپ اسماعیل وابراہیم کا عہد خداوند کے حضور جھوٹا نہ ہو۔

قیام رمضان

کیا عجیب وہ جوش محویت ہے جب مسلمان دن بھر کی بھوک اور پیاس کے بعد رات کو خدا کی یاد کے لئے کھڑے ہوجاتے ہیں اللہ! اللہ! وہ تکلیف جو راحت قلبی کا باعث ہو! معتکف حراء بھی اسی طرح خدا کی یاد کے لئے رات بھر کھڑا رہتا تھا۔ یہاں تک کہ اس کے پاؤں میں ورم آجاتا تھا کہ خدا کی ہدایت کا شکریہ بجا لائے۔

پس شب کو جب عالم سنسان ہے اور دنیا کا ذرہ ذرہ خاموش اور محو خواب شیریں ہے۔ آؤ شیفتگان سنت محمدیہ! کہ اس مقدس آیا ہم اپنے بستروں کو خالی کریں! خدا کی تقدیس میں مشغول ہوں۔ اور اس کی حمد وثنا کریں جس نے اس ظلمت کدۂ عالم میں صرف ہم کو ایک ایسا چراغ بخشا جس سے ہمارے قلوب منور ہوگئے۔

سبحان ذی الملک والملکوت	تقدیس ہو حکومت وشہنشاہی

سبحان ذي العزة والعظمة والهيبة والقدرة والكبرياء والجبروت، سبحان الملك الحي الذي لا ينام ولا يموت ابدًا ابدًا، سبوح قدوس، ربنا ورب الملائكة والروح

والے کی۔ تقدیس ہر عزت، عظمت، ہیبت، قدرت، کبریائی اور جبروت والے کی۔ تقدیس ہو اُس زندہ بادشاہ کی جو نہ کبھی سوتا ہے اور نہ کبھی مرتا۔ پاک، قدوس، ہمارا آقا اور تمام فرشتوں اور روحوں کا آقا۔

(۲)

حقیقت صوم

ہم نے مقالۂ سابقہ میں بتایا ہے کہ ماہ صیام کی اصل حقیقت نزول قرآن کی یادگار و تذکار اور حامل قرآن علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اسوۂ حسنہ اور سنت مستحسنہ کی اتباع و تقلید ہے۔ کہ ان ایام میں آپ اسی طرح غار حرا میں قیام فرماتے تھے اور اسی اثنائے ایام میں وہ نامۂ خیر و برکت اور دستور ہدایت و قرآن ہمیں عنایت ہوا جس سے ہم نے جسم کی زندگی اور روح کی تشفی پائی۔ پس یہ یوم اکبر یعنی نزول قرآن جو لیلۃ القدر ہے اسلام کی عید اکبر ہے اور حق ہے کہ تمام بندگان اسلام اور شیفتگان اسوۂ محمدیہ ان ایام مقدسہ میں وہ زندگی بسر کریں جو قرآن کا مطلوب اور حامل قرآن کا نمونہ ہو۔

قرآن مجید نے حکم صیام کے موقع پر جیسا کہ آیات سر عنوان میں مذکور ہے ہم کو صوم کے تین نتائج کی اطلاع دی ہے۔

لعلکم تتقون ۔	تاکہ تم متقی ہو۔
لتکبروا اللہ علی ما ھدٰکم	تاکہ تم اس عطائے ہدایت پر خدا کی تکبیر و تقدیس کرو۔
ولعلکم تشکرون	تاکہ تم اس نزول خیر و برکت اور اس عطائے فرقان پر خدا کا شکر بجا لاؤ۔

اس سے ثابت ہوا کہ صوم کی حقیقت تین اجزاء سے مرکب ہے اتقا، تکبیر و تقدیس اور حمد و شکر۔ پس جس طرح حقیقت مرکبہ کا وجود عین اجزا کا وجود ہے کہ بغیر وجود اجزا حقیقت معدوم، اسی طرح صوم بغیر وجود اجزائے ثلاثہ مذکورہ معدوم و مفقود ہے۔

اعمال انسانیہ کا وجود حقیقی ان کے نتائج و آثار کا وجود ہے اگر نتائج و آثار وجود پذیر نہ ہوئے تو یہ نہ کہو کہ ان اعمال کا وجود تھا اگر ہم دوڑتے ہیں کہ مسافت قطع اور منزل قریب ہو لیکن ہم بھٹک کر دوسرے راستے پر جا پڑتے ہیں جس سے ہماری مسافت دور تر اور منزل بعید تر ہوتی جاتی ہے۔ تو ہماری سعی لاحاصل اور ہماری تگاپو عبث ہے۔ اگر ایک طبیب اپنے مریض کے لئے ایک دوا تجویز کرتا ہے لیکن جس فائدہ کے مترتب ہونے کی امید کرتا ہے وہ مترتب نہیں ہوتا تو یہ نہ سمجھو کہ طبیب نے دوا تجویز کی اور یہ نہ کہو کہ مریض

نے دوا کھائی۔

پس صیام جو ہمارا علاج روحانی ہے اگر اس سے شفائے روحانی نہ حاصل ہو تو حقیقت میں وہ صیام نہیں فاقہ ہے۔ اور ایسے صائم اور روزہ دار جن کے صوم میں اتقا، تقدیس اور شکر کے عناصر ثلاثہ نہیں وہ فاقہ کش ہیں جن کی تشنگی اور گرسنگی ایک پھول ہے جس میں رنگ و بو نہیں۔ ایک گوہر ہے جس میں آب نہیں ایک آئینہ ہے جس میں جوہر نہیں۔ اور ایک جسم ہے جس میں روح نہیں اور کون نہیں جانتا کہ ایک گل بے رنگ و بو۔ ایک گوہر بے آب، ایک آئینہ بے جوہر۔ ایک جسم بے روح بے حقیقت ہستیاں ہیں جنکی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ آنحضرت صلعم نے اسی نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے جہاں فرمایا ہے۔

رب صائم لیس له من صیامه الا الجوع و رب قائم لیس له من قیامه الا السهر (رواه ابن ماجه)

کتنے روزہ دار ہیں جن کو روزہ سے بجز گرسنگی کچھ حاصل نہیں۔ اور کتنے تہجد گزار ہیں جن کی نماز تہجد سے بیداری کے سوا کچھ فائدہ نہیں۔

یہ کون لوگ ہیں؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کے جسم نے روزہ رکھا لیکن دل نے روزہ نہیں رکھا۔ ان کی زبان پیاسی تھی لیکن دل پیاسا نہ تھا پس رحمت کا کوثر انکے لئے نہیں کہ پیاسے نہ تھے۔

ہماری تقسیمات اوقات زندگی کی سب سے بڑی اور طویل

تقسیم خود ہماری عمر اور سب سے مختصر لحظہ ہے۔ ہمارے لیے ہر لحظہ ایمان باللہ بماجاء الرسول۔ ہر روز پانچ بار سجدۂ نیاز ہر ہفتہ نماز جمعہ۔ ہر سال صیام رمضان و زکوٰۃ اور عمر میں ایک بار زیارت مسجد خلیل و ادائے نماز ابراہیمی فرض ہے۔

ہمارا سالانہ فرض دو ہے ایک جسمانی اور ایک مالی۔ فریضہ مالی (زکوٰۃ) محدود بہ اوقات مخصوصہ نہیں ہے لیکن ہمارا فریضہ جسمانی محدود بہ اوقات ہے۔ کہ پہلے سے خدا کی مسکین مخلوق ہر ساعت اور ہر حالت متمتع ہوتی رہے اور دوسرے سے وہ عام یکرنگی اور اظہار اجتماع و وحدت قلوب و اجسام مقصود ہے۔ جو ہر روز مساجد میں اور ہر سال ہر شہر کے کوچہ و بازار اور گھروں میں اور عمر میں ایک بار کوہِ فاران کے دامن میں نظر آتی ہے۔

پس ہمارے سال کا ایک مہینہ ہماری زندگی کا ایک ایسا حصہ ہونا چاہیئے جو تنزہ جسم اور طہارت قلب کا کامل نمونہ ہو۔ تاکہ ہمارا کامل سال منزہ اور طاہر ہو۔ اور اسطرح ہماری کامل زندگی منزہ اور طاہر ہو اسی لیے آنحضرت ص نے فرمایا ہے۔

من صام رمضان ایمانا واحتسابا غفر له ما تقدم من ذنبه (رواہ البخاری)

جس نے رمضان کے روزے ایمان اور احتساب (نیت) کے ساتھ رکھے اُس کے اگلے گناہ معاف ہوئے۔

گناہوں کی معافی اور مغفرت کا حصول، تمام اعمال انسانیہ کا مقصود وحید اور تمام نیکیوں اور برکتوں کا اساس کار ہے لیکن کیا جس نے حصول مغفرت اور گناہوں کی معافی کی امید دلائی اس نے یہ نہیں بتایا ہے کہ وہ مشروط بہ ایمان واحتساب ہے؟

ایمان واحتساب کیا شئے ہے؟ حقیقت صوم کے وہی عناصر ثلاثہ ہیں جن کی طرف کتاب عزیز نے اشارہ کیا ہے یعنی اتقاء۔ تقدیس تکبیر اور حمد وشکر۔

اتقا کے لغوی معنی "کسی چیز سے بچنے" کے ہیں لیکن اسلام کی اصطلاح میں "اتقا" کے کیا معنی ہیں؟ تمام دنیاوی آلائشوں سے، تمام انسانی کمزوریوں سے، تمام جسمانی خواہشوں سے اور تمام نفسانی نجاستوں سے جسم وروح کا محفوظ رکھنا" یہی حقیقت وماہیت صوم ہے۔ جس کے ساتھ دل سے تقدیس وتکبیر کی صدائے غیر محسوس اور زبان سے حمد وشکر کی آواز جہر بلند ہونی چاہیئے تاکہ معتکف حرا کے اسوۂ حسنہ کا کامل اتباع ہو۔

تم سمجھتے ہو کہ آلودگی گناہ، آلائش ہوئی، اور ارتکاب عصیان ونجاسات نفسانی ناقض صوم نہیں، ممکن ہے کہ جسم کا روزہ نہ ٹوٹتا ہو لیکن دل کا روزہ تو ضرور ٹوٹ جاتا ہے۔ اور جب دل ٹوٹا تو جسم میں کیا رکھا ہے۔

الصائم فی عبادة من حین یصبح الی ان یمسی مالم یغتب فاذا اغتاب خرق صومه۔ (رواه الدیلمی)	روزہ دار صبح سے شام تک عبادت خدا میں ہے جب تک کسی کی برائی نہ کرے اور جب وہ برائی کرتا ہے تو اپنے روزہ کو پھاڑ ڈالتا ہے۔

تم سمجھتے ہو کہ بغاوت نفس، اطاعت ہویٰ اور عمل شر منافی صوم نہیں لیکن میں تمہیں سچا سمجھوں یا اُس کو (یعنی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو) جو کہتا ہے:-

ليس الصيام من الاكل والشرب انما الصيام من اللغو والرفث (رواه الحاكم في المستدرك والبيهقي في السنن)

روزہ کھانے پینے سے پرہیز کا نام نہیں ہے بلکہ لغو و عمل شر سے پرہیز کا نام ہے۔

کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ قول زور، عمل بد اور طغیان قلب مضر صحت صوم نہیں؟ لیکن میں کیا کروں کہ مخبر صادق کی آواز سنتا ہوں جس کی میں تکذیب نہیں کر سکتا:

من لم يدع قول الزور والجهل والعمل به فلا حاجة لله ان يدع طعامه وشرابه (رواه البخاري والترمذي والنسائي وابن ماجه واللفظ له)

جو حالت صوم میں کذب و زور اور جہالت کے کام کو نہیں چھوڑتا تو خدا کو کوئی ضرورت نہیں کہ روزہ دار اس کے لیے بیکار اپنا کھانا پینا چھوڑے۔

پس اچھی طرح سمجھ لو کہ صوم کی حقیقت کیا ہے۔ وہ ایک حالت ملکوتی کے ظہور کا نام ہے۔ صائم کا جسم انسان ہوتا ہے لیکن اسکی روح فرشتوں کی زندگی بسر کرتی ہے جو نہ کھاتے اور نہ پیتے ہیں۔ وہ تمام مادیات عالم سے

پاک و ضروریات دنیاوی سے منزہ ہیں انکی زندگی کا فقط ایک مقصد ہوتا ہے اطاعت و امر الٰہی اسلیئے صائم نہ کھاتا ہے نہ پیتا ہے۔ وہ مادیات سے پاک اور ضروریات دنیاوی سے منزہ رہنے کی جہانتک اُسکی خلقت و فطرت اجازت دیتی ہے، کوشش کرتا ہے۔

صائم مجسم نیکی ہے وہ کسی کی غیبت نہیں کرتا، وہ کسی کو بُرا نہیں کہتا وہ کسی سے جہالت نہیں کرتا۔ وہ بدی کا بدلہ نیکی سے دیتا ہے۔ وہ اس کا امتثال امر کرتا ہے جو کہتا ہے (یعنی آنحضرت صلعم)

اذا کان یوم صوم احدکم فلا	تم میں سے جب کسی کے روزے کا دن
یرفث ولا یصخب فان سابہ	ہو تو نہ بدگوئی کرے نہ شور و غل کرے
احد او قاتلہ فلیقل انی	اگر کوئی اُسے بُرا کہے یا اُس سے
امرؤ صائم (رواہ البخاری)	آمادہ شمشیر زنی ہو تو کہدے کہ میں
	روزے سے ہوں۔

اللہ اکبر! وہ ہستیاں کہاں ہیں؟ جو تلوار کا وار روزہ کی سپر پر روکتی ہیں، روزہ سپر ہے، بے شبہہ سپر ہے، وہ آخرت میں حملہ جہنم سے بچاتا ہے اور دنیا میں بغاوت نفس سے بچاتا ہے۔ طغیان ہونے سے بچاتا ہے اور خبث عمل سے بچاتا ہے کیونکہ روزہ کی جزا خود خدا ہے اور وہ خیر محض اور نیکی خالص ہے۔

قال رسول اللہ صلعم۔ قال	حدیث قدسی ہے کہ خدا نے فرمایا۔
اللہ تعالیٰ کل عمل ابن آدم	انسان کا تمام عمل اس کے لیئے ہے
لہ الا الصیام فانہ لی و	لیکن روزہ میرے لیئے ہے۔

وانا اجزی بہ والصیام میں اس کی جزا ہوں اور روزہ سپر ہے
جنة (رواہ البخاری)

پس مبارک ہے وہ جو اس سپر کو لے کر کارزار اعمال میں آتا ہے، کہ وہ حملۂ نفس سے زخمی نہ ہو گا۔ مبارک ہے وہ جو ان ایام میں بھوکا رہتا ہے کہ وہ آسودہ ہو گا۔ مبارک ہے وہ جو ان ایام میں پیاسا رہتا ہے کہ وہ سیراب ہو گا۔

سبوح قدوس ربنا ورب الملئکة والروح

* * *

کیا قرآن رسول کا کلام
اور
انسانی تعلیمات سے ماخوذ ہے؟

اگر کوئی مسلمان نہ ہو یا خدانخواستہ حضرت رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کو صادق اور راست باز تسلیم نہیں کرتا تو اس کے لیے اپنی غلط فہمی سے بے شبہ یہ کہنے کا موقع ہے کہ قرآن پاک خدا کا نہیں بلکہ رسول کا کلام اور انسانی تعلیم سے ماخوذ ہے۔ لیکن ہمارا مخاطب ایک ایسا شخص ہے جو اپنے کو مسلمان کہنے اور مسلمان مانے جانے پر مصر ہے اور ساتھ ہی حضرت محمد رسول اللہ صلعم کو صادق اور راست باز تسلیم کرتا ہے اور اسکے باوجود یہ کہنے کی جرأت کرتا ہے کہ قرآن پاک خدا کا نہیں بلکہ رسول کا کلام ہے اور انھوں نے یہود و نصاریٰ کی سنی سنائی باتوں کو اپنے قرآن میں درج کر دیا ہے۔

جو شخص اپنے کو مسلمان کہکر یہ خیال رکھتا ہو وہ قطعاً اسلام کے دائرہ سے خارج ہے کیونکہ وہ ایک ایسے بنیادی اصول کی جڑ کھودنا

چاہتا ہے جس پر اسلام کی پوری عمارت قائم ہے اور جو اسلام کا مسلمہ عقیدہ اور یقینی تعلیم اور متفقہ فیصلہ ہے۔ جس پر جب سے اسلام ہے تمام امت کا متفقہ مسلمہ اور ناقابل شک یقین کامل ہے۔

جو چیز ایسی یقینی اور مسلم ہو اس پر دلیل قائم کرنا اور دلیلوں کے ذریعہ سے اس پر ایمان کا مطالبہ درحقیقت اس یقین کی کمزوری کا نشان ہے۔ آفتاب کے طلوع پر دلیل مانگنا اپنی نابینائی کا آپ اعلان ہے۔

اسلام کی ساڑھے تیرہ سو برس کی زندگی میں سیکڑوں فرقے پیدا ہوئے مگر اس اصول پر سب کے سب متفق تھے کیونکہ جو اس اصول پر متفق نہیں وہ اسلام کے دائرہ ہی میں شامل نہیں وہ کسی فرقہ میں کیا شمار پاتا۔

کیسے افسوس کی بات ہے کہ آج نام کے مسلمانوں میں ایک ایسے بلند خیال محقق پیدا ہوئے ہیں جو گو مشرق و مغرب کے ہر علم و فن سے کورے ہیں پھر بھی ہمہ دانی کا یہ دعویٰ ہے کہ مشرق و مغرب کا کوئی مسئلہ ایسا نہیں جس میں اجتہاد کا دعویٰ نہ ہو۔

ان صاحب نے شاید ۱۹۰۰ء میں جب وہ چودہ پندرہ برس کے ہونگے اپنے باپ کے ساتھ جو دارالعلوم کے مطبخ اور دارالاقامہ میں منشی کی خدمت پر ایک دو مہینے کے لئے نوکر ہوئے تھے دارالعلوم کے احاطہ میں داخل ہو کر چند ابتدائی کتابیں صرف شروع کی تھیں اس پر اتنا بڑا

جھوٹ وہ بولے ہیں کہ انھوں نے دارالعلوم ندوہ میں علوم کی تکمیل کی ہے (جیسا کہ انھوں نے مصنفین اردو کی فہرست مطبوعہ کتاب گھر حالی پبلشنگ ہوس دہلی میں خود اپنے قلم سے لکھکر چھپوایا ہے ص ۱۳۵) کیا اس کے بعد انکی اخلاقی حالت اس قابل سمجھی جاسکتی ہے کہ وہ حقائق اسلام پر گفتگو فرمائیں اور مسائل میں مجتہدانہ رائے کے اظہار کی جرأت کریں ع

تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

اپنی اس خود نوشت سوانح عمری میں صاحب مذکور نے اپنی تعلیم کا دوسرا مقام رامپور لکھا ہے جہاں اُن کے والد نے وکالت کا پیشہ اختیار کر لیا تھا لیکن وہاں بھی ان کی تعلیم ہدیہ سعیدیہ اور مختصر المعانی سے آگے نہیں ہوسکی۔ اور یہ کتابیں بھی ان کی بنیادی کمزوری کے سبب سے اُنکی سمجھ سے باہر تھیں جیسا کہ انکے ساتھیوں کا بیان ہے۔

یہ ہے ان صاحب کی مشرقی علوم وفنون کی تکمیل اور تبحر کا سارا افسانہ!

اس کے بعد کچھ انگریزی پڑھ کر پولیس کی نوکری کی اور وہاں سے الگ ہو کر یا الگ کئے جانے پر دوسروں کی کمائی کو اپنانے میں اپنے کمال کا اظہار کیا اور حقائق قرآنی اور نکات دینی پر لب کشائی کی جرأت کی۔

عزیزے کہ از درگہش سر بتافت
بہر در کہ شد ہیچ عزت نیافت

اگر ایسا شخص علانیہ اسلام سے ارتداد کرلے یا یہودی عیسائی اور آریہ ہوجائے تو ہم کو کچھ دکھ نہ ہوگا کیونکہ یہ سمجھ لیا جائے گا کہ وہ بھی اسلام

سے غداری کر کے مخالفوں کی صف میں شامل ہو گیا لیکن غم تو اس کا ہے کہ وہ اپنے کو مسلمان کہتا ہے اور اسلام کے قلعہ میں بیٹھکر دشمنوں کے حق میں اسلام کے خلاف تبلیغ میں مصروف ہے اور اسکے سبب سے مسلمان دو طرفہ حملوں میں گھرے ہیں۔ ایک دشمنوں کے حملے کا جواب۔ اور دوسرا دوست نما دشمنوں کے حملے کی روک تھام۔ جب فوج کی صف کے اندر یہ خانہ جنگی برپا ہو اسکی کامیابی کا یقین کوئی کیونکر کرے۔

شخص مذکور دراصل تو قرآن پاک کو خدا کا کلام اسلیئے نہیں مانتا کہ وہ خدا کی ذات و صفات کے یقین سے محروم، نبوت و رسالت کی حقیقت سے بیگانہ اور وحی و الہام کے عقیدہ سے ناآشنا ہے، مگر ظاہر یہ کرتا ہے کہ اسکو اسلیئے نہیں مانتا کہ

۱۔ اس سے لازم آئے گا کہ خدا کی زبان اور منہ ہو

۲۔ اگر قرآن پاک محمد رسول اللہ صلعم کی تصنیف نہ ہو تو رسول اللہ صلعم کی دماغی بلندی اور ذہنی کمال کا ثبوت کیا ہوگا (نعوذ باللہ)

۳۔ قرآن نے اپنے کو کہیں کلام اللہ نہیں کہا ہے۔

ان خرافات کی تردید کی چنداں ضرورت نہ تھی مگر اس لیئے تاکہ یہ نہ کہا جائے کہ ہم کو جواب نہیں دیا گیا۔ چند سطروں کے لکھنے کی ضرورت ہے

صفتِ کلام

دراصل یہ مسئلہ صفاتِ الٰہی کے مسئلہ کی ایک کڑی ہے دنیا میں کوئی شئے صفات سے خالی ہو کر نہیں پائی جاسکتی، عرصۂ ہستی میں اوپر سے نیچے تک جو چیز بھی ہے وہ چند صفات

سے متصف ہی ہو کر پائی جا رہی ہے۔ انہی اصول کے تحت ہیں وہ ہستی اقدس بھی جس سے ساری دنیا کی ہستی ہے صفات سے خالی نہیں۔ عام اہل سنت اور غیر اہل سنت میں اختلاف اس میں ہے کہ ان صفات کا منشا خود ذات الٰہی ہے یا ذات سے علیحدہ ہو کر وہ صفات اس میں اسی طرح پائے جاتے ہیں جیسا کہ ممکنات میں ہم کو نظر آتے ہیں۔

بہرحال جو پہلو بھی اختیار کیا جائے صفات الٰہی کے منشا اور آثار کے ظہور سے کسی فرقہ بلکہ مطلقاً کسی مذہب کو انکار نہیں۔ اسی بنا پر ہم خدا کو سمیع (سننے والا) بصیر (دیکھنے والا) متکلم (بولنے والا) مرید (ارادہ کرنے والا) اور قادر (قدرت والا) یقین کرتے ہیں۔ اسلام کا کوئی فرقہ ایسا نہیں جو یہ کہے کہ جب وہ سنتا ہے تو اسکے ہمارے جیسے کان بھی ہونگے۔ وہ دیکھتا ہے تو ہماری جیسی اسکی آنکھیں بھی ہونگی۔ وہ بولتا ہے تو ہماری جیسی اس کی زبان بھی ہوگی۔ اسی طرح دوسری صفات کا فرق ہے۔

ان صفات کی تعبیر دو طریقوں سے کی گئی ہے۔

۱۔ صفات عین ذات ہیں یعنی خود ذات میں ان صفات کا منشا پایا جاتا ہے۔ خدا کو "سمیع" کہنے کا یہ مطلب ہے کہ جن باتوں کا علم ہم کو کانوں سے سن کر ہوتا ہے خدا کو ان کا علم ہے۔ "بصیر" اسلئے کہتے ہیں کہ جن چیزوں کو ہم دیکھ کر محسوس کرتے ہیں ان کو بھی خدا جانتا ہے اور "متکلم" اس لیے کہتے ہیں کہ ہم اپنے جن اندرونی خیالات

اور مافی الضمیر کو اپنی زبان کی حرکت اور آواز سے دوسروں پر ظاہر کرتے ہیں خدا بھی اپنی ان باتوں سے دوسروں کو اطلاع بخشتا ہے اور یہی اللہ کا کلام ہے۔

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ان صفات کے اظہار کے جو آلات ہم میں پائے جاتے ہیں انہی نوعیتوں کی چیزیں اللہ تعالیٰ میں بھی پائی جاتی ہونگی اور اسی ادنیٰ تعلق سے خدا کے ہاتھ کو ہاتھ، آنکھ کو آنکھ، سننے کو سننا اور بولنے کو بولنا کہتے ہیں۔ اس کے ہاتھ ہیں مگر ہماری طرح نہیں۔ کان ہیں مگر ہماری طرح نہیں۔ وہ کلام کرتا ہے مگر ہماری طرح نہیں کیونکہ وہ خود اور اس کی ساری صفتیں قرآن کے اس اصول کے تحت ہیں ہیں۔

لَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْءٌ (شوریٰ-۲) | اس جیسی کوئی چیز نہیں۔

بہرحال ان میں سے جو پہلو بھی اختیار کیا جائے صفات الٰہی کا منشا پورا ہوگا اب جو شخص کسی کو اپنے مافی الضمیر سے متعین اشاروں کے ذریعہ یا تحریر کے ذریعہ یا کسی قاصد کے ذریعہ یا تار ٹیلیفون اور ریڈیو کے ذریعہ یا مسمرازم میں معمول میں اپنی تاثیر کے ذریعہ جو اطلاع دوسروں کو دیتا ہے وہ اطلاع یا کلام ذریعہ کا نہیں ہوتا، وہ اصل متکلم یا کاتب کا ہوتا ہے۔ ان درمیانی ذریعوں کا کام صرف ایصال ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کو اپنے ارادہ، اطلاع اور حکم سے جو اطلاع بخشتا ہے وہ کلام الٰہی ہی کلام رسول نہیں۔

انبیاء علیہم السلام میں علم کی دو قسم کی طاقتیں ہوتی ہیں

یہ آلات جن کے ذریعہ ہم اظہار مدعا کرتے ہیں بے جان اور بے ارادہ ہیں ہم جس طرح چاہتے ہیں ان کو استعمال کرتے ہیں

لیکن انبیا علیہم السلام کی یہ صورت نہیں ۔ وہ جان اور ارادہ رکھتے ہیں لیکن ان کا یہ ارادہ تمام تر حکم الٰہی کے مطابق ہوتا ہے۔

اللہ تعالےٰ نے ان انبیا علیہم السلام میں جیسا کہ شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ میں لکھا ہے دو قسم کی علمی استعدادیں رکھی ہیں ایک تو قوانین شریعت کا وہ اصولی علم جس کے ذریعے سے وہ کلیات کے تحت میں جزئیات پر حکم لگاتے ہیں قوانین الٰہی کا یہ علم ان میں اسی طرح ودیعت رکھا جاتا ہے جس طرح انسان حیوان، چرند، پرند غرض تمام انواع میں کچھ فطری علم ودیعت رکھ دیا جاتا ہے انسان کے بچہ کو دودھ پینا کون سکھاتا ہے، حیوانات کے بچوں کو چرنا اور چگنا کون بتاتا ہے۔ پرندوں کے بچوں کو اڑنا، آبی جانوروں کے بچوں کو تیرنا کون تعلیم کرتا ہے۔ وہی خالق فطرت! اور حاکم خلقت! اسی کو وحی فطری کہتے ہیں۔ مثال کے لئے انسانوں میں فطری شاعر، فطری موجد، فطری مقنن فطری ریاضی داں کا وجود کافی ہے۔

حضرات انبیا کے اس ذریعۂ علم کو ملکہ نبوت اور فہم نبوی بھی کہہ سکتے ہیں اور وحی خفی بھی اس کا نام رکھ سکتے ہیں اور یہی ذریعۂ علم انبیاؑ کی جلالت علم کو ظاہر کرتا ہے۔

دوسرا علم وہ ہے جو وقتاً فوقتاً انبیا کو ان کے کسب، نظر اور عمل تفکر کے بغیر بارگاہ الٰہی سے عطا ہوتا ہے۔ اس ذریعۂ اطلاع میں انبیا اسی طرح بے جان اور بے ارادہ آلات کی طرح ہیں جن کی مثال اوپر دی گئی یہی وحی جلی ہے اور یہی کلام الٰہی ہے۔ اس طریق پر انبیا کو جو علم ہوتا ہے وہ انبیا کا

نہیں بلکہ خدا کا کلام ہے۔ کیونکہ اس علم کے پانے میں ان کا عمل تفکیر یا قوت ذہنی یا تجربہ ومشاہدہ کا کام نہیں کرتا بلکہ وہی پاتے ہیں جو اُن کو اوپر سے دیا جاتا ہے اور وہی سنتے ہیں جو آسمان سے سنایا جاتا ہے[1]۔ یہ یہود و نصاریٰ کی سنی سنائی باتوں اور رائج الوقت افسانوں کا مجموعہ نہیں ہوتا۔ (نعوذ باللہ تعالےٰ)

انبیا کے علم کا ماخذ

انبیا علیہم السلام کی یہ دونوں علمی قوتیں انسانوں سے ماخوذ نہیں اور نہ وہ انسانوں کی سنی سنائی باتوں کو دہراتے ہیں، وہ خدا سے علم حاصل کرتے ہیں اور غیب کے خزانے پاتے ہیں چنانچہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے بتصریح فرمادیا ہے کہ وہ کیونکر انبیا علیہم السلام کو اپنے حکم و اطلاع سے باخبر کرتا ہے۔

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ
اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآءِ
حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا
فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ
اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ
(شوریٰ - ۵)

اور کسی آدمی کی تاب نہیں کہ اللہ اُس سے دوبدو کلام کرے لیکن یہ کہ وہ الہام کرے یا پردے کے پیچھے سے بات کرسکے یا کوئی قاصد بھیجے جو اللہ کے حکم سے اللہ کی مشیت کا پیغام اسکو پہونچا دیتا ہے۔ اللہ کی شان بڑی ہی اور وہ حکمت والا ہے۔

ان آیتوں میں صاف تصریح ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی بشر سے یوں

---

[1] اس اجمال کی پوری تفصیل سیرۃ النبی ؐ کی تیسری جلد میں ہے۔ قرآن پاک کی آیتیں اور ائمہ کے اقوال بھی اس میں درج ہیں۔

باتیں نہیں کرتا بلکہ اپنی باتوں سے دوسروں کو مطلع کرنے کے لیئے وہ تین طریقوں سے کام لیتا ہے۔

۱۔ الہام اور القا یعنی آواز اور قاصد کے بغیر خود بخود بلا واسطہ وہ قلب میں ڈال دیتا ہے یا یوں کہیئے کہ وہ اس علم کو قلب انسانی میں پیدا کردیتا ہے اسکو احادیث میں "نفث فی الروع" کہا گیا ہے۔

۲۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ پردہ کے پیچھے سے یعنی غیب سے کوئی آواز آتی ہے جسکو نبی سنتا ہے لیکن بولنے والا نظر نہیں آتا۔

۳۔ تیسرا طریقہ یہ ہے کہ فرشتہ یا قاصد الٰہی نبیوں کے پاس خدا کا پیغام لیکر آتا ہے اور وہ انکو سکھا اور بتا جاتا ہے یا قلب میں اُتار جاتا ہے۔

نکتہ ۔ آیت بالا کا اخیر ٹکڑا جس میں اللہ تعالیٰ کی رفعت شان اور حکمت بینی کا ذکر ہے اس موقع پر خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی شان کی بلندی اور علو و رفعت تو اس کی مقتضی ہے کہ کسی بشر کی یہ مجال نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ اسکو اپنے کلام کا شرف بخشے کہ وہ علی ہے لیکن چونکہ وہ حکیم بھی ہے اسلیئے اسکی حکمت اور مصلحت کا اقتضا یہ ہے کہ بندوں کو اپنے علم کی اطلاع بخشے۔ اسلیئے اس نے اپنی رفعت اور بلندی کے باوجود بمقتضائے حکمت وحی کے یہ تین طریقے پیدا کیئے جن کے ذریعہ سے وہ اپنے علم و مشیئت سے بندگان خاص کو آگاہ فرماتا ہے۔

احکام الٰہی وحی کے ان تین طریقوں سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتے ہیں یعنی وحی بلا آواز و واسطہ۔ اور وحی بہ آواز غیب

اور وحی بذریعۂ قاصد و فرشتہ چنانچہ قرآن پاک میں انہی اوپر کی آیتوں کے بعد اُن سے متصل ہی ارشاد ہے۔

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ؕ مَا كُنْتَ تَدْرِىْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِىْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا (شوریٰ)	اور اسی طرح ہم نے تیری طرف اپنے دین کی روح[1] (قرآن) وحی کی تو (پہلے) جانتا بھی نہ تھا کہ کتاب کیا ہے۔ اور ایمان کیا چیز ہے لیکن ہم نے اسکو روشنی بنایا ہے جس سے اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں راہ دکھاتے ہیں۔

یہ آیت وحی کے اقسام ثلاثہ کو جامع ہے (تفسیر روح المعانی میں ایک قول) اب خاص قرآن پاک کی نسبت آیتیں ملاحظہ ہوں۔ سورۂ بقر میں ہے

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (بقرہ)	کہدے کہ جو جبریل کا دشمن ہے (تو وہ ہو اس سے قرآن کی صداقت پر حرف نہیں آتا) کیونکہ اس نے (اے محمد) تیرے قلب پر خدا کے حکم سے اس قرآن کو اتارا ہے۔
وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ عَلٰى عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ	یہ قرآن سارے جہان کے پروردگار کی طرف سے اترا ہے اسکو روح الامین فرشتہ لیکر تیرے قلب پر اترا تاکہ

---

[1] بعضوں نے رُوْحًا کی تفسیر رحمت سے کی ہے

الْمُنْذِرِيْنَ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ه (شعرا)	تو عربی زبان میں خدا کا ڈر سنانے والوں میں سے ہو۔
وَإِذَا بَدَّلْنَا آيَةً مَّكَانَ آيَةٍ وَّاللّٰهُ أَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوْا إِنَّمَا أَنْتَ مُفْتَرٍ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ه قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ ۔ (نحل۔ ۱۴)	اور جب ہم ایک حکم کی جگہ دوسرا حکم رکھتے ہیں اور خدا زیادہ جانتا ہے جس کو وہ اتارتا ہے تو یہ کافر کہتے ہیں کہ تو خدا کے نام سے بنا کر لاتا ہے (خدا پر افترا کرتا ہے) یہ لوگ جاہل ہیں ایسا کہتے ہیں اے رسول انکے جواب میں کہہ کہ روح القدس نے تیرے پروردگار کی طرف سے سچائی کے ساتھ اسکو اتارا ہے

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوتا ہے۔

فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى (طٰہٰ)	جو وحی کیا جاتا ہے اسکو سن

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد ربانی ہے۔

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ (قیامۃ)	اپنی زبان کو اس غرض سے قرآن کے الفاظ کو (سن کر) مت ہلا کہ اس کو جلدی سے لے لے ہم پر ہے اسکا یاد کرانا اور پڑھنا۔

ان تمام آیتوں سے ظاہر ہے کہ قرآن پاک فرشتہ الٰہی کے ذریعہ سے محمد رسول اللہ صلعم کے قلب مبارک پر اترا اور گوش مبارک میں بھی

آیا اس کے معلومات کا سرچشمہ انسانی قصص و حکایات اور بشری علم و تجربہ اور سوجھ بوجھ نہیں ہے۔ اب خاص قصص قرآنی کی نسبت ہم کو دیکھنا ہے کہ کیا قرآن پاک اس کا ماخذ یہود و نصاریٰ کی سنی سنائی باتوں کو قرار دیتا ہے یا فیضان الٰہی اور تعلیم ربانی کو۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ کے شروع میں ہے۔

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا	ہم نے قرآن کو عربی میں اتارا ہے
لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ نَحْنُ نَقُصُّ	تاکہ تم سمجھو ہم تم کو اچھی طرح بیان کرکے
عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ	ایک قصہ اسلیئے سناتے ہیں کہ ہم نے
اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ وَ	تمھاری طرف قرآن کو وحی کیا ہے اور
اِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ (یوسف)	تم اس سے پہلے ناواقف تھے۔

آخر میں ہے۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ	یہ غیب کی باتوں میں سے ہے۔ ہم
نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ (یوسف)	تمھاری طرف اسکو وحی کرتے ہیں۔

حضرت موسیٰ ع کے قصہ میں ہے۔

وَمَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِيْٓ اَهْلِ	اور تو مدین کے رہنے والوں میں سے
مَدْيَنَ تَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا	نہ تھا۔ اُن پر تو ہماری آیتوں کو
وَلٰكِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ وَمَا كُنْتَ	پڑھتا تھا لیکن ہم ہیں بھیجنے والے
بِجَانِبِ الطُّوْرِ اِذْ نَادَيْنَا	اور تو طور کے کنارے نہ تھا جبکہ
وَلٰكِنْ رَّحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ	ہم نے پکارا لیکن تیرے پروردگار کی

لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّا اَتَاهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ (قصص)	رحمت سے تاکہ تو اس قوم کو ڈرائے، جس کے پاس ڈرانے والے نہیں آئے تجھ سے پہلے تاکہ وہ نصیحت پکڑیں۔

اسی قصہ کے موقع پر خدا فرماتا ہے۔

نَتْلُوْا عَلَيْكَ مِنْ نَّبَاِ مُوْسٰى وَفِرْعَوْنَ بِالْحَقِّ (قصص)	ہم موسیٰ اور فرعون کا قصہ سچائی کے ساتھ تم کو سناتے ہیں۔

حضرت مریمؑ کے قصہ میں ہے۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ (آل عمران-۵)	یہ غیب کی خبروں میں ہے ہم اسکو تمھاری طرف وحی کرتے ہیں اور تم جب وہ لوگ اپنے قلم (قرعہ کے لئے) ڈال رہے تھے انکے پاس نہ تھے۔

دیکھا کہ قرآن پاک نے اپنے قصص کا ماخذ انسانی ذرائع کو نہیں بلکہ ربانی سرچشمہ علم اور غیب کی طاقت کو بتایا ہے۔

آخر میں ہم ایک "مسلمان" کی عبرت کے لیئے مولانا شبلی مرحوم کی کتاب سے ایک بیان نقل کرتے ہیں جس سے یہ معلوم ہوگا کہ "ایک زبردستی کے مسلمان" نے جو بات کہی ہے وہ حرف بحرف عیسائیوں سے ماخوذ ہے اور اس کا جواب ایک "جبر کے مسلمان" سے بہتر ایک نومسلم فرینچ نے دیا ہے۔

"عیسائیوں نے اس بات کے ثابت کرنے کے لئے بہت کوشش کی کہ آنحضرت پڑھے لکھے تھے، تورات اور انجیل سے واقف تھے اور جرجیس نام ایک عیسائی سے تعلیم حاصل کی تھی۔ اگر یہ صحیح ہے تو خدا کی نسبت آنحضرتؐ کا یہ خیال پیدا ہونا اور بھی زیادہ بعید بلکہ محال تھا کیونکہ اس زمانہ کی تورات، انجیل اور عیسائی معلم اسی خدا کی تلقین کر سکتے تھے جو خود ان کا خدا تھا۔ فرانس کا مشہور فاضل کانٹ ہنری دی کاستری اپنی کتاب اسلام میں لکھتا ہے:۔

"ان روایات کا پتہ لگانا جن سے یہ ثابت ہو کہ محمد صلعم نے عیسائیوں یہودیوں اور ستارہ پرستوں کے عقائد بالمشافہہ حاصل کئے تھے فائدہ سے خالی نہیں کیونکہ اس سے ان مقامات کی تشریح ہوتی ہے جہاں قرآن اور تورات کی آیتیں ہم مضمون ہیں لیکن پھر بھی یہ درجہ دوم کی بحث ہے کیونکہ گو یہ فرض کر لیا جائے کہ قرآن آسمانی کتابوں سے ماخوذ ہے لیکن یہ مشکل حل نہیں ہوتی کہ محمدؐ میں یہ مذہبی روح کیونکر پیدا ہوئی اور وحدانیت کا ایسا مضبوط اعتقاد کیونکر پیدا ہوا۔ جو ان کے جسم و روح پر بالکل چھا گیا۔"

یہی مصنف آگے چل کر لکھتا ہے:۔

"یہ محال ہے کہ یہ اعتقاد تورات اور انجیل کے مطالعہ سے پیدا ہوا اگر محمدؐ نے ان کتابوں کو پڑھا ہوتا تو ان کو اٹھا کر پھینک دیا ہوتا کیونکہ وہ ان کی فطرت اور وجدان اور مذاق کے مخالف تھیں

اس قسم کے اعتقاد کا محمدؐ کی زبان سے ادا ہونا ان کی زندگی کا سب سے بڑا مظہر ہے اور وہی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ رسول صادق اور پیغمبر مامون تھے۔" (الکلام صہ ۱۳۲)

آخری سوال یہ ہے کہ خود محمد رسول اللہ صلعم نے جو مخاطب کے نزدیک صادق اور راستباز تھے۔ اس قرآن کے نسبت کیا دعویٰ کیا ہے آیا یہ کیا ہے کہ وہ میری بنائی ہوئی انسانی کتاب ہے۔ یا یہ کہا ہے کہ وہ حرف بحرف اللہ تعالیٰ کا فرمودہ ہے جو محمد رسول اللہ صلعم کے ذریعہ انسانوں کو ملا ہے۔ اس بحث کے فیصلہ کے لئے خود قرآن پاک کی طرف رجوع کرنا کافی ہوگا۔

قرآن پاک کا دعویٰ

کہ وہ خدا کا کلام ہے سورۂ بقر میں یہود کے تذکرہ میں ہے کہ وہ خدا کا کلام سننے کے بعد اس میں تحریف کرتے تھے۔

وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلَامَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ (بقرہ)	یہودیوں میں ایک گروہ ہے جو اللہ کے کلام کو سن کر پھر اس میں تحریف کرتے ہیں اس کے بعد کہ وہ اسکو سمجھ چکے اور وہ جانتے ہیں۔

کلام اللہ سے مراد ظاہر ہے کہ قرآن پاک ہے۔ جس کو سن کر اور سمجھ کر یہودیوں کا ایک گروہ اس کے لفظوں اور معنوں میں تحریف کرتا تھا اور اس کو یا تو اپنے غلط مقصد کے مطابق بنانا چاہتا تھا یا اس سے خلاف مقصود معنی نکال کر اس پر اعتراض کیا کرتا تھا۔

کوئی یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ یہاں کلام اللہ سے مراد تورات ہے۔ یہود اسکے مطلب میں تحریف کرتے تھے مگر اس سے مسلمانوں کے استدلال میں کوئی فرق نہیں آتا کیونکہ کلام اللہ ہونے میں تورات اور قرآن اور تمام دوسرے صحف الٰہی برابر کے شریک ہیں جو معنی ایک کے کلام اللہ ہونے کے ہیں۔ وہی سارے صحف الٰہی کے کلام الٰہی ہونے کے ہیں۔

سورہ فتح میں اللہ تعالیٰ اپنے ارشاد مبارک کو جو قرآن پاک میں وعدہ کی صورت میں وارد ہوا تھا کلام اللہ فرمایا ہے۔

يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّبَدِّلُوْا كَلٰمَ اللّٰهِ (فتح)	وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے کلام کو بدل دیں۔

یعنی منافقین جو غزوہ سے پیچھے رہ گئے تھے وہ چاہتے ہیں کہ ارشاد الٰہی کو بدل دیں۔

۳۔ کفار جو گرفتار ہو جائیں انکو قرآن سنا کر تبلیغ کا فرض ادا کرنا چاہیئے۔

فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ (توبہ)	تو تم اس کو پناہ دو یہانتک کہ وہ خدا کا کلام سن لے۔

قرآن پاک کی نسبت بار بار اعلان ہے کہ وہ خدا کی طرف سے اترا ہے۔

تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ (واقعہ حاقہ)	پروردگار عالم کا اتارا ہوا
وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (شعراء)	یہ قرآن بے شک پروردگار عالم کا اتارا ہوا ہے۔

تَنْزِيْلُ الْكِتَابِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ (زمر و جاثیہ)	غالب اور حکمت والے خدا کی اُتاری ہوئی کتاب۔
تَنْزِيْلُ الْكِتَابِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ (مومن)	غالب و دانا خدا کی اتاری کتاب۔
تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ (یٰسین)	اس غالب رحم والے کا اُتارا ہوا۔
تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ (فصلت)	رحمت والے رحیم کا اُتارا ہوا۔
تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ (فصلت)	حکمت والے خوبیوں سے بھرے ہوئے کا اُتارا ہوا۔

وحی از روئے قرآن

اور

مدعی کا تضاد بیان

(۲)

شخص مذکور نے بکمال تفاخر قرآن پاک کی اُن چند آیتوں سے جن میں بعض جانور اور بعض غیر پیغمبروں کی طرف وحی کی نسبت ہے۔ یہ ثابت

کرنے کی کوشش کی ہے کہ وحی "برمحل سوجھ بوجھ" اور "نفسانی تاثرات" کا نام ہے حالانکہ برمحل سوجھ بوجھ سے مقصود وہ علم ہے جو انسان کو غور و فکر و استدلال اور ذاتی تجربہ و مشاہدہ سے حاصل ہوتا ہے۔ اور وہ کسب نظر اور حواس کا فیض ہے اور صحت اور خطا دونوں کا مورد ہے اور وحی اس علم کا نام ہے جو خدا کی جانب سے بندہ کو بندہ کے غور و فکر اور تجربہ و مشاہدہ کے بغیر عطا ہوتا ہے۔ اور وہ سراپا یقین اور یکسر صحیح ہوتا ہے جس میں خطا کا امکان ہی نہیں اور اس کو ہر خطا سے محفوظ رکھا جاتا ہے۔

وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ (حم سجدہ - ۵)	اور یہ وہ زبردست کتاب ہے کہ باطل جس کے نہ سامنے سے اس کے پاس پہونچ سکتا ہے اور نہ پیچھے سے ایک حکمت والے خوبیوں والے (خدا) کی طرف سے اتری ہے۔
عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا لِّيَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ	خدا کا غیب کا دانا ہے۔ وہ اپنے غیب کی بات کسی پر ظاہر نہیں کرتا لیکن رسولوں میں سے جس کو پسند کرے۔ تو وہ چلاتا ہے اس کے سامنے اور اس کے پیچھے سے نگہبان، تاکہ ظاہر کرے کہ ان رسولوں نے اپنے

رَبِّهِمْ وَاَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ وَاَحْصٰى كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا (جن۔ ۲)	پروردگار کے پیغاموں کو پہنچا دیا اور اس نے اُس کے پاس جو ہے اُسکو گھیر رکھا ہے۔ اور ہر چیز کو گن لیا ہے

اور اسی لیے وہ اُلحق ہے یعنی یقینی اور سچی۔

اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ (آل عمران۔ ۶)	یہ سچی بات تیرے پروردگار کی طرف سے ہے تو تو شک کرنے والوں میں سے نہ ہو۔

خاص قرآن پاک کی نسبت ہے۔

الٓمّٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ مَا الْحَقُّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ (رعد۔ ۱)	یہ ہیں آیتیں کتاب کی۔ اور وہ چیز جو اُتاری گئی ہے تیری طرف تیرے رب کی طرف سے وہ سچ اور یقینی ہے لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے۔
وَيَرَى الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ هُوَ الْحَقَّ (سبا۔ ۱)	اور جن کو علم دیا گیا ہے وہ جانتے ہیں کہ جو تیری طرف تیرے پروردگار کی طرف سے اترا ہے، وہی حق ہے۔
وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ (مائدہ)	اور ہم نے تیری طرف یہ کتاب حق کے ساتھ اُتاری۔
نَّا اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ۔ (زمر۔ ۱)	ہم نے تیری طرف یہ کتاب سچائی کے ساتھ اُتاری

اِنَّآ اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡكَ الۡكِتٰبَ	ہم نے تجھ پر یہ کتاب لوگوں کیلئے
لِلنَّاسِ بِالۡحَقِّ (زمر-۴)	سچائی کے ساتھ اتاری

اسی معنی کی اور بہت سی آیتیں قرآن پاک میں ہیں ان سے واضح ہوگا کہ قرآن پاک کا یہ عمومی دعوٰی ہے کہ اس میں جو کچھ ہے وہ یکسر حق، تمامتر صداقت اور سراپا یقین ہے۔ یہ "انسانی سمجھ بوجھ" نفسانی تاثر اور یہود نصاریٰ کے "مسروقہ مضامین" نہیں ہیں۔

سورۂ ہود میں ایک آیت ہے جو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خاص اسی قسم کے خرافات نگار کی تردید میں ارشاد ہے۔

فَلَا تَكُ فِيۡ مِرۡيَةٍ مِّنۡهُ	تو اس کتاب کے اللہ کی طرف سے
اِنَّهُ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّكَ وَ	ہونے میں شک نہ کر وہ بالکل ہی حق ہے
لٰكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ	لیکن اکثر لوگوں کو ایمان نہیں اور اس
وَمَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنِ افۡتَرٰى	شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا۔ جو
عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اُولٰٓئِكَ	خدا پر جھوٹ[1] باندھے۔ ایسے لوگ
يُعۡرَضُوۡنَ عَلٰى رَبِّهِمۡ وَ	اپنے پروردگار کے روبرو پیش کیے
يَقُوۡلُ الۡاَشۡهَادُ هٰٓؤُلَآءِ الَّذِيۡنَ	جائیں گے اور گواہ کہیں گے کہ یہی
كَذَبُوۡا عَلٰى رَبِّهِمۡ اَلَا لَعۡنَةُ اللّٰهِ	وہ ہیں جو اپنے پروردگار پر

---

[1] یعنی یہ کہے کہ خدا نے مجھ پر کتاب اتاری۔ حالانکہ خدا نے نہیں اتاری بلکہ خود گھڑ کر بنائی ہے جیسا کہ مدیر نگار کا کافرانہ زعم باطل ہے۔

عَلَى الظّٰلِمِيْنَ الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ كٰفِرُوْنَ

(ہود-۲)

جھوٹ جوڑتے تھے۔ ہاں ان ظالموں پر اللہ کی لعنت جو اللہ کے راستے سے لوگوں کو روکتے ہیں اور اس راہ کو وہ کج بنانا چاہتے ہیں اور وہی آخرت کے منکر ہیں۔

اس شخص سے بڑھ کر دروغ گو اور کون ہو سکتا ہے جو یہ دعویٰ کرے کہ خدا نے فرشتہ کے ذریعہ مجھ پر کتاب نازل کی ہے حالانکہ وہ خود اسکی "ذاتی سمجھ بوجھ" اور "نفسانی تاثرات" کا نتیجہ ہے۔

اسی سورہ میں خاص قصص قرآنی کے سلسلہ میں حضرت نوح علیہ السلام کے قصہ کے بعد ارشاد ہے۔

تلك من انباء الغيب نوحيها اليك ما كنت تعلمها انت ولا قومك من قبل هذا

(ہود-۴)

یہ غیبی اطلاعوں میں سے ہے جن کو ہم تجھ پر وحی کرتے ہیں۔ تو نہ خود ان کو اس سے پہلے جانتا تھا اور نہ تیری قوم جانتی تھی۔

آپ نے دیکھا کہ قصص قرآنی اور غیبی اطلاعات میں سے ہیں جن سے نہ صرف یہ کہ اس وحی سے پہلے آپ کو واقفیت نہ تھی بلکہ ساری قوم عرب ان سے ناواقف تھی۔ **غیبی اطلاعات** یہود و نصاریٰ کے مسموعات اور مسروقات نہیں! عرب کی گذشتہ قوموں کے حالات سُنانے کے بعد ارشاد ہے۔

تِلْكَ الْقُرٰى نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْبَآئِهَا (اعراف ۱۳)	ان آبادیوں کا تھوڑا حال ہم تم کو سناتے ہیں۔

یہ سنانے والا اور بتانے والا کون ہے؟ کیا خود خدا نہیں۔

کیا اب بھی اس باطل نگار کے اس دعوٰی کی:۔

"اس صورت میں الہام یا وحی سے مراد صرف وہ تاثرات ہونگے جو ایک النسان یا رسول کے دل و دماغ میں پیدا ہوتے ہیں اور جنھیں وہ مروّجہ زبان میں نہایت کامیابی و خوش اسلوبی سے ادا کر دیتا ہے..... قرآن مجید میں اسرائیلیات کا حصّہ کوئی تاریخی حیثیت نہیں رکھتا۔ اور نہ اسے کلام مجید میں درج ہونے سے صحیح کہا جا سکتا ہے۔ عہدِ نبوی میں اس قسم کی روایتیں تورات و انجیل کے حوالہ سے یہود و نصارٰی کی طرف سے عام طور پر بیان کی جاتی تھیں اور چونکہ توریت و انجیل کے الہامی ہونے کا غلط خیال پہلے ہی سے قائم تھا اسلیئے رسول اللہ نے بھی ان کو محض اعتبار و بصیرت کے لئے بیان کر دیا۔ اس سے کوئی بحث نہیں کہ وہ صحیح ہے یا غلط۔"

سچائی کا کوئی ذرہ بھی نصیب ہو سکتا ہے۔

مشرکین کا تو دعوٰی ہی یہ تھا کہ قرآن خدا کا کلام نہیں اور نہ اس کو فرشتہ لاتا ہے بلکہ محمد اپنے جی سے گھڑ کر اور پرانے قصوں (اساطیر الاولین) کو سن کر بتا لیتے ہیں اور جھوٹ خدا کی نسبت کر دیتے ہیں۔ اب اگر یہی بات ایک نام کا مسلمان کہتا ہے تو اس میں اور ابولہب اور ابوجہل وغیرہ

میں فرق کیا ہے۔ قرآن مجید نے اُن کے اسی اعتراض کو افترا علی اللہ (خدا پر جھوٹ باندھنا) کہکر ادا کیا ہے۔ اور اسکی جا بجا تردید کی ہے۔ کفار کہتے تھے۔

ان هو الا رجل افترى على الله كذبا (مومنین)	محمد ایک ایسا شخص ہے جو خدا پر جھوٹ باندھتا ہے۔
ام یقولون افترى على الله كذبا (شوریٰ)	کیا یہ کافر کہتے ہیں کہ پیغمبر نے خدا پر جھوٹ باندھا ہے۔

اسکے جواب میں خدا فرماتا ہے۔ اے پیغمبر۔

قل ان افتریته فعلی اجرامی (هود-۳)	کہدے اگر میں نے اس قرآن کو خدا پر جھوٹ باندھا تو اس کا گناہ مجھ پر ہے
قل ان افتریته فلا تملکون لی من الله شیئا (احقاف)	کہدے کہ اگر میں نے اس قرآن کو خدا پر جھوٹ باندھا ہے تو تم اللہ کی طرف سے میرے واسطے مالک نہیں۔

سورۂ انعام میں ہے۔

ومن اظلم ممن افترى على الله كذبا او قال اوحی الی ولم یوح الیه شیئ (انعام-۱۱)	اور اس سے بڑھکر کون ظالم ہوگا جو اللہ پر جھوٹ باندھتا ہے اور جو کہتا ہے کہ مجھ پر وحی بھیجی گئی ہے حالانکہ اس پر کوئی وحی نہیں آئی۔

کیا عجیب بات ہے کہ قرآن پاک تو اس افترا کی نفی کرتا ہے اور

نام کا مسلمان اسکو رسول کے لیئے ثابت کرنے کی جرأت کرتا ہے۔ کفار کے اس دعوائے افترا علی اللہ کے جواب میں بے شمار آیتیں ہیں جنکا یہاں نقل کرنا بھی مشکل ہے۔

قرآن پاک میں لفظ وحی آسمان و زمین اور بعض جانوروں اور ید وغیر بنی انسانوں کی شان میں بھی آیا ہے اس سے اس غلط نگار نے یہ نتیجہ نکالا ہے۔

"وحی کے لغوی معنی اشارۂ سریع یا الہام بالسر کے ہیں۔ اردو میں اس کا صحیح مفہوم "برمحل سوجھ بوجھ" کے فقرہ سے ظاہر کیا جاسکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ قوت کسب و اکتساب سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ فطری ودیعت ہے اسلیئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ وحی "خدا کی دین" اور نتیجہ ہے اس ذہنی قوت کا جو فطرۃً انسان میں ودیعت کی گئی ہے اور چونکہ یہ قوت انبیاء میں زیادہ پائی جاتی تھی اور ان کا ہر قول و فعل صرف نوع انسانی کی خدمت کے لیئے ہوتا تھا اس لیئے یہ کہنا نادرست نہیں کہ ان کی ہر بات وحی کا نتیجہ تھی اور ان کے منھ سے جو کچھ نکلتا تھا وہ اسی اشارۂ خداوندی کے ماتحت ہوتا تھا۔"

(جولائی ص ۵۹)

کیا ان سطروں میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ وہی ہے جو گذشتہ پرچہ میں بڑے عالمانہ ناز و تبختر سے اس کے قلم سے نکلا تھا ذرا اس "عذر گناہ" کو اصل گناہ سے ملا کر دیکھئے کہ مسلمانوں کی گرفت سے گھبرا کر کہاں سے کہاں پہونچا ہے اس کا اصل دعوٰی تو یہ تھا۔

"کلام مجید کو نہ میں کلام خداوندی سمجھتا ہوں نہ الہام ربانی بلکہ انسان کا

> کلام جانتا ہوں۔ اس صورت میں الہام یا وحی سے مراد وہ تاثرات ہونگے جو ایک انسان یا رسول کے دل و دماغ میں پیدا ہوتے ہیں۔ اور جنھیں وہ مروّجہ زبان میں نہایت کامیابی سے ادا کر دیتا ہے“

آپ نے دیکھا پہلے اُس نے وحی و الہام کے معنی انسانی تاثرات کے بتائے تھے اور اب ترقی کرکے قرآن پاک کی اُن آیتوں سے جن میں وحی کا لفظ ایک خاص معنی میں استعمال ہوا ہے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ وحی کے معنی برمحل سوجھ بوجھ کے ہیں حالانکہ ان دونوں کے درمیان آسمان و زمین کا فرق ہے۔ تاثرات غور و فکر کے بغیر واقعات کے انفعالی نتائج کا نام ہے جو شاعر کے کلام کی چیز ہے اور جس کی قرآن نے اپنے سے نفی کی ہے۔ مَا هو بقول شاعر یعنی قرآن شاعر کا کلام نہیں۔ یا یوں کہیئے کہ تاثرات شاعرانہ کا نتیجہ نہیں اور ”سمجھ بوجھ“ انسانی غور و فکر کا ارادی نتیجہ ہے۔ اگر قرآن پاک سمجھ بوجھ اور انسانی غور و فکر کا ارادی نتیجہ ہوتا تو اسکی نسبت خدا کی طرف کرکے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم کیا اوہی افترا علی اللہ کے مرتکب نہیں ہوئے جس کا الزام کفار آپ پر لگاتے تھے۔

بہرحال اپنے مضمون کی دوسری منزل میں مدعی نے یہانتک تو ترقی کی کہ کسی نہ کسی معنیٰ میں وہ قرآن پاک کو وحی و الہام ماننے پر اُتر آیا۔ اور جس کے قلم سے ایک مہینہ پہلے یہ نکلا تھا کہ

”کلام مجید کو نہ میں کلام خداوندی سمجھتا ہوں اور نہ الہام ربّانی“

اس کے قلم سے ایک ہی مہینہ کے بعد یہ نکلا:۔

"اس لیئے یہ کہنا نادرست نہیں کہ ان کی ہر بات وحی کا نتیجہ تھی اور ان کے منھ سے جو کچھ بھی نکلتا تھا وہ اسی اشارہ خداوندی کے ماتحت ہوتا تھا" (جولائی ص ۵۹)

اشارہ خداوندی کے ماتحت جو چیز ہے کیا وہ غلط ہو سکتی ہے۔

آگے چلیئے اگست کے پرچہ میں کسی صاحب نے پوچھا کہ جب قرآن پاک انسانی کلام ہے تو اس کے دعوی اعجاز کے پھر کیا معنی ہونگے۔ اس سلسلہ میں ارشاد ہوتا ہے:-

> "یہ درست ہے کہ قرآن میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ رسول اللہ نے قرآن نہیں بنایا (ام یقولون افتراہ) لیکن اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ رسول نے جو کچھ کہا ہے وہ ہوائی[1] باتیں نہیں۔ ما ینطق عن الھوٰی بلکہ وہ نتیجہ ہے اس وحی یا اس تائید غیبی کا جو ذہنی بلندی کی صورت میں رسول اللہ کی فطرت میں خدا کی طرف سے ودیعت کی گئی ہے" (صفحہ ۶۳)

لیجئے اب تو معاملہ یہاں تک آگیا کہ اس نے جس کے قلم سے یہ نکلا تھا کہ میں قرآن کو الہام خداوندی نہیں سمجھتا اس نے برمحل سوجھ بوجھ سے ترقی کرکے وحی یا تائید غیبی کی منزل تک رسائی حاصل کرلی۔ یہ غیب کی تائید اور غیب کی قوت کیا چیز ہے۔ کیا خدا ہی کی تعبیر نہیں۔ معاملہ آگے بڑھتا ہے۔ مولوی عبد الماجد صاحب کے جواب میں اسی مہینہ کے پرچہ میں

---

[1] معارف۔ عربی جاننے والے اس مدعی باطل کے فضل و کمال کا ماتم کریں۔

ص۲۷ پر اسکو یہ کہنے پر مجبور ہونا پڑا:-

"میں کہتا ہوں کہ خدا "نطق و کلام کی اس صفت" مبرا ہے جو تمام انسانوں میں پائی جاتی ہے اور قرآن مجید کو اس معنی میں خدا کا کلام کہنا خدا کی توہین ہے۔ اور یہ تصور وحدانیت کے سراسر منافی ہے"

کاش اس نے یہی کہا ہوتا۔ یہ کون نہیں کہتا کہ خدا نطق و کلام کی اس صفت سے مبرا ہے جو تمام انسانوں میں پائی جاتی ہے اور قرآن مجید کو کلام خدا کہنا ان معنوں میں نہیں لیکن سوال یہ ہے کہ کلام کے ساتھ "نطق" کا لفظ اس منزل میں پہونچکر کہاں سے شامل ہو گیا۔ نطق کا لفظ تو اب تک کہیں نہیں آیا ہے اور نہ اس کا کسی کو دعوٰی ہے۔

لیکن اسی کے ساتھ یہ رائے باطل بھی ہے:-

"میں کہتا ہوں کہ رسول کی عظمت اسی میں ہے کہ قرآن کو اشارۂ خداوندی کے ماتحت رسول کے ذہن و دماغ کا نتیجہ سمجھا جائے"
(ص۴۳)

"اشارۂ خداوندی" جب مسلم ہے اور یہ کوئی موثر چیز بھی ہے تو پھر رسول کے ذہن و دماغ کا کارنامہ کہاں رہا۔

مدعی اگر واقعی رسول کی عظمت کے لئے بے چین ہے تو رسول کی اس عظمت کے لئے وہ کیوں بے چین نہیں کہ اس کو اس دعوٰی میں کہ جو کچھ وہ پیش کرتا ہے وہ حرف حرف اللہ تعالیٰ کا فرمودہ ہے۔ صادق اور

راست باز یقین کرے اور اسکو اسکے اس دعوٰی میں مفتری و کاذب نہ ٹھہرائے۔

تاہم اس مقام پر اتنی ترقی اور ہوئی کہ گویا وہ شخص جس نے یہ اعلان کیا تھا کہ میں قرآن کو خدا کا کلام نہیں مانتا، اب یہ کہنے لگا کہ

> "میں نے جون میں "آتش نمرود" پر بحث کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا کہ قرآن مجید اس معنی میں کلام ربانی نہیں ہے۔ جو عام طور پر سمجھے جاتے ہیں" (ص۵)

جون کے الفاظ اور اب اگست میں اس بیان کے الفاظ کو ملاحظہ فرمائیے۔ کیا یہ ایک ہی شخص کے غیر متبادل عقیدہ کی تصریح ہے۔ بہرحال اس اگست کے عقیدہ سے معلوم ہوا کہ ہمارا مدعی اب کسی نہ کسی نوع میں قرآن مجید کو کلام ربانی ماننے کیلئے آمادہ ہے۔

کفر ٹوٹا خدا خدا کرکے

اب ستمبر کا نمبر آتا ہے اس میں کوئی طالب صفوی صاحب آتے ہیں (غنیمت ہے کہ قمر زمانی نہیں[لہ]) اس مضمون میں ایک عجیب و غریب حدیث کا حوالہ ہے جسکا صحاح میں تو پتہ نہیں۔ بہرحال جو کچھ بھی کہا ہے اس سے مدعی اپنا اتفاق ان الفاظ میں ظاہر کرتا ہے۔

> "وہ بعض متکلمین کی طرح قرآن کے مضمون و معانی کو اصل قرآن قرار دیتے ہیں اور الفاظ کو حادث سمجھکر رسول اللہ سے

[لہ] کہتے ہیں کہ پہلے نقاد آگرہ میں مدیر نگار اس شکل میں ظاہر ہوتے تھے۔

منسوب کرتے ہیں بالکل یہی خیال میرا ہے۔"   (صد ۵۹)

بہت مناسب! آگے وہ صاحبِ قلم جو قصص قرآنی کو یہود و نصاریٰ کی سنی سنائی باتوں سے ماخوذ بتا رہا تھا اب یہ کہتا ہے کہ :-

> "اب رہا قصص قرآنی کا مسئلہ سو میں نے یہ کبھی نہیں کہا کہ ان کا تعلق وحی و الہام سے نہیں ہے لیکن یہ ضرور کہتا ہوں کہ ان کو تاریخی اہمیت نہیں دینی چاہیئے۔ بلکہ انکی اس روایتی اہمیت کو پیش نظر رکھنا چاہیئے جس کا تعلق درس اعتبار و بصیرت سے ہے"   (اگست صد ۵۹)

کیا ان سطروں کا لکھنے والا اپنے قول میں صادق ہے۔ کیا اس نے یہ نہیں لکھا تھا :-

> "کلام مجید کو نہ میں کلام خداوندی سمجھتا ہوں نہ الہام ربانی بلکہ انسان کا کلام جانتا ہوں ...... کلام مجید میں اسرائیلیات کا حصہ کوئی تاریخی حیثیت نہیں رکھتا اور نہ اسے کلام مجید میں درج ہونے سے صحیح کہا جا سکتا ہے۔ عہد نبوی میں اس قسم کی روایتیں توراۃ انجیل کے حوالہ سے یہود و نصاریٰ کی طرف سے عام طور پر بیان کی جاتی تھیں اور چونکہ توریت و انجیل کے الہامی ہونے کا غلط خیال پہلے ہی سے قائم تھا اسلیئے رسول اللہ (صلعم) نے بھی انکو محض اعتبار و بصیرت کے لیئے بیان کر دیا"
>
> (نگار۔ ماہ جون)

جب مدعی کے نزدیک پہلے قرآن کا تعلق وحی و الہام سے نہیں تھا تو

اُس کے قصص کے حصّہ کا بھی ظاہر ہے کہ وحی والہام سے کیونکر تعلق ہوسکتا ہے۔ کیا فاضل مدعی کا خیال اس تضاد بیان کی طرف منتقل ہوا؟ آخر اس "عدم حافظہ" کی وجہ کیا؟

پھر اس نمبر میں اس سے چند صفحے آگے بڑھ کر ص۵۱ میں پروفیسر نواب علی صاحب کے جواب میں ارشاد ہوتا ہے:-

"میرے ان کے درمیان کلام اللہ کے عقیدہ میں بظاہر بہت کم اختلاف[1] ہے۔ میں بھی قرآن مجید کو وحی والہام کا نتیجہ سمجھتا ہوں۔ لیکن صرف مطالب قرآن کی حد تک۔ اور ہر چند الفاظ قرآنی انسانی کلام ہیں لیکن چونکہ وہ نتیجہ ہیں ایک مخصوص "وجدان" کا اسلئے لفظی حیثیت سے بھی میں ان کا مرتبہ بہت بلند سمجھتا ہوں"

اس میں شک نہیں کہ قرآن میں جو قصص بیان کئے گئے ہیں وہ اسرائیلیات سے مختلف ہیں لیکن بحیثیت مجموعی ان کو صحیح یا رد کرنے میں ہمیں عقل کو نظر انداز کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ اور یہی پہلو ہمیشہ میری نگاہ میں کھٹکتا ہے"

وہ شخص جو چند ماہ پہلے کلام مجید کو نہ کلام الٰہی مانتا تھا۔ نہ الہام خداوندی وہ یہاں تک تو خدا خدا کر کے پہنچا کہ معانی و مطالب کی حد تک وہ اُس کو وحی والہام کا نتیجہ سمجھنے لگا ہر چند کہ الفاظ میں اسکو شک ہے۔

---

[1] معارف:- کیا ہمارے مخدوم پروفیسر نواب علی صاحب کو بھی اس سے اتفاق ہے

وکلٌّ یدعی وصلاً بلیلی   ولیلی لا تقر لهم بذاك

تاہم وہی قصص قرآنی جن کی نسبت اسی پرچہ میں ابھی چند صفحے پہلے یہ کہہ چکا ہے :۔

"اب رہا قصص قرآنی کا مسئلہ سو میں نے یہ کبھی نہیں کہا کہ انکا تعلق وحی و الہام سے نہیں ص ۵۹

اب چند صفحوں کے بعد اسکی صحت انکو پھر کھٹکنے لگی۔

اچھا تو کیا اب مدعی یہ کہتا ہے کہ قصص قرآنی کا تعلق وحی و الہام سے ہے؟ اگر یہ کہتا ہے تو پھر وحی والہام کی باتوں میں اسکو شک کیوں ہے؟ اور پھر ان قصص کو یہود و نصاریٰ کے مسموعات سے ماخوذ دو ماہ پہلے کیوں بتا رہا تھا۔

بہر حال اب جب مدعی نے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ وہ قرآن پاک کو معانی و مطالب کی حد تک وحی والہام سمجھتا ہے تو کیا ان معانی و مطالب میں قصص قرآنی بھی داخل ہیں یا نہیں؟ اگر داخل ہیں تو پھر وہ بھی وحی و الہام کی اطلاع کا نتیجہ ہیں

اب رہا یہ سوال کہ آیا قرآن کا دعویٰ منزل من اللہ ہونے کا مع اپنے الفاظ اور زبان کے ہے یا صرف معانی و مطالب کی حد تک؟ اس بارہ میں قرآن پاک کے یہ الفاظ غور کے قابل ہیں۔

ارشاد خداوندی ہے :۔

انا انزلناہ قرآنا عربیا۔ (یوسف)	ہم نے اس کو عربی قرآن بنا کر اتارا
وکذلک انزلناہ حکما عربیا۔ (رعد)	اور اسی طرح ہم نے اسکو عربی زبان میں حکم بنا کر اتارا۔

وکذلک انزلناه قرانًا	اور اسی طرح ہم نے اُس کو عربی
عربیا (طٰہٰ)	قرآن بنا کر اتارا۔
انّا جعلناه قرانا عربیًا	بیشک ہم نے اسکو عربی قرآن بنایا
لعلکم تعقلون (زخرف)	تاکہ تم سمجھو۔
وکذلک اوحینا الیک	اور اسی طرح ہم نے عربی زبان میں
قرانًا عربیا (شوریٰ)	قرآن تم پر اتارا۔

ان تمام آیتوں میں غور کیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کو عربی زبان میں نازل فرمانے کی نسبت اپنی طرف کی ہے اور کسی زبان میں کوئی چیز ہو نہیں سکتی جب تک اُس کلام کے الفاظ خود اُس زبان کے نہ ہوں اُسکے معنی یہ ہوئے کہ اُس کے تمام الفاظ بھی اللہ کی طرف سے وحی اور نازل ہیں۔ اس باب میں اب ایک آخری آیت پیش ہے جو اس مسئلہ کے لیئے قطعی فیصلہ کُن ہے۔

ارشادِ الٰہی ہے:۔

وانه لتنزیل رب العلمین ۝	اور یہ قرآن پروردگار عالم کی
نزل به الروح الامین ۝ علی	طرف سے اتارا گیا ہے اُس کو لیکر
قلبک لتکون من المنذرین	روح الامین تیرے دل کے اوپر اُترا ہے
بلسان عربی مبین۔	تاکہ تو ہو ڈر سنانے والوں میں
(شعراء)	سے بیان کرنے والی عربی زبان میں

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کو خدا نے اتارا ہے۔ روح الامین اُس کو

لے کر قلب نبوی پر اُترا اور فصیح و بلیغ عربی زبان میں۔

یہ تو قرآن پاک کی آیتوں سے استشہاد تھا لیکن چونکہ ہمارے مدعی کو "عقل" بہت پسند ہے اور اوسی سے مذہبیات میں بہت ڈرتا ہے اس لیئے اُس سے یہ سوال دلچسپ ہوگا کہ کیا اس نے یہ غور کیا ہے کہ مرتبہ علمیہ یا کلام فی النفس کے علاوہ جسکو کلام نفسی کہتے ہیں معانی و مطالب جب ذہن انسانی میں خطور کرینگے تو کیا وہ الفاظ کے لباس کے بغیر عریاں خیال میں بھی آسکتے ہیں۔ کیا یہ صحیح نہیں کہ جس طرح مادیات شکل و صورت کے بغیر ظہور پذیر نہیں ہوسکتے اوسی طرح معنویات الفاظ کے پردہ کے بغیر خطور نہیں کرسکتے؟

یاد ہوگا کہ مدعی نے یہ سارا جھگڑا اس لیئے مول لیا تھا کہ کسی صالح حسین مرادآبادی[1] نے جو غالبًا فرضی نام ہے حضرت ابراہیم کے آگ میں جلائے جانے کے قصہ کی نسبت یہ سوال کیا تھا کہ جب یہ قصہ قرآن پاک میں ہے تو ہم کو اس کی واقعیت پر یقین لانا چاہیئے۔ اسکے جواب میں مدعی نے یہ کہا کہ قرآن پاک نہ کلام الٰہی ہے نہ الہام ربانی۔ اور نہ اُس قصہ کے درج قرآن ہونے سے اسکی صداقت لازم آتی ہے کیونکہ رسول اللہؐ نے توراۃ و انجیل کے قصوں کو سنکر اور ان کو الہامی جان کر درج قرآن کردیا ہے۔

---

[1] اگر حقیقت میں مرادآباد میں کوئی صاحب اس نام کے ہیں جنھوں نے مدیر نگار سے یہ سوال کیا تھا تو انکا فرض ہے کہ وہ اپنے نام و نشان کو ظاہر کریں۔

اب جبکہ مدعی معانی و مطالب کی حد تک قرآن پاک کو وحی و الہام مان چکا ہے تو یہ قصہ بھی جن لفظوں میں قرآن پاک میں ہے وہ مطلب معنی ہی کی حد تک سہی الہامی ٹھہرا۔ اور جب الہامی ہوا تو پھر اس کی تصدیق سے اب کیونکر چارہ ہے؟ کیونکہ ظاہر ہے کہ واقعیت و عدم واقعیت کا تعلق مطالب و معانی سے ہے نہ کہ الفاظ و عبارات سے تو جب قرآن پاک مطالب معانی کی حد تک وحی و الہام اور قوت غیبی کا نتیجہ ہوا تو اب اس منزل میں اس مہینہ پہونچکر قرآن پاک کا ہر واقعہ مطلب معنی کی حد تک یقینی، قطعی، ریب و شک سے بالاتر اور اس کا ذریعہ علم وحی الٰہی، تنزیل ربانی، فرمودۂ خداوندی، انسانی سمجھ بوجھ سے بری اور مسموعات انسانی سے پاک و منزہ قرار پاگیا یا نہیں؟ اور اگر نہیں تو مدعی کتنی ہی تاویلوں کے پردے ڈالے وہ اب بھی ایمان بالقرآن سے محروم ہے۔

مدعی نے ستمبر میں لکھا ہے کہ چند علماً انکی تائید میں ہیں جو الفاظ قرآنی کو محمد رسول اللہ صلعم کی تالیف بتلاتے ہیں۔ کیا مہربانی کرکے ان علماء کی تصنیفات کے حوالوں سے مطلع کیا جائے گا۔ وہ بھی صالح حسین مرادآبادی کی طرح کی ہستیاں تو نہیں ہیں بہرحال اسہماری درخواست ہے کہ مدعی جس منزل تک اس مہینہ میں پہنچ چکا ہے اب آئندہ اس میں آگے کو اپنی ترقی وہ جاری رکھے یا نہیں مگر خدا کے لیے وہ اب پیچھے نہ ہٹے اور وہیں نہ پہونچ جائے جہاں وہ جون سنہ ۱۹۴۲ء میں تھا۔

وحی کے اقسام

(۳)

اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ یہ مدعی دلائل کی گرفت سے گھبرا کے جس منزل پر آکر رکا ہے کیا یہاں بھی اسکے لئے پاؤں ٹیکنے کی جگہ ہے؟ اوپر بتایا گیا ہے کہ مدعی کی غلطی کا منشأ جیسا کہ وہ ظاہر کرتا ہے، وہ آیتیں ہیں جن میں جانوروں اور عام انسانوں بلکہ شیطانوں تک وحی کی نسبت کی گئی ہے۔ اب ہم ان میں سے ایک ایک قسم کی آیت کو لیکر اس پر بحث کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ حقیقت کیا ہے۔

وحی ربانی کی حقیقت سب سے پہلے معلوم ہونا چاہیئے کہ وحی ربانی کے یعنی اس وحی کے جو خدا کی طرف سے ہوتی ہے معنی کیا ہیں؟۔ سو معلوم ہونا چاہیئے کہ وحی ربانی اس طریقۂ غیبی یا ذریعۂ غیبی کا نام ہے جس کے واسطہ سے انسان کے غور و فکر، کسب نظر اور تجربہ و استدلال کے بغیر خاص اللہ تعالیٰ کی طرف سے محض اسکے فضل و عطا سے کوئی علم آتا ہے۔ اور آیات قرآنی اس پر گواہ ہیں۔ ہم یہاں پر انہی آیتوں کو پیش کرتے ہیں جن میں قصص

قرآنی کی نسبت سے وحی کا ذکر ہے

حضرت مریمؑ کے قصّہ کے بعد ہے :-

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ (آل عمران ۵)	یہ غیب کی خبروں میں سے جس کو ہم تیری طرف وحی کرتے ہیں۔

حضرت نوحؑ کے قصہ کے بعد ہے :-

تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا (ہود ۴)	یہ باتیں غیب کی خبروں میں سے ہیں ہم ان کو تیری طرف وحی کرتے ہیں نہ تجھ کو اور نہ تیری قوم کو اس سے پہلے ان کا علم تھا۔

حضرت یوسفؑ کے قصّہ کے بعد ہے :-

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ (یوسف ۱۱)	یہ غیب کی خبروں میں سے ہے۔ ہم تیری طرف اسکو وحی کرتے ہیں۔

وحی کی حقیقت کی جو تشریح مدعی نے اب تک کی ہے وہ یہ ہے "برمحل سوجھ بوجھ، نفسانی تاثر اور وجدان" ہر شخص سے جس میں عقل کا کوئی ذرہ ہے یہ سوال ہے کہ دنیا کے تاریخی واقعات کا علم کسی شخص میں برمحل سوجھ بوجھ، نفسانی تاثر اور وجدان سے پیدا ہو سکتا ہے؟ یہ تو جب ہی معلوم ہو سکتے ہیں کہ یا تو وہ کسی سے سنے جائیں یا کسی کتاب میں پڑھے جائیں۔ قرآن پاک نے ان دونوں طریقوں کی نفی کر دی ہے

اور یہاں پر ظاہر بھی کر دیا ہے کہ ان واقعات کا علم انسانی ذرائع سے نہیں بلکہ غیب سے بذریعۂ وحی ہوا ہے۔

انسانی ذریعۂ علم کے ان دونوں طریقوں کی نفی قرآن پاک کی حسب ذیل آیت میں ہے:۔

وَمَا کنت تتلوا من قبلہ
من کتب ولا تخطہ بیمینک
اذا لّارتاب المبطلونَ
(عنکبوت - ۵)

اس دعوائے نبوت یا نزول قرآن)
سے پہلے نہ تو تو کوئی کتاب ہی پڑھتا تھا
اور نہ اپنے ہاتھ سے لکھتا تھا ایسا
ہوتا تو ان باطل پرستوں کے لیئے
شبہہ کی کوئی گنجائش بھی نکلتی۔

اب رہا یہود و نصارٰی سے سن کر ان واقعات کا علم! تو دوست و دشمن سب کو معلوم ہے کہ مکہ کی زندگی میں یہود و نصارٰی سے آپ کی صحبت کسی طرح ثابت نہیں اور نہ مکہ معظمہ میں ان کی آبادی تھی۔ لے دے کر ایک بحیرا راہب کا افسانہ عیسائیوں کے پاس ہے جس سے جیسا کہ کہا جاتا ہے سفر شام میں اپنے چچا کے ساتھ آپ کی ملاقات چند منٹ کے لئے ہوئی تھی۔ اور جس نے آپ کو دیکھ کر آپ کے چچا کو بھتیجے کی پیغمبری کی خوشخبری سنائی تھی۔ اگر دس بارہ برس کا یہ بچہ ان چند لمحوں کی ملاقات میں ایک شخص سے وہ سب کچھ سن سکا اور ان کو سمجھ سکا جو قرآن پاک کی دو دفتیوں کے درمیان ہے تو یہ ما فوق بشری طاقت بجائے خود آپ کی نبوت کی دلیل ہے۔

بہرحال اب عیسائی مناظرین سے معلومات حاصل کر کے "مسلمان نیاز" بتائیں کہ آنحضرت صلعم نے کون یہودیوں اور عیسائیوں سے کہاں اور کب قصص قرآنی کے یہ معلومات حاصل کیے (نعوذ باللہ تعالیٰ)

وحی کے معنی کی تعیین کے بعد جو کہ غیبی تعلیم کا نام ہے آئیے وحی کے بعض اقسام پر غور کریں ۔

مدعی نے قرآن پاک کی ان اکثر آیتوں کو یکجا کر کے جن میں وحی کا لفظ ہے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ وحی کے معنی ہیں "برمحل سوجھ بوجھ" اور یہ نتیجہ ہے اس ذہنی قوت کا جو فطرۃ انسان میں ودیعت رکھی گئی ہے (جولائی ص۵۹)

اب آئیے دیکھیں کہ وحی کے یہ معنی کہاں کہاں صادق آتے ہیں ۔ اس سلسلہ میں مدعی نے یہ خوب لکھا ہے :۔

> "سب سے پہلی غلطی جو وحی کا مفہوم متعین کرنے میں روا رکھی گئی ہے یہ ہے کہ وحی کو انبیا و رسل کے لیے مخصوص سمجھ لیا گیا ہے ۔ حالانکہ یہ حقیقت نہیں ...... غیر انبیا بلکہ حیوانات و جمادات پر بھی وحی کا نازل ہونا قرآن سے ثابت ہے ۔ (جولائی ص۶۰)

اے کاش یہ معلوم ہوتا کہ یہ غلطی کس نے روا رکھی ہے کیا علمائے اسلام میں سے کسی نے یہ کہا ہے کہ وحی بمعنی عام صرف انبیا علیہم السلام کیلئے مخصوص ہے ۔ جس اختصاص کا ان کو دعویٰ ہے وہ اس قسم کی وحی کے متعلق ہے جو صرف انبیا علیہم السلام کے لیے مخصوص ہے ۔

قرآن پاک کی آیتوں سے یہ صاف ظاہر ہے کہ از روئے قرآن وحی کی

تین قسمیں ہیں۔ وحی نوعی یا فطری۔ وحی شخصی یا جزئی۔ اور وحی نبوی۔ ان تینوں کے الگ صفات اور لوازم ہیں۔ سب سے پہلے وحی نوعی یا فطری کو لیجئے جس سے مدعی کو سب سے زیادہ مغالطہ پیش آیا ہے یا مغالطہ دینے کی کوشش کی ہے

وحی نوعی یا فطری یہ وہ وحی ہے جو آسمان و زمین اور حیوانات اور جمادات بلکہ ہر نوع مخلوق کو ملی ہے۔ اور جس کو اہل علم اصطلاح میں جبلت یا بعض لوگ تسامح کرکے فطرت کے احکام نوعی کہہ دیتے ہیں۔ اس وحی کی پہچان یہ ہے کہ وہ اس نوع کے تمام افراد کو یکساں ملتی ہے۔ مثلاً جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے کہ پرندوں کے بچوں کا اڑنا۔ آبی جانوروں کا تیرنا۔ جانوروں کا چرنا اور چگنا۔ انسان کے بچوں کا دودھ پینا۔ بلی کے بچوں کا شکار کرنا۔ شہد کی مکھیوں کا پھولوں اور پھلوں کا رس چوسنا۔ اور اونچے اونچے درختوں اور پہاڑوں میں چھتے بنانا اور شہد پیدا کرنا۔ یہ سب ان کے احکام نوعی کا اقتضا ہے جو اول پیدائش میں خدا نے ان کی طبیعتوں میں وحی کر دیا جس کے ماننے پہ وہ مجبور ہیں اور جو عجائب قدرت میں ہیں اور جن کو دیکھ کر عادی ہو جانے کی بنا پر آپ ان کو احکام فطرت کہتے ہیں۔ اور شوق سے کہئے مگر یہ سمجھئے کہ احکام فطرت خود نہیں پیدا ہوئے ہیں بلکہ خالق فطرت کے وہ وحی و احکام ہیں جو ان کی نوع کی پیدائش کے پہلے ہی دن سے انکو دے دیئے گئے ہیں۔

اس معنی کو پیش نظر رکھکر اس آیت کو پڑھیئے جو ہمارے مدعی کے لیئے غلطی کا سرچشمہ بن گئی ہے۔

واوحیٰ ربّك الی النحل ان
اتخذی من الجبال بیوتًا
ومن الشجر وممّا یعرشون
ثم کلی من کل الثمرات
فاسلکی سبل ربك ذللاً
یخرج من بطونها شراب
مختلف الوانه فیه شفاء
للناس انّ فی ذلك لاٰیة
لقوم یتفکرون
(نحل)

اور تیرے ربّ نے شہدکی مکھی کو وحی کی کہ تو پہاڑوں، درختوں اور چھتوں میں اپنے لیئے گھر بنا۔ پھر ہر قسم کے میووں سے کھا۔ سو اپنے پروردگار کے (مقررہ) راستوں میں تابعدار ہوکر چل۔ اسکے پیٹ سے پینے کی چیز مختلف رنگوں کی جس میں انسانوں کے لیئے شفا ہے نکلتی ہے۔ اس واقعہ میں سوچنے والوں کے لیئے (اللہ کی) نشانی ہے۔

آپ نے دیکھا کہ اللہ تعالےٰ نے اپنے اس فطری حکم کو وحی کے لفظ سے ادا فرمایا ہے جسکی تابعداری شہد کی مکھی کے ہر فرد پر واجب ہے۔ یہ شہد کی مکھی پر حکم نوعی ہے۔ جس کو خدا نے آغاز خلقت ہی میں اس پر واجب ٹھہرا دیا ہے۔ جس سے نافرمانی شہد کی مکھیوں کے بس کی بات نہیں لیکن یہ علم شہد کی مکھی کو "برمحل" "سوجھ بوجھ" "نفسانی تاثرات" یا غور و فکر اور تجربہ و استدلال سے حاصل نہیں ہوا ہے۔

انسانوں میں پیدائش کے آغاز ہی میں نیکی و بدی، خیر و شر۔

فجور اور تقویٰ دونوں کی صلاحیتیں خالق فطرت کی طرف سے ودیعت رکھ دی گئی ہیں اور یہ وہ حکم ہے جو اول روز انکو ہو چکا اسلئے خدا نے اسکو اپنا الہام فرمایا ہے۔

فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا (شمس)	پھر ہر ایک کے جی میں ڈال دیا اسکی بدکاری اور اسکی پرہیزگاری۔

دیکھئے کہ انسان کے اس حصول استعداد میں "برمحل سوجھ بوجھ" اور غور و فکر اور تجربہ و استدلال کو کوئی دخل نہیں۔

آگے چلئے اللہ تعالیٰ کی یہ وحی بے جانوں کو بھی پہونچی ہے۔ زمین کو وحی ہے کہ اسکی پیٹھ پر قیامت تک جو کچھ ہوگا وہ اپنی زبان قال یا زبان حال سے اس کا سارا افسانہ ایک دن دہرا دے۔

يومئذ تحدث اخبارها بان ربك اوحى لها (زلزال)	اس دن زمین اپنا سب احوال بتائے گی کیونکہ اس کے پروردگار نے اس کو وحی کر دیا۔

بیوقوف بھی جانتا ہے کہ یہ شہادت زمین کی "برمحل سوجھ بوجھ" "نفسانی تاثرات" غور و فکر اور نظر و استدلال کا نتیجہ نہ ہوگی۔

آسمان کو بھی وحی ہوئی کہ وہ اپنے کاروبار کو اس طرح انجام دیتا رہے جس طرح خدا نے اسکو حکم دیا ہے۔ آفتاب اوسی طرح نکلتا اور ڈوبتا رہے۔ چاند اوسی طرح چمکتا اور چھپتا رہے۔ اور ستارے اُسی طرح چلتے رہیں جس طرح خدا نے آغاز خلقت میں انکو حکم دے دیا ہے۔ فرمایا

واوحیٰ فی کل سماءٍ امرھا (فصّلت - ۲)	اور خدا نے ہر آسمان میں اُس کے کام کو وحی کر دیا۔

اب اوسی حکم ازلی کے مطابق ہر آسمان اپنے کام کو انجام دے رہا ہے اس میں آسمان کے "برمحل سوجھ بوجھ" "نفسانی تاثرات" غور و فکر اور تجربہ و استدلال کا کوئی محل نہیں۔

وحی شخصی یا جزئی

وحی کی دوسری قسم وہ ہے جو خواص امت کو اور وہ بھی از روئے قرآن انبیا علیہم السلام ہی کے سلسلہ میں ملی ہے اور اس کا دوسرا اصطلاحی نام القاء، الہام (اصطلاحی معنوں میں) اور محدثیت اور مکلّمیت ہے جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ماں کو وحی ہوئی کہ بچہ کو صندوق میں رکھکر دریا میں ڈال دو اور تم بہ اطمینان رہو دشمن اسکو ضرر نہیں پہنچا سکیں گے۔ اور ایک دن میں اسکو پیغمبر بناؤنگا فرمایا

واوحینا الیٰ امّ موسیٰ ان ارضعیہ فاذا خفت علیہ فالقیہ فی الیم ولا تخافی و لا تحزنی انا رادوہ الیک وجاعلوہ من المرسلین (قصص - ۱)	اور ہم نے موسیٰ کی ماں کی طرف وحی کی کہ اس بچہ کو دودھ پلائے جا پھر جب تجھ کو اس بچہ پر ڈر لگے تو اس کو تو دریا میں ڈال دے اور خوف نہ کھا غم نہ کر ہم اسکو پھر تیری طرف لوٹا کر لے آئیں گے اور ہم اس کو پیغمبر بنانے والے ہیں۔

ہم تھوڑی دیر کے لئے مان لیتے ہیں کہ یہاں حضرت موسیٰ ؑ کی ماں کی وحی انکی "برمحل سوجھ بوجھ" تھی لیکن کیا برمحل سوجھ بوجھ سے یہ بھی اپنے بچہ کے متعلق ان کو معلوم ہوسکتا تھا کہ یہ لڑکا دریا میں ڈوب نہیں جائے گا اور پھر میرے پاس آجائے گا اور ایک دن پیغمبر ہوگا۔ یہ غیب کی خبر تو غیب کی اطلاع ہی سے معلوم ہوسکتی تھی۔ اس لیئے یہ "برمحل سوجھ بوجھ" یا "نفسانی تاثرات" یہاں بھی وحی کا ترجمان نہیں۔ یہاں مقصود وحی کی وہ قسم ہے جسکو اصطلاح میں الہام کہتے ہیں۔ خواہ وہ رویائے حق کے ذریعہ ہو یا بیداری میں، القا فی القلب کی صورت میں ہو یا اور کوئی شکل ہو۔

اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیروی کا الہام حواریوں کو ہوا۔ ارشاد ہے۔

واذ اوحیت الی الحواریین ان امنوا بی وبرسولی قالوا امنا واشهد باننا مسلمون (مائدہ۔ ۱۵)	اور جب میں نے حواریوں کی طرف وحی بھیجی کہ مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لے آؤ۔ انھوں نے کہا ہم ایمان لائے اور تو گواہ رہ کہ ہم مسلم اور فرمانبردار ہیں۔

یہاں بھی اُسی شخصی وحی کا ذکر ہے جو الہام و القا یا رویائے حق کی شکل میں حواریوں کو ملی۔ حدیثوں میں بھی آتا ہے کہ رویائے حقہ نبوت کے بہت سے اجزا میں سے ایک جزء ہے۔ جو ایک مردِ مومن کو عطا ہوتا ہے

یہ بھی آتا ہے کہ منصبِ نبوت کے بغیر کچھ خواصِ امت ہیں۔ جو بعض معاملات کے متعلق غیب سے خبر پاتے ہیں یکلمون من غیر ان یکونوا انبیاء۔

غرض رویائے حقہ بھی اسی قسم میں داخل ہے۔ شرح صدر بھی اسکا ایک کارنامہ ہے اور اسکی اعلیٰ قسم یہ ہے کہ ملائکہ کا تمثل اسکے سامنے ہوتا ہے۔ اور منادیِ غیب کی آواز اسکو سنائی دیتی ہے جیسا کہ حضرت مریمؑ اور حضرت ابراہیمؑ کی بیوی اور بعض دوسرے انبیا علیہم السلام کی بیویوں کے تذکروں میں قرآن میں ہے۔ مگر قرآن پاک میں اس وحی کا ذکر صرف انبیا کے تعلق سے ہے۔ یعنی انکی خاطر یہ اطلاع دوسروں کو دی گئی اسلیئے اس کا تعلق کسی خاص جزئی واقعہ سے ہے نہ کہ عموم تبلیغ امت سے اور اسی لیئے ہم نے اسکا نام وحی شخصی اور وحی جزئی رکھا ہے۔

مگر آپ پھر بھی یہ دیکھ لیں کہ "بے محل سوجھ بوجھ" اور "نفسانی تاثرات" کا یہاں بھی کوسوں پتہ نہیں ہے۔

وحی نبوی

اب آیئے اس وحی نبوی پر غور کریں جو کتاب الٰہی کے نزول کا ذریعہ ہے کہ اس کی نسبت قرآن کا فیصلہ کیا ہے۔ ہر چند کہ یہ بحث پہلے نمبر میں گذر چکی ہے مگر اقتضائے مقام کی وجہ سے اسکا اعادہ موزوں ہے۔ قرآن پاک نے وحی نبوی اور کلام الٰہی کے اقسام کا ذکر اس آیت میں کیا ہے۔

وَمَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّکَلِّمَہُ اللہ اِلَّا وَحْیًا اَوْ مِنْ وَّرَاءِ حِجَابٍ اَوْ یُرْسِلَ رَسُوْلًا فیوحی باذنہ مایشاء (شوریٰ)	اور کسی بشر کی تاب نہیں کہ اللہ اس سے دوبدو کلام کرے لیکن یہ کہ وہ الہام کردے یا پردہ کے پیچھے سے بات کرے یا کوئی قاصد بھیجے۔ جو اللہ کے حکم سے جو چاہتا ہے اسکا پیام اسکو پہنچادے۔

اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ کلام اللہ پاک نے ان میں سے اپنے نزول اور وحی کی صورت کیا بتائی ہے چنانچہ قرآن پاک کا دعویٰ ہے۔

قُلْ مَنْ کَانَ عدوا لجبریلَ فانہ نزّلہ علیٰ قلبک باذن اللہ (بقرہ)	کہدے کہ جو جبریل کا دشمن ہے (تو وہ ہو اس سے قرآن کی صداقت پر حرف نہیں آتا) کیونکہ اس نے (اے محمد) تیرے قلب پر خدا کے حکم سے اس قرآن کو اتارا ہے
و انہ لتنزیل رب العالمین نزل بہ الروح الامین علیٰ قلبک (شعراء)	یہ قرآن سارے جہان کے پروردگار کی طرف سے اترا ہے اسکو روح الامین فرشتہ لیکر تیرے قلب پر اترا۔
قل نزلہ روح القدس من ربک بالحق (نحل)	(اے رسول ان کے جواب میں) کہہ روح القدس نے تیرے پروردگار کی طرف سے سچائی کے ساتھ اسکو اتارا ہے۔

وما ينطق عن الهوى ان هو الا وحى يوحى ہ علمه شديد القوى (نجم)	یہ رسول اپنی خواہش سے یہ نہیں بولتا بلکہ یہ تو وحی ہے۔ جو اسکو کی جاتی ہے۔ اسکو بڑی قوتوں والے نے سکھایا ہے۔
انه لقول رسول كريم وما هو بقول شاعر قليلا ما تؤمنون ولا بقول كاهن قليلا ما تذكرون ہ تنزيل من رب العلمين ولو تقول علينا بعض الاقاويل لاخذنا منه باليمين ثم لقطعنا منه الوتين فما منكم من احد عنه حاجزين (حاقه)	بے شک یہ قرآن ایک بزرگ پیغام رساں کا بولا ہوا ہے۔ وہ کبھی شاعر کا بولا نہیں۔ تم کم ایمان رکھتے ہو اور نہ وہ کسی کاہن کا بولا ہے۔ تم کم نصیحت پکڑتے ہو پروردگار عالم کا اتارا ہے۔ اور اگر یہ رسول ہم پر (یعنی خدا پر) کچھ باتیں اپنی طرف سے بنا کر گھڑے تو ہم اس کا داہنا ہاتھ پکڑ لیں۔ پھر اسکی رگ گردن کو کاٹ دیں پھر تم میں سے کوئی اسکو بچا نہ سکے۔

ان آیتوں میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسی قسم کے باطل خیال لوگونکی تردید کی گئی ہے جو پیغمبر کے سامنے بھی گذرے ہیں جو قرآن پاک کے "نفسانی تاثرات" اور "سمجھ بوجھ ہونیکے" قائل تھے۔ اس لیے فرمایا گیا کہ یہ شاعر کا کلام نہیں کیونکہ وہ سراسر نفسانی تاثرات کا نتیجہ ہوتا ہے اور نہ کسی سیانے

کاہن کا کلام ہے جو خوب سمجھ بوجھ کر اپنے کلام کو جوڑ توڑ کر سناتا ہے بلکہ ایک بزرگ پیغام رساں کی زبان سے ادا ہوا۔ اور جو پروردگار عالم کا اتارا ہوا ہے۔ ساتھ ہی یہ دھمکی ہے کہ اگر یہ رسول اپنے نفسانی تاثر اور ذاتی سمجھ بوجھ سے کچھ کلام گھڑے تو ہم اسکا ہاتھ پکڑ لیں۔ اور اسکو وہ سزا دیں کہ کوئی اسکو بچا نہ سکے۔

اللہ اکبر! جس کلام کی یہ شان ہے وہ ایک مدعی اسلام کی نظر میں محمد (صلعم) کا نفسانی تاثر اور انسانی سمجھ بوجھ قرار پائے۔ العیاذ باللہ

ایک دوسری آیت میں ارشاد ہے۔

انہ لقول رسولٍ کریم
ذی قوۃ عند ذی العرش
مکین مطاع ثم امین ہ وما
صاحبکم بمجنون ولقد
راٰہ بالافق المبین وما
ہو علی الغیب بضنین وما
ہو بقول شیطن رجیم
(تکویر)

بے شبہ یہ ایک بزرگ پیغام رساں کا کلام ہے جو قوت والا ہے۔ عرش والے خدا کے یہاں ذی مرتبہ ہے اسکا کہا مانا جاتا ہے۔ وہاں وہ امانتدار ہے۔ تمھارا یہ رفیق (یعنی رسول اللہؐ) دیوانہ نہیں۔ اس نے اس پیغام رساں کو آسمان کے کھلے کنارہ پر دیکھا۔ وہ غیب کی باتوں کو (جو اس کو بتائی جاتی ہیں) چھپاتا نہیں اور نہ یہ شیطان راندے گئے کا کلام ہے۔

اس سے زیادہ تصریح کیا چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ نے جبریل کے دل میں اسکو ڈالا اور جبریل نے محمد رسول اللہ صلعم کے قلب مبارک پر نازل کیا اور محمد رسول اللہ صلعم نے اپنی زبان فیض ترجمان سے اسکو بندوں تک پہنچایا نہ یہ وحی فطری و نوعی ہے۔ ورنہ شہد کی مکھیوں کی طرح نوع انسانی کے تمام افراد اس میں شریک ہوتے۔ نہ وحی شخصی ہے ورنہ تمام انسانوں کے لئے قابل تسلیم نہ ہوتی۔ بلکہ وحی نبوی ہے جو روح القدس کے ذریعہ نبی پر اُتری اور اسکے واسطہ سے سب کے لیئے واجب العمل ٹھہری۔

وحی شیطانی اب ایک چیز وحی شیطانی رہ گئی جسکا اس مدعی کے سوا کوئی اور قائل نہیں۔ قرآن پاک میں بطور طنز بے شبہہ ایک دو جگہ ہے:۔

وکذلک جعلنا لکل نبی
عدوا شیطین الانس
والجن یوحی بعضھم الی
بعض زخرف القول غرورًا
(انعام-۱۴)

اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے واسطے
کچھ دشمن بنائے انسانوں اور
جنوں کے شیطان۔ ان میں کے بعض
بعض کے اندر ملمع کی ہوئی بات فریب
دینے کیلیئے وحی کرتے ہیں۔

آگے چل کر پھر اسی سورہ میں ہے:۔

وان الشیطین لیوحون
الی اولیاءھم لیجادلوکم
وان اطعتموھم انکم

اور شیطان لوگ البتہ "وحی"
کرتے ہیں اپنے دوستوں کی طرف تاکہ
وہ تم سے جھگڑیں۔ اور اگر تم نے

لمشرکون (انعام-۱۲۱)	انکا کہا مان لیا۔ تو بیشک تم بھی مشرک ہو۔

جس کو کسی زبان کے ادب کا ذرا بھی ذوقِ سلیم ہے وہ سمجھ سکتا ہے کہ یہاں وحی کا لفظ وسوسۂ شیطانی کے لیئے بطور طنز کے آیا ہے۔ اس قسم کے محاورے ہر زبان میں ہیں۔ "ذات شریف" سے کون واقف نہیں۔ لفظ کتنا خوبصورت اور معنی کتنے کریہ ہیں۔ غرض اسکے یہ معنی نہیں کہ وحی کی نسبت قرآن نے شیطان کی طرف کی ہے۔ قرآن نے کئی جگہ یہ کہا ہے۔

فبشرھم بعذاب الیم (آل عمران - توبہ - انشقاق)	ان کافروں کو دردناک عذاب کی خوشخبری دے۔

عذاب کی خوشخبری کیا شیطان کی وحی سے زیادہ عجیب نہیں؟ قرآن میں کافر دوزخی کو خطاب ہے کہ اسکو عذاب کے وقت کہا جائیگا۔

ذق انک انت العزیز الکریم (دخان)	اس کا مزا چکھ۔ تو بڑا غالب اور عزت والا ہے۔

ایک دوزخی کو معزز و محترم و غالب کا خطاب ظاہر ہے کہ محض طعن و تقریع کے لئے ہے کیونکہ وہ دنیا میں اپنے کو ایسا ہی سمجھتا تھا۔

بہرحال اس سے معلوم ہوا کہ شیطان کے لئے وسوسہ کے بجائے وحی کا لفظ بولنا محض طعن و توبیخ و تقریع کیلئے ہے نہ کہ واقعہ!

قرآن انسان کی فطری قوت کا نتیجہ نہیں

اب ایک ایسی آیت پیش کی جاتی ہے جس سے یہ

ثابت ہوگا کہ قرآن پاک کسی ودیعت شدہ فطری انسانی قوت کا نتیجہ نہیں بلکہ غیب کی طرف سے وقتاً فوقتاً آئے ہوئے سچے خدائی پیغاموں کا نام ہے۔ ارشاد ہے:۔

وکذٰلک انزلنٰہ قراٰنا
عربیا وصرفنا فیہ من الوعید
لعلھم یتقون ہ او یحدث
لھم ذکرا ہ فتعلی اللہ الملک
الحق ولا تعجل بالقراٰن من
قبل ان یقضی الیک وحیہ
وقل رب زدنی علما

(طٰہٰ - ۶)

اور اسی طرح ہم نے اس کتاب کو
عربی قرآن کر کے اتارا۔ اور اس میں
طرح طرح کے ڈر کی باتیں بیان
کیں تاکہ وہ پرہیزگار رہیں یا انکے
لیئے یاد پیدا کرے۔ تو بلند رتبہ ہے
وہ بادشاہ برحق اور جلدی مت کر
قرآن میں اس سے پہلے کہ اسکی وحی
تیری طرف پوری کردی جایا کرے اور
کہہ اے میرے پروردگار، اور زیادہ دے
مجھ کو علم۔

لفظ "قرآنا عربیا" یہاں بھی اور دوسری آیتوں میں بھی حال ہے جس سے معلوم ہوا کہ قرآن کی عربیت خدائے تعالیٰ کی طرف منسوب ہے جسکے دوسرے معنی یہ ہیں کہ قرآن کے الفاظ بھی خدائے پاک کے ہیں۔

دوسری بات جو اس موقع کے مطابق ہے، یہ ہے کہ اس آیت میں رسولؐ کو یہ حکم ہے کہ نزول قرآن کے وقت جلدی نہ کیجئے۔ جب تک اسکی وحی پوری نہ کردی جایا کرے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کی وحی وہ

وحی فطری نہیں جو طبیعت انسانی میں ودیعت دائمی ہوتی ہے۔ بلکہ وہ وحی نبوی ہے جو وقتاً فوقتاً خدا کی طرف سے آتی رہی۔

کلامی مباحث

باقی مدعی نے جو کلامی مباحث چھیڑے ہیں اور جن خطرناک علمی خدشوں میں وہ گرفتار ہے انکا جواب اپنے اپنے اصول پر البیان امرتسر نے مختصرا اور الفرقان بریلی نے مفصل دے دیا ہے جو امید ہے کہ تشفی بخش ثابت ہوگا۔ اس سے معلوم ہو چکا ہوگا کہ قرآن کی نسبت قولی خدا کی طرف، رسول کی طرف اور عام انسانوں کی طرف کن کن معنوں میں ہوتی ہے۔

جعلی کاغذی سکہ

مدیر نگار کی خدمت میں آخری گذارش یہ ہی کہ دنیا بہت آگے نکل چکی ہے علم بہت کچھ پھیل چکا ہے، ان کو تجربہ ہو چکا ہے کہ کاغذ کا جعلی سکہ بنانا آسان مگر اسکا چلانا بہت مشکل ہے۔ تجربہ سے انکو سبق حاصل کرنا چاہیئے۔

والسلام

علوم القرآن

مسلمانوں کے حریف اگر ان کے تمام ابواب فضائل و مناقب کی صحت روایت سے انکار کر دیں تو بھی ایک باب یقیناً ایسا رہ جائے گا جسکے انکار کی وہ کبھی جرأت نہ کر سکیں گے۔ ہمارا اشارہ اس سے مسلمانوں کے اس شدید جد و جہد و سعی و محنت کی طرف ہے۔ جو انھوں نے اپنی کتاب الٰہی کی تشریح و توضیح، تحقیق و تدقیق اور فہم و تفہیم میں صرف کی۔ دنیا میں متعدد قومیں ہیں جن کے پاس حسب ادعا و زعم کتب الٰہی محفوظ ہیں۔ لیکن مسلمانوں نے اپنی کتاب الٰہی کے لیے جو خدمتیں انجام دیں اور اس کے متعلق جو ذخیرہ علوم و تصنیفات فراہم کر دیا کیا اسکا ایک حصہ بھی دوسری قومیں پیش کر سکتی ہیں؟ بلاشبہ بحیثیت ترجمہ مسیحی قوم کا کوئی قوم مقابلہ نہیں کر سکتی۔ لیکن ان تراجم سے کیا فائدہ جنھوں نے خود اصل کو گم کر دیا ہو۔

مسلمانوں نے قرآن مجید کے ساتھ جو اعتنا کی اور اس کے متعلق جو خدمتیں انجام دیں ان کی ہم حسب ذیل جلی تقسیم کر سکتے ہیں۔

(۱) تشریح مسائل عامہ متعلقۂ قرآن۔ مثلاً کیفیت نزول۔ کتابت قرآن۔ قرأت و تجوید قرآن۔

(۲) تدوین علوم متعلقہ قرآن۔ مثلاً علم الامثال۔ علم الاعراب۔ علم المجاز۔

(۳) تفسیر معانی والفاظ قرآن مثلاً کتب تفاسیر عامہ۔

ان امور ثلاثہ میں سے ہر ایک اس لائق ہے کہ اگر اسکی تفصیل کی جائے تو خود اسکے متعدد شعبے نکل سکتے ہیں لیکن بخوف تطویل ہم صرف ضروری اور مایحتاج امور پر اکتفا کرینگے۔

مسائل متعلقہ قرآن

ان سے وہ مسائل مراد ہیں جو اختصار مباحث کی بنا پر مستقل فن نہیں بن سکتے اور اس لئے ان کے متعلق مستقل کتابیں نہیں لکھی گئیں اس عنوان کے تحت میں حسب ذیل مسائل علماء نے بیان کئے ہیں۔

(۱) معرفت کیفیت نزول قرآن و بدء و انتہائے نزول قرآن (قرآن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر کس طرح نازل ہوتا تھا اور سب سے اول اور سب سے آخر کون سی آیت یا سورت نازل ہوئی)

(۲) معرفت آیات و سور مکیہ و مدنیہ (مکہ میں کون کون آیتیں اور سورتیں نازل ہوئیں اور مدینے میں کون؟)

(۳) معرفت اوقات و ازمنۂ نزول (یہ آیتیں اور سورتیں کس وقت نازل ہوئیں؟)

(۴) معرفت مقامات و اماکن نزول (کہاں اور کس مقام پر نازل ہوئیں؟)

(۵) معرفت جمع و ترتیب قرآن (قرآن کس طرح جمع و مرتب ہوا؟)

(۶) معرفت تعداد سور و آیات و کلمات قرآن (قرآن میں کتنی سورتیں، کتنی آیتیں اور کتنے حروف ہیں؟)

(۷) معرفت مجمل و مبین و مقید و مطلق و عام و خاص و منطوق و مفہوم و محکم و متشابہ قرآن۔

(۸) معرفت اقسام دلائل قرآن۔

(۹) معرفت طرق مخاطبات قرآن۔

(۱۰) معرفت حصر و تخصیص و ایجاز و اطناب قرآن قس علی ذٰلک

علوم متعلقہ قرآن

علمائے اسلام نے قرآن مجید کے متعلق جو خدمات انجام دیئے ہیں اس کی عملی دلیل یہ ہے کہ انھوں نے قرآن مجید کے ہر شعبہ کے متعلق اتنے علوم مدون اور اسقدر کتابیں تصنیف کر دی ہیں کہ انکا حصر بھی مشکل ہے۔ کشف الظنون اور فہرست ابن ندیم میں سینکڑوں علوم و تصنیفات متعلقہ قرآن کا ذکر ہے جو آج بالکل ناپید ہیں۔ تاہم تلاش و جستجو سے جن علوم و تصنیفات کا پتہ ملتا ہے وہ حسب ذیل ہیں۔

رسوم القرآن۔ تجوید القرآن۔ اعراب القرآن۔ مصادر القرآن۔ افراد القرآن و جمعہ۔ مفردات القرآن۔ غرائب القرآن۔ معانی القرآن۔ اعجاز القرآن۔ مجاز القرآن۔ تشبیہ القرآن۔ امثال القرآن۔ امثلۃ القرآن

بدائع القرآن۔ اسباب النزول۔ مبہمات القرآن۔ متشابہ القرآن۔ اقسام القرآن۔ مناسبۃ الآیات والسور۔ مطالع القرآن ومقاطعہ۔ فواتح السور۔ اعلام القرآن۔ ناسخ القرآن ومنسوخہ۔ مشکلات القرآن۔ حجج القرآن۔ احکام القرآن۔ جوہر القرآن۔ نجوم القرآن۔

ان تمام علوم کے متعلق دو قسم کی تصنیفات ہیں۔ ایک وہ جن میں ان تمام علوم و مسائل سے ایک ہی کتاب کے مختلف ابواب میں بحث کی گئی ہے اور بہ اختصار وہ ان تمام مباحث پر مشتمل ہیں۔ اس صنف تصنیفات کو ہم نے "جوامع علوم قرآن" دوسری قسم ان تصنیفات کی ہے جن میں ایک ایک علم اور ایک ایک مبحث سے مستقلاً بحث ہے اور وہ صرف ایک ہی علم یا مبحث کے مختلف انواع مسائل و نکات اور فوائد کو جامع ہیں۔

جوامع علوم القرآن

دنیا میں ہر شئے اپنی بسیط اور سادہ حالت سے شروع ہوتی ہے اور پھر رفتہ رفتہ ایک شاندار ترکیبی حالت تک پہنچ جاتی ہے۔ علوم قرآن کے متعلق بھی ابتدائی کوششیں انفرادی علوم و مسائل سے شروع ہوئیں اور ایک مدت کے بعد وہ تکمیل کو پہنچیں۔ یہی سبب ہے کہ علوم قرآن کے متعلق منفردہ تصانیف دوسری صدی میں موجود ہو گئی تھیں لیکن جوامع تصنیفات کا سراغ ہم کو سب سے پہلے پانچویں صدی میں ملتا ہے۔ ہم جوامع علوم قرآن کا پہلا مصنف علی بن ابراہیم الحوفی المتوفی سنہ ۴۳۰ھ کو جانتے ہیں

جن کی تصنیف کا نام علوم القرآن ہے۔ اس کے بعد شیخ مکی بن ابی طالب المتوفی ۴۳۷ھ کی "الهدایۃ الی بلوغ النہایۃ" کا نام لینا چاہیئے۔ مصنف نے یہ کتاب ۷۰ جزء میں معانی وانواع علوم قرآن پر لکھی ہے۔

اس باب میں تیسری تصنیف مؤسس فن بلاغت امام عبد القاہر جرجانی المتوفی ۴۷۵ھ کے تلمیذ رشید ابو عامر فضل بن اسماعیل جرجانی کی البیان فی علوم القرآن ہے۔ اس کے بعد ابو موسیٰ محمد بن ابی بکر اصفہانی المتوفی ۵۸۱ھ کی مجموع المغیث فی علم القرآن والحدیث۔ یہ پہلا شخص ہے جس نے علوم قرآن وحدیث پر یکجا کتاب لکھی۔ علامہ ابن جوزی المتوفی ۵۹۷ھ کی "فنون الافنان فی علوم القرآن" بھی اس فن کی ایک بسوط تصنیف ہے۔ بدیع الدین احمد بن ابی بکر بن عبد الوہاب القزوینی الموجود ۶۲۵ھ کی الجامع المحرر الحاوی معلوم کتاب اللہ العزیز اپنی دلالت عنوان کے لحاظ سے ایک قابل قدر کتاب معلوم ہوتی ہے اسی موضوع پر جمال القراء وکمال الاقراء علم الدین ابو الحسن علی بن محمد سخاوی المتوفی ۶۴۳ھ کی بھی تصنیف ہے جو قرآت وقف وابتداء ناسخ ومنسوخ وغیرہ مباحث قرآن پر مشتمل ہے۔ محمد بن عبد الرحمان ابن شامہ المتوفی ۷۰۸ھ کی "المرشد الوجیز فی علوم متعلق بالقران العزیز" بھی اس فن میں ایک کتاب ہے۔ لیکن ان تمام تصنیفات سے بہتر بدر الدین محمد بن بہادر زرکشی المتوفی ۷۹۴ھ کی "البرہان فی علوم القرآن" جس میں ۴۷ مختلف حیثیات سے قرآن مجید کے

متعلق مباحث ہیں۔ اس کے بعد قاضی جلال الدین بلیقی المتوفی سنہ ۸۲۴ھ کی مواقع العلوم من مواقع النجوم ہے۔ اس کتاب میں چھ فصول کے تحت میں قرآن مجید کے مختلف پچاس مباحث و فنون ہیں سنہ ۸۵۶ھ میں محی الدین محمد بن سلیمان کا فیجی نے "التیسیر فی علم التفسیر کے نام سے ایک چھوٹا سا رسالہ لکھا جس پر کافیجی کو فخر تھا۔ مگر اسلام کو فخر نہ تھا۔ سب سے آخر لیکن سب سے جامع اور بہتر اس باب میں جلال الدین سیوطی المتوفی سنہ ۹۱۰ھ کی الاتقان فی علوم القرآن ہے جس میں ۸۰ ابواب کے تحت میں علوم قرآن کے متعلق ۳۰۰ سے زاید مباحث ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ اگر حسب عادت سیوطی نے موضوع و ضعیف احادیث و روایات کو اس میں جگہ نہ دی ہوتی تو کتب خانۂ اسلام کی یہ ایک بے نظیر تصنیف ہوتی۔

یہ تصانیف مذکورہ جیسا ہم نے پہلے لکھا ہے جوامع علوم قرآن پر مشتمل ہے۔ آئندہ سطور میں ہم ایک ایک فن کا ذکر کرتے ہیں جس میں بہ ترتیب (۱) کتابت و قرأت قرآن (۲) الفاظ قرآن (۳) معانی قرآن (۴) مقدمات مقاصد قرآن اور (۵) مقاصد قرآن پر گفتگو ہوگی۔

(رسوم القرآن)

نزول قرآن کے بعد قرآن کے متعلق سب سے پہلا کام یہ تھا کہ قلم سے اسکو لکھا جائے اور زبان سے ادا کیا جائے۔ نوع اول کا نام

رسوم القرآن" ہے جس میں قرآن مجید کے اصول کتابت اور طریقۂ تحریر سے بحث ہوئی ہے۔ یہ ممکن تھا کہ جس طرح عربی زبان کی تمام کتابیں لکھی جاتی ہیں اسی طرح قرآن بھی لکھا جاتا اور عہد بعہد اصول خط عربی میں جو تبدیلیاں ہوئیں ان سے کتابت قرآن میں بھی کام لیا جاتا لیکن مسلمانوں نے بسلسلۂ حفظ قرآن ضروری سمجھا کہ جو لفظ عہد قدیم نبوی میں جس طرح لکھ دیا گیا ہے اسی طرح باقی رکھا جائے۔ تاکہ مسلمان نہ صرف یہ دعوٰی کر سکیں کہ الفاظ قرآن محفوظ ہیں بلکہ یہ بھی دعوٰی کر سکیں کہ خط و رسوم قرآن بھی محفوظ ہیں۔

عملاً مسلمانوں نے اس فن کو عہد نبوت سے اس وقت تک باقی رکھا ہے کیونکہ قرآن کو باوجود کثرت نسخ ہمیشہ اسی رسم خط میں لکھا جس میں صحابہ نے قرآن عام مسلمانوں کو سپرد کیا۔ تدوین فن کے لحاظ سے اس باب میں سب سے پہلی تصنیف حسب معلومات موجودہ ابو عمرو بن سعید الدانی المتوفی س۴۴۴ھ کی تصنیف "الاقتصاد فی رسم المصحف" اور "المستقنع فی رسم المصحف" ہے المقنع میں باختصار مصاحف بلاد اسلامیہ کے مختلف و متفق خطوط کا اور قرآن میں زیر و زبر اور نقطے لگانے کی کیفیت کا بیان ہے۔ علمائے اسلام نے اس تصنیف کی بڑی قدر کی۔ ابو محمد قاسم بن فیرہ شاطبی المتوفی س۵۹۰ھ نے بہ نظر تسہیل حفظ اسکو ایک قصیدہ رائیہ میں نظم کر دیا۔ اس رسالہ کا نام "عقیلہ اتراب القصائد" ہے۔ برہان الدین ابراہیم ابن عمر جعبری المتوفی س۷۳۲ھ نے اس قصیدہ کی بنام "جمیلۃ ارباب المراصد"

علم الدین علی بن محمد سخاوی المتوفی ۶۴۳ھ بنام "الوسیلۃ الی کشف العقیلہ" شہاب الدین احمد بن محمد بن جبارۃ المرداوی المقدسی المتوفی ۷۲۸ھ محمد بن قفال شاطبی تلمیذ سخاوی اور احمد بن محمد بن شیرازی کازرونی نے ۷۹۸ھ میں اور ابو البقا علی بن القاصح المصری المتوفی ۸۰۱ھ نے بنام "تلخیص الفوائد" اور نیز نور الدین علی بن سلطان ہروی المتوفی ۱۰۱۴ھ نے بنام "الہبات السنیۃ العلیہ علی ابیات الشاطبیۃ الرائیہ فی الرسم" مبسوط و مختصر شرحیں لکھیں۔

متاخرین میں خطیب الروم ۹۵۹ھ کی "رسوخ اللسان فی حروف القرآن" اور ابو العباس مراکشی کی "عنوان الدلیل فی مرسوم خط التنزیل" کارآمد رسائل ہیں۔ ہندوستان میں مولانا بحر العلوم المتوفی ۱۲۲۵ھ ہجری کا مختصر فارسی رسالہ رسم مصحف اکثر قرآن کے حاشیوں پر چھپا ہے۔

تجوید القرآن

یعنی قرآن مجید کا صحیح مخارج حروف و تلفظ سے حسن ترتیل کے ساتھ ادا کرنا۔ تجوید کو قرآن کے ساتھ وہی نسبت ہے جو نشید و غنا کو زبور کے ساتھ۔ تاہم یہود و مسیحی اسکو کوئی فن نہ بنا سکے اور مسلمانوں نے اسکو بھی ایک فن بنا دیا ہے۔ سینکڑوں ماہر اور امام اس فن کے ازمنۂ مختلفہ میں ممالک اسلام میں پیدا ہوئے اور اب تک موجود ہیں۔

ممالک عربیہ میں عموماً اور ہندوستان میں کہیں کہیں باقاعدہ اُس کی درسگاہیں ہیں جہاں بواسطۂ اساتذہ فن و مدونہ قواعد و اصول تجوید کی اب تک خلفاً عن سلف تعلیم ہوتی چلی آئی ہے۔

تدوین فن کی حیثیت سے اس فن کے سب سے پہلے مصنف موسیٰ بن عبید اللہ خاقانی بغدادی المتوفی ۲۲۵ھ ہیں۔ اسکے بعد مکی بن ابی طالب قیسی المتوفی ۴۳۷ھ کی کتاب رعایۃ لتجوید القرأۃ تصنیف ہوئی۔ اس فن کی مقبول ترین تصنیف محمد بن محمد جزری المتوفی ۸۳۳ھ کی مقدمہ جزریہ منظومہ ہے۔

بڑے بڑے علمانے اسکی شرحیں لکھی ہیں مثلاً زین الدین ازہری المتوفی ۸۷۰ھ خالد بن عبد اللہ ازہری المتوفی ۹۰۵ھ ابو العباس احمد بن محمد قسطلانی المتوفی ۹۲۳ھ شیخ الاسلام زکریا انصاری المتوفی ۹۲۶ھ شمس الدین دلجی شارح شفا المتوفی ۹۴۷ھ مولی عصام الدین طاش کبریٰ زادہ المتوفی ۹۶۸ھ رضی الدین بن الحنبلی الحلبی المتوفی ۹۷۱ھ۔ برہان الدین جعبری المتوفی ۶۶۳ھ کی عقود الجمان فی تجوید القرآن بھی اسی فن کی تصنیف ہے۔

قراآتُ القرآن

الفاظ قرآن باوجود بقائے معنی مختلف وجوہ حرکات و اوقاف و ادغام و امالہ و فصل و وصل کے ساتھ پڑھے جاسکتے ہیں اور یہ تمام طرق متواتر صحابہ سے مروی ہیں۔ ان وجوہ و حرکات و طرق مختلفہ سے یا ان کے

کسی ایک سے بحیثیت روایت و سماعت بحث کہ آنحضرت سے کس طرح سنا گیا ہے اور صحابہ نے کس طرح پڑھایا "علم قرآت القرآن" ہے صحابہ کے بعد تابعین اور تبع تابعین میں اس فن کے سات مشہور امام گذرے ہیں تابعین میں عبداللہ ابن عامر یحصبی قاری شام المتوفی ۱۱۸ھ عبداللہ بن کثیر قاری مکہ المتوفی ۱۲۰ھ۔ عاصم بن بہدلہ قاری کوفہ المتوفی ۱۲۷ھ اور تبع تابعین میں حمزہ بن حبیب التیمی قاری کوفہ المتوفی ۱۵۴ھ۔ نافع بن عبدالرحمن لیثی قاری مدینہ المتوفی ۱۶۹ھ۔ علی بن حمزہ کسائی قاری کوفہ المتوفی ۱۸۹ھ۔ اور ابوعمر بن العلاء المازنی قاری بصرہ المتوفی ۲۴۶ھ ان میں سب سے زیادہ مشہور و مقبول قرأت نافع ہے جسکی عملاً تمام بلاد اسلامیہ میں تقلید کی جاتی ہے۔

نافع نے ستر قراء تابعین سے قرأت حاصل کی تھی۔ اس فن کے مصنف اول حسب تحقیق علامہ جزری، ابوعبید قاسم بن سلام المتوفی ۲۲۴ھ ہیں "شاطبیہ" سے (جو اس فن کی مقبول ترین تصنیف ہے) پہلے، ابوعلی حسن بن احمد فارسی نحوی المتوفی ۳۷۷ھ کی "الحجۃ فی القرآآت" عبید اللہ بن محمد اسدی المتوفی ۳۸۷ھ کی "المفصح فی القرآآت"۔ ابوعمرو عثمان بن سعید الدانی المتوفی ۴۴۴ھ کی کتاب "التیسیر جامع البیان فی القرآآت السبع" اور "المحتوی فی القرآآت الشواذ" اور ابوطاہر اسمٰعیل بن خلف المتوفی ۴۵۵ھ کی "عنوان فی القرأۃ" اور "الاکتفا فی القرأۃ" قابل ذکر تصنیفات ہیں۔ اواسط قرن سادس میں امام القرأۃ قاسم بن فیرہ

شاطبی اندلسی المتوفی سنہ ۵۹۰ھ نے قصیدۂ لامیہ شاطبیہ تصنیف کیا جسکی شعاع شہرت کے پردہ میں اس سے پہلے کی تمام تصنیفات چھپ گئیں "شاطبیہ" کے بعد قراء کبار نے مستقل تصانیف کے بجائے اسکی شرح کافی سمجھی۔ جن میں مشہور اشخاص علم الدین علی بن محمد سخاوی المتوفی سنہ ۶۴۳ھ برہان الدین ابواسحاق ابراہیم بن عمر جعبری المتوفی سنہ ۷۳۲ھ ابوالخیر محمد بن محمد جزری المتوفی سنہ ۸۳۳ھ اور ابن القاصح صاحب سراج القاری ہیں۔ علامہ جزری شارح شاطبیہ ہونے کے سوا "النشر فی القراآت العشر" اور "تحبیر التیسیر فی القراآت العشر" کے مصنف بھی ہیں۔ علی نوری سفاقسی کی "غیث النفع فی القراآت السبع" بھی اس فن میں ایک متداول کتاب ہے۔

عِلَل القراآت

جس طرح علم القرأۃ میں روایۃً وسماعًا الفاظ قرآن کے مختلف اوصاف و احوال سماعیہ کا بیان ہوتا ہے علل القراآت میں انہی چیزوں سے اصولاً اور عقلاً بحث ہوتی ہے کہ از روئے اصول صرف ونحو وقواعد ومحاورات زبان عربی ان کو کیونکر ہونا چاہیئے۔ ان مباحث پر گفتگو کا سب سے زیادہ حق اہل ادب اور علمائے نحو کو ہے۔ اسی لیئے اس فن کا واضع ومدون یہی طبقہ ہے۔ مثلاً ابوالعباس احمد بن محمد نحوی سلیمان بن عبداللہ نحوی المتوفی سنہ ۲۹۳ھ۔ ابوالحسن علی بن حسین الباقولی الموجود سنہ ۵۳۵ھ

معرفۃ الوقف و الابتداء

انسان کسی حالت میں سانس کی آمد و رفت کو روک نہیں سکتا اسلئے ضرور ہے کہ کسی طویل عبارت کو پڑھتے وقت سانس کئی کئی بار ٹوٹ جائے ان سکنات تنفس کے لئے ضروری ہے کہ وہ بے موقع نہ ہوں ورنہ عبارت کا سلسلہ اتصال ٹوٹ جائے گا اور اکثر عبارتوں کا سمجھنا مشکل ہوگا۔ علمائے اسلام نے اسی غرض کے لئے علم الوقف والابتداء وضع کیا اور قرآن میں جابجا علامات وقف کے نشان لگائے جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تلاوت قرآن میں کہاں وقف کرنا چاہیئے یعنی ٹھہرنا چاہیئے۔ اور کہاں سانس توڑ کر دوسری آیت سے تلاوت کی ابتدا کرنی چاہیئے۔ یہ فن گو علم التجوید اور علم القرأت کا ایک جزء ہے لیکن غایت اہمیت کے لئے قرا نے اسکو مستقل فن قرار دیا۔ اور اس میں منفرد و مخصوص تصنیفات کیں۔

ابوبکر محمد عیسیٰ مغربی نے ان تمام اوقاف کو ایک رسالہ میں بنام "وقوف النبی صلعم فی القرآن" جمع کر دیا ہے۔ مکی بن ابی طالب المتوفی ۳۰۹ھ نے صرف اس موضوع پر ایک رسالہ "الوقف علی کلا وبلیٰ فی القرآن" لکھا کہ قرآن میں لفظ "کلا" اور "بلیٰ" پر وقف کرنا چاہیئے یا نہیں؟ ان کے علاوہ کتاب "الوقف والابتداء" کے نام سے مشہور ائمہ نحو و ادب مثلاً قدما میں یحییٰ ابن زیاد الفراء المتوفی ۲۰۷ھ، ابوالعباس احمد بن یحییٰ ثعلب نحوی المتوفی ۲۹۱ھ، مکی بن ابی طالب المتوفی ۳۰۹ھ ابواسحاق

ابراہیم الزجاج نحوی المتوفی سنہ ۳۱۱ھ۔ ابوبکر محمد بن قاسم ابن الانباری نحوی سنہ ۳۲۷ھ۔ ابوجعفر نحاس بغدادی نحوی المتوفی سنہ ۳۳۸ھ۔ ابوسعید حسن بن عبداللہ سیرافی نحوی المتوفی سنہ ۳۶۸ھ اور متاخرین میں محسن عثمانی اور سجاد ندی نے مستقل کتابیں تالیف کیں۔

الفاظ قرآن

مفردات القرآن

اسلام جب تک جزیرۂ عرب میں محدود تھا قرآن کے حل لغات و تفسیر الفاظ کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ لیکن غیر عربوں میں اشاعت قرآن کے لیے ضروری تھا کہ الفاظ و لغات قرآن کی تشریح کی جائے اور انکی ڈکشنری ترتیب دی جائے۔ بعض علمائے ادب نے تمام الفاظ کا احاطہ کیا اور انکا نام مفردات القرآن رکھا۔ مثلاً مفردات القرآن امام راغب اصفہانی الموجود ۵۰۰ھ۔ مفردات القرآن محی الدین محمد بن علی وران حنفی۔ لیکن اکثر علمائے ادب نے بجائے احاطہ الفاظ صرف مشکل لغات پر اکتفا کی اور اسکو غریب القرآن کے نام سے موسوم کیا۔

غرائب القرآن

فن غریب القرآن پر نہایت کثرت سے علمائے نحو و ادب نے تصنیفات کیں۔ اس موضوع پر سب سے پہلی کتاب غریب القرآن ابو عبیدہ معمر بن مثنیٰ نحوی المتوفی سنہ ۲۰۹ھ کی ہے۔ اس کے بعد اس موضوع پر یہ کتابیں لکھی گئیں

غریب القرآن احمد بن محمد بن یزداد طبری نحوی الموجود ۳۰۴ھ۔ غریب القرآن ابن درید لغوی المتوفی ۳۲۱ھ۔ غریب القرآن عبداللہ بن مسلم بن قتیبہ المتوفی ۳۲۲ھ۔ غریب القرآن ابوبکر محمد بن قاسم ابن الانباری المتوفی ۳۲۸ھ۔ غریب القرآن ابوعمر محمد عمر الزاہد تلمیذ ثعلب المتوفی ۳۴۵ھ۔ الاشارۃ فی غریب القرآن ابوبکر محمد بن حسن نقاش نحوی بغدادی المتوفی ۳۵۱ھ۔ غریب القرآن قاضی احمد بن کامل المتوفی ۳۵۰ھ۔ غریب القرآن ابوبکر محمد بن عزیزی سجستانی تلمیذ ابن درید۔ غریب القرآن والحدیث ابوعبید احمد بن محمد ہروی المتوفی ۴۰۱ھ۔ مشکل غریب القرآن مکی بن ابی طالب قیسی المتوفی ۴۳۷ھ۔ کتاب المغیث المستدرک علی الہروی ابوموسیٰ محمد بن ابی بکر اصفہانی المتوفی ۵۸۱ھ۔ تحفۃ الاریب فیما فی القرآن من الغریب ابوحیان محمد بن یوسف الاندلسی المتوفی ۷۴۵ھ

غریب القرآن کی تدوین میں سب سے زیادہ کاوش و تلاش و صرف وقت ابن درید اور عزیزی نے کیا۔ ان دونوں استاد شاگرد نے تدوین و ترتیب غریب القرآن میں پورے پندرہ برس صرف کیے۔

مصادر القرآن

بعض ائمہ لغت نے قرآن کے اسمائے جامدہ کو چھوڑ کر صرف مشتقات کی طرف توجہ کی اور مصادر قرآن کی تحقیق و تشریح کی۔ اس قسم کی پہلی تصنیف یحییٰ بن زیاد الفرا المتوفی ۲۰۷ھ کی مصادر القرآن ہے۔

اس کے بعد ابراہیم بن الیزیدی المتوفی ۳۲۵؁ نے مصادر القرآن لکھی۔ ابو جعفر احمد بن علی جعفر المتوفی ۵۴۴؁ نے تاج المصادر کے نام سے قرآن و حدیث دونوں کے مصادر یکجا جمع کر دیئے۔

الواحِدُ والتثنیۃُ والجمعُ فی القرآن

ہم نے جیسا پہلے بیان کیا ہے کہ جس طرح تمدن اجتماعی میں نئے نئے تکلفات اور مختلف ضرورتوں کے سامان ہمیشہ پیدا ہوتے رہتے ہیں اور وہ پھیلتے جاتے ہیں بعینہ یہی حال تمدن علمی کا بھی ہے کہ ہر شئے میں ذرا ذرا سی مناسبت سے نئے نئے شعبے پیدا ہوتے رہتے ہیں ہر تثنیہ اور جمع کی اصلی صورت واحد ہے۔ اور واحد و مفرد اسماء کی تشریح مفردات و غریب قرآن میں گو ہوتی رہتی ہے لیکن چونکہ تثنیہ اور جمع بنانے کے مختلف قواعد و اصول ہیں۔ بعض جمعیں بلا قاعدہ ہوتی ہیں۔ بعض جمعوں کی مفرد نہیں ہوتی۔ ان وجوہ سے علماء نے اس موضوع پر بھی بالکل مستقل رسائل لکھے جن میں سب سے پہلی تصنیف یحییٰ ابن زیاد الفراء المتوفی ۲۰۷؁ کی کتاب الجمع والتثنیۃ فی القرآن اور دوسری اخفش اوسط سعید بن سعدہ نحوی المتوفی ۲۱۵؁ کی الواحد والجمع یا الافراد والجمع فی القرآن

معرباتُ القرآن

ہر زبان میں دوسری زبانوں سے باہمی اختلاط و تعلقات سیاسی م

وتجارتی کی بنا پر کچھ الفاظ آجاتے ہیں۔ اور تھوڑے تغیر کے بعد وہ اصل زبان کے الفاظ قرار پاجاتے ہیں۔ عربی زبان میں بھی اس قسم کے الفاظ ہیں اور قرآن مجید نے ان کو استعمال کیا ہے۔ مجموعی مباحث میں علمائے متقدمین میں سے تو متعدد علما مثلاً ثعالبی، ابن فارس، ابن جزری، ابن جریر طبری (فی اول التفسیر) وغیرہ نے ان کا ایک باب علاحدہ قرار دیکر انکی تحقیق کی ہے۔ لیکن متاخرین میں جلال الدین سیوطی المتوفی سنہ ۹۱۰ھ نے "المذہب فیما وقع فی القرآن من المعرب" ایک مستقل رسالہ تالیف کیا ہے۔ تاج الدین سبکی المتوفی سنہ ۷۷۱ھ اور ابن حجر عسقلانی المتوفی سنہ ۸۵۲ھ نے ان الفاظ معربہ کو نظم کر دیا ہے۔

الوجوہ والنظائر فی القرآن

قرآن میں اکثر ایک لفظ متعدد مقامات میں مختلف معنی رکھتا ہے۔ اہل بلاغت ایسے لفظ کو "مشترک" کہتے ہیں لیکن قرآن میں انکو "نظائر" کہتے ہیں۔ اور بعض الفاظ ایسے ہیں جو متعدد مقامات پر بعینہٖ مستعمل ہوئے ہیں اور ہر جگہ ان سے ایک ہی معنی مراد ہیں۔ علمائے قرآن انکو وجوہ کہتے ہیں۔ وجوہ ونظائر کی واقفیت فہم معانی قرآن کے لیے نہایت ضروری ہے تاکہ معنی سمجھنے میں اشتباہ نہ ہو۔ اس بنا پر علمائے اسلام نے وجوہ ونظائر کی مستقل تصنیفات میں توضیح وتحقیق نہیں ضروری سمجھا۔ اس فن کی بنا اسقدر قدیم ہے کہ

حضرت ابن عباس نے انکے دو شاگرد عکرمہ اور علی بن ابی طلحہ نے ان سے اس فن کی روایتیں کی ہیں۔ بلحاظ تصنیف سب سے پہلے مقاتل بن سلیمان مفسر المتوفی ۱۵۰ھ کی تالیف "الوجوہ والنظائر" کا نام منقول ہے۔

انکے علاوہ احمد بن فارس لغوی المتوفی ۳۷۵ھ۔ ابوالفرج ابن الجوزی المتوفی ۵۹۷ھ۔ ابوالحسین محمد بن عبدالصمد مصری دامغانی۔ ابوالقاسم محمود نیسا پوری الموجود ۵۵۳ھ کی الوجوہ والنظائر فی القرآن کے نام سے تصنیفات ہیں۔ جلال الدین سیوطی کا رسالہ "معترک القرآن فی مشترک القرآن" بھی اسی فن میں ہے۔

اعرابُ القرآن

تمام سامی زبانوں میں سے صرف بابلی اور عربی دو زبانوں میں اجزائے کلام کے باہمی ارتباط و تعلق کے اظہار کے لئے اعراب (یعنی آخر حرف میں زیر، زبر، پیش) کا استعمال ہوتا ہے۔ انہیں اعراب کے ذریعہ سے عربی زبان میں فاعل، مفعول، مضاف، مضاف الیہ، حال، تمیز وغیرہ کا امتیاز ہوتا ہے۔ اسلیئے ظاہر ہے کہ فہم معنی کے لیئے واقفیت اعراب کی کسقدر ضرورت ہے۔ علمائے اسلام نے یہ بھی ضرورت پوری کردی ہے۔ قرآن مجید کے اعراب پر بے شمار کتابیں تصنیف کی ہیں جن میں عموماً ایک ایک سورہ کو بہ ترتیب لیکر انکے اعراب کی تحقیق کی گئی ہے۔

اعراب القرآن ابوحاتم سہل بن محمد سجستانی المتوفی ۲۴۸ھ،

اعراب القرآن ابو مروان عبد الملک بن حبیب قرطبی المتوفی سنہ ۲۳۹۔ اعراب القرآن ابو العبّاس مبرد المتوفی سنہ ۲۸۶۔ اعراب القرآن ثعلب نحوی المتوفی سنہ ۲۹۱۔ اعراب القرآن حسین بن احمد خالویہ نحوی المتوفی سنہ ۳۷۰ (اس کتاب میں سورۂ طارق سے آخری تیس سورتوں کے اعراب بیان کیے گئے ہیں) غریب اعراب القرآن احمد بن فارس زکریا لغوی المتوفی سنہ ۳۷۵۔ اعراب القرآن علی بن ابراہیم حوفی المتوفی سنہ ۴۳۰ (یہ کتاب دس جلدوں میں ہے) مشکل اعراب القرآن مکی بن ابی طالب قیسی المتوفی سنہ ۴۳۷ (تین جزء) ابو طاہر اسماعیل بن خلف صقلی نحوی المتوفی سنہ ۴۵۵ (نو جلدوں میں) اعراب القرآن ابو زکریا خطیب تبریزی المتوفی سنہ ۵۰۲ (۴ جلدوں میں) اعراب القرآن قوام السنۃ ابو القاسم اسماعیل الطلحی الاصفہانی المتوفی سنہ ۵۳۵۔ اعراب القرآن ابو البقاء عبد اللہ العکبری المتوفی سنہ ۶۱۶ اس فن کی مقبول و مشہور کتابیں ہیں۔ ان کے علاوہ اس فن کی یہ کتابیں بھی قابل ذکر ہیں۔ اعراب القرآن موفق الدین عبد اللطیف بغدادی المتوفی سنہ ۶۲۹ (صرف اعراب سورۂ فاتحہ) الکتاب الفرید فی اعراب القرآن المجید برہان الدین ابراہیم بن محمد سفاقی المتوفی سنہ ۷۴۲ (مخلوط باعراب تفسیر) و اعراب القرآن احمد بن یوسف السمین المصری المتوفی سنہ ۷۵۶۔ تحفۃ الاقران فیما قری بالتثلیث من حروف القرآن احمد ابن یوسف بن مالک الرعینی الاندلسی المتوفی سنہ ۷۷۹ (اس کتاب میں ان الفاظ کا بیان ہے جن کو مختلف معانی کے لحاظ سے جو

زیر، زبر، پیش تینوں حرکات کے ساتھ پڑھا جا سکتا ہے)

معانی، بیان، بدیع قرآن

معانی القرآن

الفاظ کے بعد قرآن مجید کے محاسن معنوی کی بحث ہے کہ قرآن مجید کن معانی پر مشتمل ہے۔ وہ معانی کن طرق سے ادا ہوئے ہیں۔ کن معانی کو کن مختلف صلات و حروف روابط سے ادا کیا گیا ہے۔ اور یہ مختلف صلات و حروف روابط معانی میں کیا اثر پیدا کرتے ہیں۔ الفاظ کی تقدیم و تاخیر، تعریف و تنکیر اطلاق و تقیید وغیرہ سے معانی میں کیونکر اثر پیدا ہوتا ہے۔ ان تمام امور کی واقفیت کے بغیر فہم مطالب قرآن غیر ممکن ہے۔ اسی لیئے علمائے ادب نے جن کو اس موضوع پر قلم اٹھانے کا سب سے زیادہ حق تھا ان مباحث پر نہایت کثرت سے کتابیں لکھیں جن میں حسب ذیل تصنیفات و مصنفین کے نام ہم کو معلوم ہیں

معانی القرآن یونس بن حبیب النحوی المتوفی سنہ ۱۸۲ھ۔ معانی القرآن علی بن حمزہ کسائی المتوفی سنہ ۱۸۹ھ۔ معانی القرآن محمد بن مستنیر قطرب النحوی المتوفی سنہ ۲۰۶ھ۔ معانی القرآن ابوالحی بن زیاد الفرار المتوفی سنہ ۲۰۷ھ۔ معانی القرآن ابو عبیدہ معمر نحوی المتوفی سنہ ۲۰۹ھ۔ معانی القرآن اسماعیل بن اسحاق ازدی المتوفی سنہ ۲۲۰ھ۔ تفسیر معانی القرآن سعید بن مسعدہ اخفش المتوفی سنہ ۲۲۱ھ۔ معانی القرآن ثعلب نحوی المتوفی سنہ ۲۹۱ھ۔ معانی القرآن محمد بن احمد بن کیسان نحوی المتوفی سنہ ۲۹۹ھ۔ معانی القرآن ابو محمد سلمہ بن عاصم نحوی المتوفی سنہ ۳۱۰ھ

معانی القرآن ابو اسحاق ابراہیم الزجاج المتوفی سنہ ۳۱۱۔ معانی القرآن ابو عبداللہ محمد بن احمد نحوی المتوفی سنہ ۳۲۰۔ معانی القرآن ابو الحسن عبداللہ بن محمد نحوی المتوفی سنہ ۳۲۵۔ معانی القرآن ابو جعفر نحاس نحوی المتوفی سنہ ۳۲۸۔ الموضح فی معانی القرآن ابو بکر نقاش نحوی المتوفی سنہ ۳۵۰۔ موجز التاویل عن معجز التنزیل احمد بن کامل بن شجرہ المتوفی سنہ ۳۵۰۔ ایجاز البیان فی معانی القرآن نجم الدین ابو القاسم محمود نیساپوری المتوفی سنہ ۵۵۳۔

اعجاز القرآن

انبیاء پر خدا کی طرف سے جو کتابیں نازل ہوئیں وہ اپنے معانی، مقاصد ارشادات اور ہدایات کی بنا پر ہر زمانے میں معجز رہی ہیں لیکن یہ قرآن مجید کی ایک خصوصیت ہے کہ وہ اپنے معانی و ارشادات کے ساتھ اپنے الفاظ ترکیب کلام۔ ادائے مقصود اور تعبیر مفہوم میں بھی اعجاز رکھتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ صحف قدیمہ گو اپنے معانی کے لحاظ سے اب تک باقی ہوں لیکن وہ اپنے الفاظ و ترکیب الہامی کے لحاظ سے مدت ہوئی کہ دنیا سے مفقود ہو چکی ہیں مگر قرآن مجید جس طرح اپنے معانی تعلیمات اور ہدایات کے لحاظ سے غیر فانی ہے اسی طرح اپنے الفاظ و عبارات الہامیہ کے لحاظ سے بھی غیر فانی ہے۔ قال اللہ تعالیٰ انا لہ لحافظون

حقیقت اعجاز بیان۔ اسباب اعجاز کی تشریح۔ انواع اعجاز کی تقسیم و تحلیل۔ محاسن عبارات قرآن کی تفصیل نکات و وجوہ۔ بلاغت و فصاحت

قرآن کی توضیح، علمائے اسلام نے اس خوبی اور عمدگی سے کی ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ اور اس کے متعلق اس کثرت سے لٹریچر انھوں نے فراہم کر دیا ہے کہ اسکا احاطہ بھی دشوار ہے۔ اس فن کی پہلی کتاب جہاں تک ہمیں معلوم ہو سکا امام ابوالحسن علی بن حسین رمانی المتوفی سنہ ۳۸۶ کی "نکت فی الاعجاز" ہے اور دوسری امام سلیمان احمد ابن محمد خطابی المتوفی سنہ ۳۸۸ کی اعجاز القرآن۔ اور تیسری شریف ابو عبداللہ محمد بن زید بن علی الواسطی المتوفی سنہ ۳۰۶ کی اعجاز القرآن۔ چوتھی قاضی ابوبکر باقلانی المتوفی سنہ ۴۰۳ کی اعجاز القرآن ہے۔ شیخ عبدالقاہر جرجانی المتوفی سنہ ۴۷۴ نے "المعتضد" کے نام سے شریف ابوعبداللہ کی کتاب کی شرح لکھی۔ شیخ کی اسکے علاوہ اعجاز القرآن پر ایک دوسری تصنیف بھی ہے۔

متاخرین میں زین المشائخ محمد بن ابی القاسم البقالی الخوارزمی المتوفی سنہ ۵۶۲ کی "التنبیہ علی اعجاز القرآن" ابواسحاق ابراہیم بن احمد البجزری الخزرجی کی "ایجاز البرہان فی اعجاز القرآن" امام فخر الدین رازی المتوفی سنہ ۶۰۶ کی اعجاز القرآن، زکی الدین بن ابی الاصبع قیروانی المتوفی سنہ ۶۵۶ کی البرہان فی اعجاز القرآن ابوبکر محمد بن محمد بن سراقہ المتوفی سنہ ۶۶۲ کی اعجاز القرآن۔ کمال الدین محمد بن علی زملکانی شافعی المتوفی سنہ ۷۲۷ کی البرہان فی اعجاز القرآن الکبیر۔ اور المجید فی اعجاز القرآن المجید الصغیر اس فن کی نادر تصنیفات ہیں۔

یہ تصنیفات عموماً قرآن مجید کے ان طرق بلاغت و وجوہ فصاحت

وانواع محاسن پر مشتمل ہیں جو حد اعجاز تک پہنچ گئے ہیں۔ ضرورت تھی کہ قرآن مجید کے عام محاسن کلام پر بھی گفتگو کی جائے چنانچہ مجاز قرآن۔ تشبیہ قرآن، امثال قرآن۔ امثلہ قرآن اور بدائع قرآن پر انکو مستقل فن قرار دیکر علیحدہ علیحدہ بیسوں کتابیں لکھی گئیں۔

مجاز القرآن

فطرت انسانی ہے کہ وہ پامال عامیانہ اور کثیر الاستعمال چیزوں سے نفرت کرتا ہے اور مخصوص الاستعمال نو ایجاد اور دست نارسیدہ اشیاء کو پسند کرتا ہے اسی بنا پر عام اور مبتذل ترکیب الفاظ فصحاء کی زبان میں متروک ہیں۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ اگر ہر متکلم معانی کے لیے خود الفاظ گڑھ کر اس کا استعمال شروع کر دے تو ہر شخص کی زبان کے لیے ایک نئی ڈکشنری کی حاجت ہوگی۔ اور دنیا میں باہمی فہم و تفہیم کا سد باب ہو جائیگا کیونکہ الفاظ سے معانی تک انتقال ذہن فقط ملک یا قوم کے متفق علیہ وضع عام کا نتیجہ ہے اس بنا پر ایک طرف یہ ضروری ہے کہ وضع عام سے کنارہ کشی نہ کی جائے اور دوسری طرف یہ ضروری ہے کہ کلام میں جدت ترکیب، خصوصیت استعمال اور بے ابتذالی پیدا ہو۔ اس مشکل کا چارہ کار صرف ایک چیز ہے یعنی تعبیر معنی کے لیے ان غیر مبتذل، غیر عامیانہ اور مخصوص الفاظ کا استعمال کیا جائے جن کا گو ان معانی کے لیے وضع عام نہ ہو کر ابتذال پیدا ہو جائے لیکن ان الفاظ کے معانی موضوعہ اور ان معانی میں جنکو ہم ادا

کرنا چاہتے ہیں ایک خاص قسم کی مناسبت و مشابہت ہو جسکی بنا پر جب ہم ان الفاظ کا استعمال کریں ہمارا مخاطب ان کے عام موضوع لہ معنی سمجھے اور پھر جب وہ ان کو کلام کے مقصود اور موقع و محل کے موافق نہ پائے فوراً اسکا ذہن ان عام معانی کو چھوڑ کر ان کے مناسب و مشابہ معنی کی طرف منتقل ہو جائے اور متکلم کا مقصود اس کے جدید، غیر مبتذل اور غیر عامی الفاظ و ترکیب کے ذریعہ سے سمجھ جائے۔۔۔

اس تفصیل سے حقیقت و مجاز کی ماہیت اور مجاز کے حسن، شرف اور رفعت کے اسباب کا اظہار مقصود تھا کہ حقیقت الفاظ کا اپنے وضع عام و معروف میں استعمال کا نام ہے۔ اور مجاز اس عام و معروف وضع کے ذریعہ سے اسکے مناسب و غیر معروف معنی کو ادا کرنا ہے۔ اور اس غیر معروفی، بے انتذالی اور جدت ترکیب کی بنا پر مجاز حقیقت سے بہتر اور اشرف قرار دیا گیا ہے۔

قرآن مجید میں جس کا حسن عبارت، خوبی کلام اور جدت ترکیب حد اعجاز تک ہے بے انتہا مجازات ہیں جو اکثر کتب سماویہ کی خصوصیت خاص ہے فن معانی القرآن میں گو علماء نے ایک حد تک اسکے مباحث سے تعرض کیا تھا لیکن انکی اہمیت ایک مستقل فن کی طالب تھی اس بنا پر مصنفین اسلام نے مجاز القرآن کے نام مستقل و مفرد تصنیفات کا سلسلہ شروع کیا۔ اس سلسلہ کی پہلی کڑی ابو عبیدہ معمر بن مثنی نحوی المتوفی سنہ ۲۰۹ھ کی "مجاز القرآن" ہے سلطان العلماء عز الدین بن عبد السلام المتوفی سنہ ۶۶۰ھ کی "الاشارۃ الی الایجاز فی بعض انواع المجاز" اس فن کی بہترین تصنیف جس میں

نہایت استیعاب کے ساتھ قرآن کی آیات کا استقصا اور ان کے معانی کی تشریح کی گئی۔ اسکے بعد علامہ ابن قیم بن جوزیہ کی تصنیف "الایجاز فی المجاز" ہے۔ جلال الدین سیوطی المتوفی سنہ ۹۱۱ھ نے سلطان العلماء کی "الاشارۃ" کا بنام "مجاز الفرسان الی مجاز القرآن" اختصار کیا ہے۔

تشبیہ القرآن

سینکڑوں معانی اور مطالب ایسے ہیں جو عام نظروں سے پوشیدہ ہیں اور جن کی تشریح و توضیح کے لئے ایک دفتر درکار ہوتا ہے لیکن سب سے آسان، مختصر اور بہتر صورت اسکی یہ ہے کہ ان کو بذریعہ تشبیہ ادا کیا جائے یعنی ان کو ایسے معانی و مطالب کے مماثل و مشابہ قرار دیا جائے جو عام طور سے معلوم ہیں۔ اور نظروں کے سامنے ہیں کہ مخاطب ان ظاہر اور واضح معانی سے بواسطۂ مماثلت و مشابہت ان مخفی، پیچیدہ اور دیر فہم معانی و مطالب تک پہنچ جائے۔

مذہب چونکہ ماورائے مادہ سے بحث کرتا ہے اسلئے بیشتر مواقع پر اسکو تشبیہوں سے کام لینا پڑتا ہے قرآن مجید کے تشبیہات پر عام کتب بیان اور نیز فن معانی القرآن۔ فن اعجاز القرآن اور فن مجاز القرآن میں ان پر کامل بحثیں موجود ہیں۔ اور "الجمان فی تشبیہ القرآن" لابی القاسم عبداللہ بن باقیا البغدادی المتوفی سنہ ۴۸۵ھ اس فن پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے۔

امثال القرآن

جو اغراض تشبیہ سے متعلق ہے بعینہ وہی امثال سے مقصود ہیں۔ انبیائے مذاہب اور حکمائے اخلاق نے تمام طرق استدلال سے زیادہ ان امثال سے کام لیا ہے کہ یہ استدلالات منطقی سے زیادہ موثر اور عام فہم ہیں۔ اسلیے قرآن مجید میں بھی نہایت کثرت سے امثال ہیں تفسیر کے ضمن میں مفسرین نے ان امثال کی جو تشریح کی ہے اسکے علاوہ ابوعبدالرحمان محمد بن حسین سلمی نیساپوری المتوفی سنہ ۴۱۲ھ ابوالحسن علی بن محمد ماوردی المتوفی سنہ ۴۵۰ھ اور شمس الدین ابن القیم المتوفی سنہ ۷۵۴ھ نے "امثال القرآن" کے نام سے مستقل کتابیں لکھی ہیں۔

امثلۃ القرآن

حکما کے چھوٹے چھوٹے مقولے اور بلغاء کے بلیغ فقرے لوگوں کی زبانوں پر چڑھ جاتے ہیں اور وہی تقریباً انشاپردازی اور ادب کی جان ہوتے ہیں اور پھر وہ لٹریچر میں اسقدر سرایت کر جاتے ہیں کہ ان سے سینکڑوں محاورے اور تلمیحات پیدا ہو جاتے ہیں۔ قرآن مجید ایجاز اور اعجاز کا کامل ترین نمونہ ہے۔ اسکی سینکڑوں چھوٹی چھوٹی آیتیں اور حکیمانہ فقرے عربی علم ادب کے جز بنگئے ہیں جن کے بغیر عبارت میں بلندی اور کلام میں لطف شیرینی نہیں پیدا ہو سکتی۔ علمائے ادب عربی نے قرآن مجید کی اس قسم کی تمام آیتیں الگ کر دی ہیں ثعالبی المتوفی سنہ ۴۲۹ھ نے کتاب الایجاز والاعجاز میں۔ قاضی ماوردی المتوفی

سنہ ۴۵ھ نے امثال القرآن میں۔ جعفر بن شمس الخلافہ نے کتاب الآداب میں جلال سیوطی المتوفی سنہ ۹۱۱ھ نے الاتقان میں مستقل ابواب قرآن مجید کی ضرب الامثال کو جمع کر دیا ہے۔

بدائع القرآن

کلام کے محاسن معنوی کے بعد اس کے محاسن لفظی کا درجہ ہے جن کو عام طور سے "صنائع و بدائع" کہتے ہیں۔ زور بلاغت فصاحت کے ساتھ اگر یہ چیز کلام میں پیدا ہو جائے تو عجیب لطف دے جاتی ہے۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ تمام علوم و فنون اسلامیہ کے بانی و واضع اول عموماً ارباب خلوت و صحرا ساد بوریا نشینان کلبہ فقر ہیں لیکن علم بدیع کا مخترع اول ایک عباسی شاہزادہ ابن المعتز المتوفی سنہ ۲۹۲ھ ہے۔ اس نے ۱۷ بدائع اپنی تصنیف کتاب البدیع میں جمع کیے۔ قدامہ بن جعفر نے جو ابن المعتز کا معاصر تھا نقد الشعر میں ۳۰ تک پہنچایا۔ ابو ہلال عسکری المتوفی سنہ ۳۹۵ھ نے کتاب الصناعتین میں ۷ کا اور اضافہ کیا۔ ابن رشیق قیروانی المتوفی سنہ ۴۵۶ھ نے کتاب العمدہ میں ۶۵ بدائع شمار کر لیے۔ شرف الدین احمد بن یوسف تیفاشی نے ۷۰ کیا۔ عبد العظیم بن ابی الاصبع المتوفی سنہ ۶۵۶ھ نے کتاب التحریر کے نام سے خاص قرآن مجید کے بدائع کی کتاب لکھی جس میں بدائع کی تعداد ۱۰۱ تک پہنچا دی

ھجاء القرآن

عجائب قدرت الٰہی کا ایک نمونہ یہ ہے کہ دنیا میں تقریباً پانچ ہزار

زبانیں بولی جاتی ہیں جو باوجود اختلاف شدید، حروف ہجا کی آوازیں (بہ استثنائے چند حروف) بالکل متحد و مشترک ہیں لیکن یہ اتحاد و اشتراک انکے الفاظ کے اتحاد و اشتراک پر ذرا بھی موثر نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ ۳۲ یا ۳۳ حروف ہیں جو کم و بیش دنیا کی پانچ ہزار زبانوں کیلئے ہمیشہ جدید اور غیر مشترک الفاظ کا ذخیرہ فراہم رکھتے ہیں!

عربی زبان تمام السنۂ سامیہ سے زیادہ حروف رکھتی ہے۔ عبری جو باعتبار ادبیات و علوم تمام سامی زبانوں میں سب سے زیادہ قدیم ہے اسکی بنیاد صرف ان ۲۲ حروف پر ہے۔

ا ب ج د (گ) ہ و ز ح ط ی۔ ک ل م ن۔ س ع ف (پ) ص۔ ق ر ش ت۔

انکا مجموعہ ابجد۔ ہوز۔ حطی۔ کلمن۔ سعفص۔ قرشت ہے۔ عربی زبان میں چھ حرف زیادہ ہیں۔ ث خ ذ۔ ض ظ غ۔ جن کا مجموعہ ثخذ اور ضظغ ہے۔

اس تفصیل سے تم نے سمجھ لیا ہوگا کہ عربی زبان میں حروف ہجا کی بہ حیثیت عبری ترتیب کیا تھی؟ یعنی دراصل اس طرح تھی۔

ا ب ج د۔ ہ و ز ح ط ی۔ ک ل م ن۔ س ع ف ص۔ ق ر ش ت ث خ ذ۔ ض ظ غ۔

بعد از اسلام سب سے اول جس چیز کو عربی زبان حیطۂ تحریر میں لائی وہ قرآن مجید ہے۔ کسی چیز کو لکھنے کے لئے حروف ہجا کی ترتیب و تعیین کوئی

ضروری شے نہیں لیکن اس کے پڑھنے کے لیے یقیناً سب سے اوّل حروف ہجاء کی اور پھر اسکو تحسین و صحت پڑھ سکنے کے لئے حروف ہجا کی ترتیب صحیح و آسان کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے مسلمانوں نے حروف ہجاء کو آسان ترین و بہترین ترتیب میں مبدل کیا۔ اور تمام ہم شکل و متحد الصورت حروف کو یکجا کر دیا۔ مثلاً ا۔ ب ت ث۔ ج ح خ۔ د ذ۔ ر ز۔ س ش۔
ص ض۔ ط ظ۔ ع غ۔ ف ق۔ ک۔ ل۔ م۔ ن۔ و۔ ہ۔ ی۔

حروف ہجاء کے تلفظ کی ایک اور مصیبت تھی۔ عبری میں کہ السنہ سامیہ کی مہذب ترین شاخ تھی تلفظ کی صورت یہ تھی۔

الف۔ بیتھ۔ گیمل۔ دالتھ۔ ہے۔ واو۔ زین۔ حیتھ۔ طیتھ۔ یود۔ کاف۔
لامیو۔ میم۔ نن۔ سن۔ عین۔ فے۔ صیح۔ قف۔ رش۔ شن۔ تار۔

قرآن مجید کے لیے حروف ہجا کی تہذیب ترتیب میں اس اختلاف تلفظ کو بھی دفع کیا گیا اور حتی الامکان ایک مختصر و متساوی الصوت تلفظ وضع کیا گیا مثلاً الف۔ بے۔ تے۔ ثے الخ یا۔ الف۔ با۔ تا۔ ثا۔ الخ

الغرض یہ مباحث ایسے تھے جو مسئلہ تدوین علوم قرآنیہ میں سب سے اول بحث و ترتیب کے لائق تھے چنانچہ دوسری اور تیسری صدی کے علماء نے ان مباحث پر بھی منفرد و مخصوص کتابیں لکھیں جنکا نام عموماً "ہجاء المصحف" ہے۔ ابن ندیم جو چوتھی صدی کا مصنف ہے اس نے اس موضوع پر متعدد تصنیفات کا ذکر کیا ہے۔ جیسے ہجاء المصحف یحییٰ بن حارث۔ ہجاء المصحف ابن شبیب۔ ہجاء المصحف احمد بن ابراہیم الوراق وغیر ذلک۔

النقط والشکل فی القرآن

عربی زبان میں ابتدائً حروف ہجا میں نقطے نہیں ہوتے تھے اسلیئے اکثر اہل عجم کی نظر میں حروف باہم متشابہ معلوم ہوتے تھے اور وہ صحیح نہیں پڑھ سکتے تھے۔ حجاج بن یوسف ثقفی کے تمام اوراق عمل میں سیاہی کے سوا اور کچھ نہیں تاہم اگر ان میں کچھ اُجالا ہے تو یہی ہے کہ اس نے قرآن کو اس مشکل سے نجات دی۔

چنانچہ چند علما کی مدد سے اس نے نقطے ایجاد کرائے۔ اس پہ بھی غلطی رفع نہ ہوئی تو قرآن کے الفاظ پر شکل یعنی زبر، زیر اور پیش لگائے۔ اکثر عربی کتابوں میں تم نے "اعجام" اور حروف "معجم" پڑھا ہوگا۔ اسکے اصلی معنی یہ ہیں کہ "لفظ عربی کو عجمی بنانا" چونکہ یہ نقطے عجمیوں کی خاطر ایجاد کیئے گئے تھے اسلیئے حروف ہجا پہ نقطے لگانا گویا "اعجام" ہونا تھا۔ یعنی عربی لفظ کو عجمی بنانا تھا۔

چونکہ یہ علامات بالکل نئی تھیں اسلیئے ان کے قواعد واصول کے لیئے مستقل تصنیفات کی ضرورت تھی۔ علمائے اسلام نے یہ ضرورت بھی باحسن وجوہ پوری کی اور حسب ذیل کتابیں یادگار چھوڑیں۔

کتاب النقط والشکل خلیل بن احمد (واضع علم عروض) المتوفی سنہ ۱۷۰ھ کتاب النقط والشکل محمد بن عیسٰی۔ کتاب النقط والشکل یحیٰی بن مبارک یزیدی النحوی المتوفی سنہ ۲۰۲ھ۔ کتاب النقط والشکل ابوحاتم سجستانی المتوفی

سنہ ۲۸۲ھ۔ (یہ کتاب جدوال و دوائر پر مشتمل ہے) کتاب النقط والشکل ابن قتیبہ دینوری المتوفی سنہ ۲۷۶ھ۔

اجزاءُ القرآن

ہر کتاب تحصیل فوائد اور تسہیل مطالب کی غرض سے مختلف ابواب و فصول پر منقسم ہوتی ہے صحف الٰہیہ بھی اس اصول سے مستثنیٰ نہیں۔ توراۃ مختلف پرق (فرق) یعنی منازل اور مختلف اصحاح یعنی سورہ پر منقسم ہے۔ قرآن مجید کی اصلی تقسیم معنوی اور سورتوں پر ہے لیکن لوگوں نے تلاوت کی آسانی کے لئے مختلف اجزاء پر اسکو منقسم کر دیا ہے ان تقسیمات کا مبنیٰ صرف الفاظ و عبارات کی متساوی تقسیم ہے تاکہ پڑھنے والوں اور حوالہ دینے والونکو سہولت و آسانی ہو۔

قرون اولیٰ کے عباد و زہاد علی العموم قرآن کی کامل تلاوت ایک ہفتہ میں ختم کر دیتے تھے۔ اس مناسبت سے قرآن کی سب سے پہلی لفظی تقسیم یہ ہوئی کہ سات ٹکڑوں پر منقسم کیا گیا جن میں سے ہر ایک کو "حزب" (ٹکڑا) یا "منزل" کہتے ہیں کہ تلاوت قرآن کا مسافر ہر روز وہاں اپنے سفر الی اللہ کی ایک منزل ختم کرتا ہے۔

تلاوت کا اس سے زیادہ سہل طریقہ یہ ہے کہ ہر مہینے میں ایک بار ختم کیا جائے اس بناء پر لوگوں نے قرآن کو تیس روز کے حساب سے برابر برابر تیس حصوں پر تقسیم کر دیا جن کا نام "پارہ" یا جزء ہے۔

پھر ہر پارہ دو برابر حصوں میں منقسم ہوتا ہے جن کو "نصف" کہتے ہیں نصف کے بھی دو ٹکڑے ہیں جن میں سے ہر ایک کا ایک ایک ربع ہے لیکن اصطلاحاً ایک ٹکڑے کو "ربع" "دو ٹکڑے کو "نصف" تین ٹکڑے کو "ثلث" اور چاروں ٹکڑوں کو ملا کر ایک "پارہ" کہتے ہیں۔

قرآن مجید کے ان مختلف اجزاء و اقسام کی تعیین کہ کہاں سے شروع ہوتے ہیں؟ کہاں ختم ہوتے ہیں؟ کہاں تک نصف ہے؟ کہاں ربع ہے؟ کہاں ثلث ہے، محتاج تالیف و ترتیب تھی اسلیے دوسری اور تیسری صدی کے علمائے نحو و ادب نے اس احتیاج سے بھی قرآن کریم کو مستغنی کر دیا۔ اجزاء القرآن ابوبکر بن عیاش الموجود ۱۲۷ھ (یہ کتاب ۳۰ پاروں کی تقسیم میں ہے) - اجزاء القرآن حمید بن قیس الہلالی۔ اسباع القرآن (۷ منازل کی تفصیل) حمزہ زیات المتوفی ۱۵۶ھ۔ اجزاء القرآن سلیمان بن عیسیٰ۔ اجزاء القرآن کسائی نحوی المتوفی ۱۸۸ھ۔ اجزاء القرآن ابو عمر الدوری الموجود سنہ ۔

مقطوع القرآن وموصولہ

کسی ایسی کتاب کے لئے جو متنوع المعانی اور مختلف المطالب ہو پڑھتے وقت نہایت ضروری ہے کہ عبارت کا توڑ جوڑ اور ختم و شروع ایسے فقرہ پر کیا جائے جس سے عبارت بے ربط اور معنی مختلط نہ ہوں۔ اسی کا نام قطع و وصل ہے۔ قرآن مجید کی تلاوت کے لیۓ بلکہ صحیح طور پر مطالب سمجھنے کے لیۓ نہایت ضروری ہے۔ قرآن مجید کی مقطوعات و موصولات

سے واقفیت ہو۔ حسب ذیل کتابیں اسی واقفیت کا ذریعہ ہیں مقطوع القرآن وموصولہ عبداللہ عامر یحصبی قاری شام المتوفی سنہ ۱۱۸ھ۔ مقطوع القرآن وموصولہ حمزہ بن حبیب الزیات قاری بصرہ المتوفی سنہ ۱۵۶ھ۔ مقطوع القرآن وموصولہ علی بن حمزہ کسائی قاری کوفہ المتوفی سنہ ۱۸۸ھ۔

عدد آی القرآن

جس طرح عام کتابوں کی ہر فصل و باب کی ترکیب فقروں سے ہوتی ہے اسی طرح قرآن مجید کی ہر سورۃ آیتوں سے مرکب ہوتی ہے۔ "آیۃ" عربی ہیں (اور اُوۃ عبری میں) لغتہ نشان و علامت کے مرادف ہے اور اصطلاحًا عبری میں تورات کے ایک حرف کو بھی اُوۃ کہتے ہیں کہ وہ اپنے مدلول علیہ کے لیئے صرف ایک قسم کا نشان اور علامت ہے لیکن عربی کی اصطلاح اس سے زیادہ وسیع قرار دی گئی ہے اور وہ قرآن کے پورے ایک فقرہ پر حاوی ہے۔

آیت یا فقرہ کسکو کہتے ہیں؟ کسی کلام مسلسل کے اس مختصر ٹکڑے کو جو ادائے مطلب اور تفہیم معنی میں مستقل ہو۔ اس تعریف کی رو سے ممکن ہے کہ کلام کا ایک ٹکڑا جس کو ہم ادائے مطلب کے لئے مستقل سمجھتے ہوں تم نہ سمجھتے ہو۔ پس یہ بالکل ممکن ہے کہ اگر ایک فریق کے نزدیک سورۂ فاتحہ کے سات ٹکڑے ہوں یعنی سات آیتیں، تو دوسروں کے ہاں چھ ہوں یا آٹھ۔ اسی پر پورے قرآن مجید کی تمام آیات کی تعداد کو قیاس کر لو۔

قرآن مجید کے تحفظ و صحت کی اخیر حد یہ ہے کہ مسلمانوں نے اس کے

ایک ایک حرف، ایک ایک لفظ اور ایک ایک آیت کا شمار کرلیا ہے۔ حروف اور الفاظ کی تعداد میں تو زیادت و نقص نہیں ہوسکتی لیکن بربنائے تفصیل مافوق آیات کی تعداد میں اختلاف رائے ممکن ہے چنانچہ "علم عدد آی القرآن" کا موضوع یہی مسئلہ ہے۔

علم القراۃ کی تفصیل میں اوپر گذر چکا ہے کہ فنون قرآن کے لئے قرون اولیٰ میں ۵ مشہور اسکول (درسگاہ) تھے۔ مکہ معظمہ۔ مدینہ مبارکہ بصرہ، کوفہ، شام۔ ان میں سے ہر اسکول نے اپنی تحقیق و رائے کے مطابق آیات قرآنیہ کی تعداد و شمار پر مستقل رسائل ترتیب دیئے ہیں۔

مکہ معظمہ

کتاب العدد عطاء بن یسار الفقیہ۔ کتاب العدد قزائی۔ کتاب حروف القرآن خلف البزاز

مدینہ مبارکہ

کتاب العدد نافع قاری مدینہ المتوفی سنہ ۱۶۹۔ کتاب العدد عیسی المدنی۔ کتاب العدد اسماعیل بن ابی کثیر القاری

کوفہ

کتاب العدد حمزہ الزیات قاری کوفہ المتوفی سنہ ۱۵۶۔ کتاب العدد خلف النحوی الکوفی۔ کتاب العدد محمد بن عیسی الکوفی۔ کتاب العدد علی بن حمزہ الکسائی النحوی قاری کوفہ المتوفی سنہ ۱۸۹۔

بصرہ

کتاب العدد ابن معافا۔ کتاب العدد عاصم الجحدری۔ کتاب العدد حسن بن حسن بصری۔ عدد آی القرآن محمد بن مستنیر قطرب المتوفی ۲۰۶ھ

شام

کتاب العدد یحییٰ بن حارث الذماری۔ کتاب العدد خالد بن معدان کتاب اختلاف العدد وکیع الفقیہ۔

یہ قدماء کی تصنیفات ہیں۔ متاخرین میں موصلی (نام نہیں معلوم) کی ذات الرشد۔ اور ابو معشر عبد الکریم بن عبد الصمد الطبری المتوفی ۴۷۸ھ کی تعداد الآی القرآن وغیرہ اسی فن کی کتابیں ہیں۔

* * *

پھر واقدی

امام زہری پر الزام

پروفیسر گولیم (درہم یونیورسٹی) انگلینڈ
کا خط
بنام اڈیٹر اسلامک ریویو ووکنگ

جناب من!

میں اسلامک ریویو کا باقاعدہ اور مستقل پڑھنے والا ہوں۔ فاضل سید سلیمان صاحب ندوی کے مضمون سے جو واقدی پر شایع ہوا ہے مجھے نہایت دلچسپی ہوئی۔ کیا میں یہ درخواست کرسکتا ہوں کہ آپ میرے اس خط کو مزید آگاہی کے لئے شایع کردیں جو حسب ذیل سوالات پر مشتمل ہے

اول وہ کیا اصول ہے جسکی بنا پر واقدی کی صداقت رد کیجاتی ہے مہربانی کرکے مجھے یہ کہنے دیجئے کہ میں مذہبی گروہوں کے اس حق کے خلاف

لڑنا نہیں چاہتا کہ وہ ان تحریروں کو جو میرے نزدیک لائق قبول نہ ہوں، مستند ماننے سے انکار کر دیں بلکہ میں وہ اصول جاننا چاہتا ہوں جو کسی مصنف کے رد و قبول پر حاوی ہے۔ میں یقیناً جرح و تعدیل کے عظیم الشان لٹریچر اور مناولہ وغیرہ کے مسائل سے واقف ہوں لیکن واقدی ایک مورّخ تھا۔ دینیات کا مصنف (تھیالوجین) نہ تھا اور یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ وہ نیک اور ولی نما بخاری کی موت سے ۵۰ سال پہلے وفات پا چکا تھا۔

یہ بھی آپ کے خیال سے دور نہ رہا ہوگا کہ وہ سندیں جو واقدی کی نسبت عمدہ رائیں ظاہر کرتی ہیں وہ اُن سے جو اُس کی تنقیص کرتی ہیں ایک نسل مقدم ہیں۔

پھر آپ کے فاضل مضمون نگار نے لکھا ہے کہ ہم کو واقدی کو معتبر ثابت کرنے کے لئے ایک انشاپرداز، ایک جغرافیہ داں یا ایک مورخ کی شہادت منزل تک نہیں پہنچا سکتی ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیوں نہیں پہنچا سکتی ہے اور ہم کیوں ابتدائے اسلام کے ممتاز مصنفوں، جغرافیہ دانوں اور مورخوں کے فیصلوں کو اس عجلت کے ساتھ چھوڑ دیں۔ کیا واقدی کی تصنیف اسی طرح ان اشخاص کو اپنی رائے زنی کے لئے دعوت نہیں دیتی۔ اور کیا اسکا فیصلہ صرف مذہبی علما (تھیالوجین) کی رایوں سے ہوگا۔

یہ نہ سمجھیے کہ میں یہ سوالات مناظرہ کے لیئے کر رہا ہوں بلکہ زیادہ تر میں یہ سوالات اپنی زیر تالیف "روایات اسلام" کے چوتھے باب کے متعلق معلومات تلاش کرنے کے لئے کر رہا ہوں۔ میرے خیال میں ابوحاتم کا واقدی کی

نسبت بری رائے ظاہر کرنا درحقیقت موضوع سے خارج ہے۔ پھر ابراہیم حربی نے واقدی کے طرز تحریر یعنی ہر واقعہ کی الگ سند لکھے بغیر روایت کی مدافعت کی ہے۔ یہ ایسا طرز تحریر ہے جو یاد رہے کہ واقدی کی وفات کی ایک نسل بعد تک کم وقعت نہ تھا۔ کیونکہ زہری اور ابن اسحاق ان دونوں نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔ آپکے فاضل مضمون نگار نے یہ جواب دیا ہے کہ زہری اور ابن اسحٰق کی سطح واقدی سے بلند تر ہے لیکن کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ کیوں؟ میں جانتا ہوں کہ علمائے مذہب (تھیالوجینس) کی نظر میں انکی زیادہ وقعت ہے لیکن مغازی میں انکی وقعت کیوں زیادہ ہے؟ کیا یہ فراموش کر دیا گیا ہے کہ زہری نے خود اقرار کیا ہے کہ انھوں نے دباؤ سے مجبور ہو کر جھوٹی حدیثیں بنائی ہیں۔ اکرھنا علیہ ھولاء الامراء (اس پر ہم کو ان بادشاہوں نے مجبور کیا) پھر بہت سے مصنفین نے صحیحین کی حدیثیں بھی رد کر دی ہیں اور نیز یہ کہ بخاری کے راویوں میں سے ایک ابوہریرہ بھی ہیں جو روایت کرتے ہیں کہ چاند پھٹ گیا تھا (شق القمر) اس بنا پر کوئی اس خیال سے باز نہیں رہ سکتا کہ کوئی قوی سبب اسکا نہیں ہے کہ واقدی کو بخاری کے فیصلہ کی بنا پر رد کر دیا جائے۔

اسلام کے ایک سچے طالب علم ہونے کی حیثیت سے میں نہایت مشکور ہونگا کہ اگر سید صاحب یا کوئی دوسرا فاضل مجھکو وہ اصول بتائے جسکی بنا پر کسی ابتدائی مسلمان کی شہادت قبول یا رد کی گئی ہے۔

آپ میرے ساتھ اتفاق کرینگے کہ جب کسی شخص کے خود معاصرین اسکو

اصلی سند تسلیم کریں تو یہ مشکل مناسب ہوگا کہ بعد کی نسل کے علمائے مذہب (تھیالوجینس) کی بلا دلیل روایتی بنا پر اسکو جھوٹا کہکر بدنام کیا جائے

آپ کا مخلص
الفریڈ گیلیم
پروفیسر عربی ڈرہم یونیورسٹی انگلینڈ

جواب

پروفیسر موصوف کے ان سوالات کو پڑھ کر سب سے پہلے اس بات کی خوشی ہوتی ہے کہ ہمارے فاضل مستشرقین کی علمی تحقیق کا دائرہ روز بروز وسیع ہوتا گیا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ سیرۃ نبوی پر لکھنے کے لیے تنہا ابو الفدا ایک ماخذ انکے سامنے تھا۔ اس کے بعد واقدی اور پھر ابن سعد اور ابن اسحاق کی باری آئی یہاں تک کہ پروفیسر مارگولیتھ نے اسکا سب سے بڑا ماخذ حدیث کو قرار دیا اور خصوصاً ابن حنبل کی ضخیم جلدوں کو لیکن ابھی تک اسکی کسر تھی کہ اصول سے کسی واقعہ کی تنقید میں اصول روایت سے کام نہیں لیا۔ مگر کیا پروفیسر گیلیم کے ان سوالات سے یہ خوشخبری نہیں معلوم ہوتی کہ وہ اب ہمارے ان اصول وضوابط کو بھی جاننا چاہتے ہیں جن پر اسلام کی ابتدائی روایتوں کی تنقید کی اصلی بنیاد قائم ہے۔

دنیا میں صرف مسلمان ہی وہ قوم ہے جس نے واقعات و روایات کی

تنقید و تصحیح کے لئے اصول و ضوابط قائم کئے اور اس سلسلہ میں اصول حدیث
اسماء الرجال۔ علم الجرح والتعدیل۔ اختلاف الحدیث اور اسناد وغیرہ متعدد
فنون کی بنیاد ڈالی۔ اسی کے ساتھ درایت کے اصول اور نقد کے قوانین بنائے
اور ان پر صدہا کتابیں لکھیں اور وہ ہماری مشرقی درسگاہوں کے نصاب تعلیم کا
ایک جزو ہیں۔ اور محض عربی زبان کی ادبی واقفیت ان مشکلات کی گرہ
کشائی نہیں کرسکتی۔

مسلمانوں میں اس فن کی نظر سے واقعات کی تنقید دو پہلوؤں سے کی
جاتی ہے جن میں سے ایک اصول روایت اور دوسرا اصول درایت ہے۔ روایت
کے مختصر اصول یہ ہیں کہ شروع سے آخر تک واقعہ کے ناقل اور راوی معتبر اور
ثقہ ہوں۔ پہلا راوی یا خود واقعہ کے وقت موجود اور اسکا عینی شاہد ہو۔ یا
کسی شریک واقعہ اور عینی شاہد سے اس نے خود سنا ہو یا اُسکے متعلق یہ تجربہ
سے ثابت ہو کہ وہ ہمیشہ عینی شاہدوں سے سن ہی کر اس قسم کی روایتیں کیا کرتا
ہے پھر یہ کہ ہر راوی یہ اقرار کرے کہ اس نے خود دوسرے راوی یعنی اپنے
پیشرو راوی سے یہ سنا ہے۔ یا یہ ثابت ہو کہ وہ اس سے عمر میں ایک دفعہ بھی
کم از کم ملا ہے۔ یا یہ کہ وہ دونوں کم از کم ایک زمانہ میں موجود تھے اور ایک
کی دوسرے سے سماعت ممکن ہے۔ اول سے اخیر تک سند کی کڑی متصل اور
ملی ہو۔ کہیں سے ٹوٹی نہ ہو یعنی بیچ کا راوی کوئی نامعلوم نہ ہو۔

درایت کے مختصر اصول یہ ہیں کہ جو واقعہ بیان کیا جاتا ہے وہ دیگر مستند
تاریخی بیانات کے مخالف تو نہیں ہے کسی دوسری صحیح تر شے سے اسکے

خلاف کوئی ایسی شہادت تو موجود نہیں ہے جو اسکی تکذیب کرتی ہو۔ راوی جیسے مطلب سمجھتے ہیں تو کوئی غلطی نہیں ہوئی ہے۔ راوی نے کوئی ادھوری بات تو نقل نہیں کی ہے۔ اسلام کے مسلمہ متیقنہ اور معروف اصول کے خلاف تو نہیں ہے۔

یہ اس فن کی مختصر دفعات ہیں جن پر اسلام کی ابتدائی تاریخ و احکام کی نقل و روایت کی بنیاد قائم ہے۔ اسلام کے ابتدائی مصنفین نے خواہ وہ علمائے حدیث ہوں علمائے مغازی ہوں یا علمائے تاریخ ہوں انھیں اصول کی پیروی جہانتک زیادہ کی ہے وہیں تک انکی تصنیفات امت کے نزدیک زیادہ قابل قبول ہوئی ہیں اسی بنا پر امام بخاری کی جامع صحیح کا۔ پھر امام مسلم نیشاپوری کی کتاب کا پھر علی الترتیب اسی طرح حدیث کی دوسری کتابونکا ترتیبی درجہ ہے۔

امام بخاری نے اپنی کتاب میں کوئی ایسی روایت متن کتاب میں نقل نہیں کی ہے جس میں کے ہر ایک راوی نے دوسرے راوی سے اپنی ملاقات اور سماعت کا اقرار نہیں کیا ہے۔ امام مسلم نے ایسے راویوں کی روایتیں بھی قبول کرلی ہیں جن کی باہمی ملاقات اور سماعت کا کوئی ثبوت نہ ہوا اور صرف اتنا ثابت ہو کہ وہ دونوں ایک عہد اور ایک زمانہ میں موجود تھے۔ اس بنا پر ہر منصف مزاج یہ یقین کریگا کہ روایات اور وقائع کے تمام دفتر میں صحیح بخاری سے بڑھکر کوئی کتاب نہیں اور اسی سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ صحیح مسلم کا درجہ صحیح بخاری کے بعد کیوں قرار دیا گیا ہے۔ دوسری کتابوں کے مصنفین نے اپنا اصول یہ قرار دیا ہے کہ وہ ہر اس واقعہ کو قبول کرتے ہیں جسکی نسبت علما کا یہ فیصلہ ہے کہ وہ موضوع

جھوٹا اور بنایا ہوا نہیں ہے اور ہر اس راوی کو قبول کیا ہے جس کو علماء نے جھوٹا، کاذب اور دروغ گو نہیں کہا ہے۔ نیچے درجے کے مصنفین نے اس کو بھی برقرار نہیں رکھا ہے بلکہ ہر جھوٹی سچی روایت کو قبول کر کے اپنی کتابیں بھر دیا ہے اس لئے اسی ترتیب سے ان کی کتابوں کے بھی اہل فن نے درجے مقرر کر دیئے ہیں۔

جو کتابیں مغازی اور سیرۃ پر لکھی گئی ہیں ان میں ان اصولوں کا عموماً بہت کم لحاظ رکھا گیا ہے تاہم ان اصولوں کی پابندی اور خود مصنفین کی ذاتی حیثیت کی بنا پر مغازی کی کتابوں میں سب سے اول امام زہری کی مغازی کو جگہ دی گئی تھی۔ اور اسکی عدم موجودگی میں انکے شاگردوں میں سے موسیٰ بن عقبہ کی مغازی کا رتبہ ہے اور اسکے بعد ان کے ہم درس محمد بن اسحٰق کا درجہ ہے اور واقدی کے لئے اس دربار میں وہی جگہ رکھی گئی ہے جو اسی کے ہم رتبہ کسی حدیث کی کتاب کے مصنف کا پایہ محدثین میں ہے۔

پروفیسر صاحب کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ علمائے اسلام کی جماعتی یا فن وار تقسیم سے ناآشنا ہیں اور یقیناً کسی بیرونی قوم کے افراد کو دوسری قوم کے مذہب، علوم اور زبانوں کی اصطلاحات کا سمجھنا اس بنا پر مشکل ہوتا ہے کہ وہ بچپن سے اس ماحول سے باہر پلے ہیں۔ اور ان کی واقفیت کا ذریعہ محض کتابیں ہیں اور ان چیزوں کے پوری طور سے سمجھنے میں اس قوم کی زبان کی محض ادبی واقفیت پوری معین نہیں ثابت نہیں ہوتی اسلئے

لامحالہ وہ شخص دوسری قوم کی اصطلاحات، خیالات اور ماحول کو اپنی قومی اصطلاحات، خیالات اور ماحول کے مطابق کر کے سمجھتا ہے۔

ہمارے پروفیسر صاحب نے اپنے خط میں دو قسم کے نام لیے ہیں۔ ایک کو وہ تھیالوجین یعنی علمائے الٰہیات اور دوسرے کو مؤرخین اور اصحاب مغازی کہتے ہیں لیکن اسلام میں یہ کوئی تقسیم نہیں ہے۔ اور ہمارے یہاں علمائے الٰہیات، عام علماء سے کوئی الگ نہیں ہیں۔ یہاں پر علماء کی تقسیم تھیالوجی (الٰہیات) کی بنا پر نہیں ہے بلکہ "روایت" کی بنا پر ہے اسلئے وہ تمام اشخاص جو کسی قسم کی نقل روایت کرتے ہیں ایک جنس میں داخل ہیں اور انکا نام "علمائے نقل" ہے اور دوسرے "علمائے عقل" ہیں جنکا یہاں کوئی تعلق نہیں۔

علمائے نقل یعنی وہ تمام اشخاص جو کسی حکم یا واقعہ کو نقل اور روایت کرتے ہیں انکے اس حکم یا واقعہ کی حیثیت کی بنا پر مختلف نام ہیں مثلاً وہ اشخاص جو آنحضرت صلعم اور عہد اول کے ہر قسم کے احکام و واقعات کی نقل و روایت کی خدمت انجام دیں وہ "محدث" کہلاتے ہیں اور جو صرف آنحضرت صلعم کے سوانح ذاتی اور واقعات اور اخلاق کا ذکر کریں وہ اصحاب سیرۃ ہیں اور جو آپ کے صرف اخلاق و عادات کو نقل کریں وہ اصحاب شمائل ہیں اور جو صرف غزوات اور ان کے متعلقات کو بیان کریں وہ اصحاب المغازی ہیں بہرحال محدث یا صاحب سیرۃ یا صاحب شمائل یا صاحب المغازی یہ کل کے کل گو مضامین متعلقہ کی حیثیت سے الگ الگ ناموں سے موسوم ہیں لیکن روایت کی حیثیت سے ان سب کا (ایک ہی) درجہ ہے یعنی یہ سب اصحاب

روایت اور علمائے نقل ہیں۔ اور تمام اصحاب روایت اور علمائے نقل ایک ہی ترازو کے پلڑے میں تولے جائینگے۔

اس بنا پر جو شخص بھی اسلامی روایات کا کوئی ٹکڑا بھی کسی سے نقل کر کے بیان کریگا خواہ وہ دینی احکام و فرائض سے متعلق ہو خواہ پیغمبر اسلام علیہ السلام کی ذات گرامی سے منسوب ہو، خواہ وہ صرف واقعات اور لڑائیوں کے بارہ میں ہو خواہ وہ آپ کے اخلاق و عادات سے تعلق رکھتا ہو اس کے لئے اس بات کے ثبوت کی ضرورت ہے کہ وہ حقیقتاً ایسا ہی ہے۔ عقل انسانی میں پچھلی نسلوں یا غائب اشخاص کو اس حکم یا واقعہ کا علم صرف روایت ہی کے ذریعہ ہو سکتا ہے اور یہی ایک ذریعہ ایک انسان کے ہاتھ میں ایک سے دوسرے تک بات کے پہنچانے کا ہے اور تمام دنیا کے وقائع اور حوادث کے علم کا مدار صرف تاریخ پر ہے۔

اسلامی اور غیر اسلامی روایات میں فن کی حیثیت سے یہی سب سے بڑا اور ممتاز فرق ہے کہ غیر مسلم قوموں نے اپنے انبیا اور بزرگوں کے اقوال اور افعال کی روایتوں کی جانچ اور پڑتال کے متعلق کوئی اصول مدون نہیں کیا ہے۔ اور مسلمانوں نے اس کے لئے بہت سے اصول مدون اور منضبط کئے ہیں اور اسی معیار پر غلط اور صحیح سچی اور جھوٹی روایت کو وہ پرکھتے ہیں۔ مثلاً عرض ہے کہ ہمارے عیسائی بھائیوں کے یہاں ان چار مشہور انجیلوں کے علاوہ اور بہت سی انجیلیں ہیں مگر انھوں نے چار کو مسلم مان کر بقیہ کو جعلی اور ناقابل تسلیم قرار دیا مگر ہمیں وہ اصول نہیں معلوم جن کی بنا پر اس جھوٹ اور سچ صحیح اور جعلی میں فرق کیا جا سکے لیکن مسلمانوں کے پاس اس کے جانچنے کے لئے

وہ فن ہے جسکا نام اصول ہے اور جسکی متعدد شاخیں ہیں۔

آج تنقیدی تاریخ کے فن نے یورپ میں بے انتہا ترقی کی ہے۔ اور ابن خلدونؒ کے بنیادی فلسفۂ تاریخ نے یورپ جاکر عظیم الشان برگ و بار پیدا کیا ہے اور اس امر پر بڑا زور صرف کیا جاتا ہے کہ اس تاریخ کا فلاں واقعہ فطرت، مقتضائے عہد اور اس زمانہ کے ماحول کے لحاظ سے ممکن بھی ہے یا نہیں؟ غرض درایت کے نقطۂ نظر سے کوئی پہلو جدید یورپ کے نقاد مورخین کی محققانہ نگاہ سے اوجھل نہیں ہونے پاتا لیکن یہ پہلو کہ اس واقعہ کو کس نے دیکھا؟ کس نے سنا؟ ہم تک کس واسطے سے پہنچا؟ کبھی معرض بحث میں نہیں آتا۔ آج یورپین مقننین اور عدالتوں نے حوادث اور واقعات میں **شہادت** کی حیثیت کو جو اہمیت دی ہے وہ مخفی نہیں ہے اور شاہدوں اور گواہوں کی وقعت، یورپین اخلاق عینی شہادت اور سچائی کو ہر طرح سے جانچنے کی انتہائی کوششیں کی جاتی ہیں پھر یہ کیا ظلم ہے کہ موجودہ واقعات کی تحقیق کے سلسلہ میں تو شاہدوں اور گواہوں کے متعلق یہ احتیاط برتی جائے اور گذشتہ واقعات کے قبول و رد میں اسکے بالمقابل شہادت کے تمام اصول کو بالائے طاق رکھ دیا جائے اور سچے اور جھوٹے میں کوئی تفریق نہ کی جائے نہ اسکی تلاش و جستجو کی جائے۔

حدیث و روایت بھی دنیا کے ہزاروں علوم و فنون میں سے ایک فن ہے ہر علم و فن کی طرف جو لوگ منسوب ہیں یا جو کسی علم و فن کی آگاہی اور واقفیت کے مدعی ہیں ہر شخص جانتا ہے کہ ان سب کا درجہ برابر نہیں ہوتا۔ بہت سے ان میں محض فن کے آشنا اور اس علم کے محض ابجد خواں اور حرف شناس ہیں

دوسروں کی حالت ان سے بہتر ہوتی ہے۔ بعض کا درجہ بہت بلند ہوتا ہے اور چند ان میں سے ایسے باکمال بھی ہوتے ہیں جو اس علم یا فن کے محقق اس کو ترقی دینے والے، اسکے تمام حقائق اور اسرار کے کامل ماہر ہوتے ہیں اور اسکا فیصلہ کہ اسکو اس علم یا فن میں نقص یا کمال کا کون سا درجہ حاصل ہے اس علم و فن کے متعلق اسکے کارنامے، اسکے ہم عصر و ہم پیشہ فضلا کی رائیں اور اس زمانہ کے قبول عام کی نگاہیں اسکو نمایاں کر دیتی ہیں اور بالآخر انکو اس علم و فن کا معیاری درجہ اور رتبہ حاصل ہو جاتا ہے۔ ہر عہد اور ہر زمانہ میں علم و فن کی ہر شاخ میں اسکی ہزاروں مثالیں گذر چکی ہیں اور گذر رہی ہیں گذشتہ اور موجودہ علماء اور مصنفین کے اعتبار، استناد اور صحت نقل کا پیمانہ اسی معیار پر قائم ہے۔

یہی اصول اسلامی روایات کے حاملین اور ابتدائی مسلمان مصنفین کے فرق مراتب اور امتیازات میں قائم ہے اور جن کی بنا پر مالک۔ بخاری۔ مسلم۔ ترمذی۔ ابوداؤد۔ نسائی۔ ابن حنبل۔ ابن ماجہ۔ ابن اسحاق۔ واقدی۔ ابن سعد۔ ابن ہشام۔ طبری۔ دیلمی۔ کلبی وغیرہ ابتدائی مسلمان مصنفین کی کتابوں میں مراتب اور درجات ہیں۔

ہر علم و فن کے مسائل کے متعلق اسی کے جاننے والوں اور محققوں کی رائے معتبر ہو سکتی ہے۔ ایک عالم لغت کی رائے کیمسٹری کے کسی مسئلہ کی نسبت، یا ایک جغرافیہ داں کی رائے طب کے متعلق۔ ایک ادیب کی رائے مابعد الطبیعیات کے بارہ میں یا ایک محدث کی رائے ہیئت کے کسی مسئلہ کے فیصلہ میں بالکل بے سود ہے۔ مسلمان

علماء اور حکماء میں اسکی مثالیں ڈھونڈھیے۔ ابوالقاسم حریری سے ریاضیات کی نسبت اور موسیٰ خوارزمی سے مقامات کی نسبت سوال بیکار ہوگا۔ ابو علی سینا سے حدیث کی تحقیق اور امام بخاری سے طبعیات کے مسائل حل نہیں کیے جا سکتے اس بنا پر بالکل صاف ہے کہ حدیث و روایت نبوی کی تحقیق میں ایک انشاپرداز جغرافیہ داں اور محاضرات نویس کی رائے کیوں معتبر نہیں جس طرح گبن کا کام نیوٹن سے نہیں لیا جا سکتا ہے اسی طرح ابن حجر کا کام یاقوت سے نہیں لیا جا سکتا اور نہ یاقوت کا کام ابن حجر سے لیا جا سکتا ہے اور اسلیے یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ ہمکو واقدی کو معتبر ثابت کرنے کیلئے ایک انشاپرداز، ایک جغرافیہ داں اور ایک مورخ (یاقوت مورخ نہیں سوانح نگار تھا) کی شہادت منزل تک نہیں پہنچا سکتی۔

اسکے فیصلہ میں یہ صحیح نہیں ہے کہ تھیالوجین (عالم الٰہیات) اور غیر تھیالوجین کے تعصب کی دیوار حائل ہے۔ بلکہ فن کی واقفیت اور تحقیق کی دیوار حائل ہے کسی شہر کی جائے وقوع اور اسکے نام کی صحت کے بارے میں ابن خرداذبہ، مقدسی، مسعودی، ادریسی اور یاقوت جغرافیہ دانان اسلام کی جو رائے ہوگی اسکے مقابلہ میں امام بخاری، امام مسلم، امام احمد بن حنبل، خطابی اور ابن حجر کی رائے قابل تسلیم نہ ہوگی۔ یہ بالکل ایک کھلا مسئلہ ہے اسلیے آپ کی یہ حیرت کہ "ہم کیوں ابتدائے اسلام کے ممتاز مصنفوں، جغرافیہ دانوں، اور مورخوں کے فیصلوں کو اس عجلت کے ساتھ چھوڑ دیں۔ کیا واقدی کی تصنیف اسی طرح ان اشخاص کو اپنی رائے زنی کے لیے دعوت نہیں دیتی اور کیا اسکا فیصلہ صرف مذہبی علماء (تھیالوجینس) کی

راویوں سے ہوگا؟" دور ہوجائے گی۔

اب میں آپ کے اس سوال پر آتا ہوں کہ "وہ کیا اصول ہے جسکی بناپر واقدی کی صداقت رد کی جاتی ہے۔ وہ اصول عرض کرنا چاہتا ہوں جو کسی مصنف کے رد و قبول پر حاوی ہے۔ پہلے گذر چکا ہے کہ ہر علم و فن کے فضلاء اور محققین کے کارنامے معاصرانہ شہادتیں، اس علم و فن کے ساتھ اسکا شغف و شوق اور کاوش و تحقیق انکے مرتبہ اور درجہ کو متعین کردیتی ہے اور ایک ناآشنائے فن عطائی، مدعی محض آشنا، عالم، فاضل اور محقق کامل کے متفاوت درجوں کی تعیین کردیتی ہے۔ یہی حال سلسلہ روایت اور اسناد کے واقفوں عالموں اور محققوں کے رتبوں اور درجوں کی تعیین اور تشخیص کا ہے۔ امام بخاری کے سامنے بغداد میں روایات کے دس متفرق سلسلے باہم الٹ پھیر کر امتحاناً پیش کئے جاتے ہیں۔ وہ بہ ترتیب ان سلسلوں کو اپنی اپنی جگہ رکھ کر پیش کردیتے ہیں اور علماء کا مجمع انکی حیرت انگیز یادداشت اور حافظہ کو دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہے۔ اس بناپر اس فن میں امام بخاری کا جو درجہ ہوگا وہ اس واقدی کا نہیں ہوسکتا جسکو اپنی کسی روایت کی پوری سند بھی نہیں معلوم۔

اول نفس مصنفین کو لیجئے۔ فضل و کمال۔ دیانت تقوی، حفظ و یادداشت، فہم و استنباط کے لحاظ سے ان میں بہت کچھ فرق ہوتا ہے۔ پھر آپ کو معلوم ہے کہ کم از کم ایک دو نسل تک اسلامی روایات کا بڑا حصہ زبانی کتاب کے سبقوں کی طرح رٹ کر یاد کیا جاتا تھا اسلئے راویوں کی قوت حافظہ کا امتحان بھی ضروری تھا۔

اب اسلامی فن روایت کے اصول کی بناپر کسی مصنف کی کتاب میں کسی واقعہ کے

مستند طور سے درج ہونے اور اسکے معتبر ہونے کیلئے یہ ضروری ہے کہ:۔

۱۔ مصنف خود معتبر۔ ثقہ۔ دیانتدار اور صادق القول اور اپنی روایتوں کے تمام سلسلوں سے واقف ہو اور اپنے راویوں کے انتخاب میں اس نے پوری کوشش کی ہو اور کامیابی حاصل کی ہو۔

۲۔ اسکی ہر روایت کا سلسلہ سند ہو۔

۳۔ اسکی روایت کا ابتدائی راوی واقعہ کا عینی شاہد ہو یا کسی عینی شاہد سے اسکے سننے کا کافی ثبوت ہو۔

۴۔ واقعہ کے شاہد عینی سے لیکر مصنف تک ہر دور کے راوی کی کڑی موجود ہو۔

۵۔ ہر دور کے راوی کی نسبت یہ بھی معلوم ہو کہ وہ ثقہ معتبر اور صادق تھا۔

۶۔ ہر دور کے راوی کی نسبت یہ ثابت ہو کہ اسنے پیشرو سے سنا ہے اور یا کم از کم یہ کہ یہ دونوں ایک زمانہ میں موجود تھے۔

یہ چند اصول ہیں جو ایک ایسے مختصر مضمون کی چند سطروں میں بیان کیئے جاسکتے ہیں اس معیار پر ہم بخاری اور واقدی کی روایتوں کو جانچتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ بخاری کے تمام معاصرین بالاتفاق اسکو ثقہ، معتبر، صادق، متدین اور روایت کے اشخاص اور رجال کا سب سے بڑا پرکھنے والا کہتے ہیں اور دوسرے کے اکثر معاصرین اسکو جھوٹا، کاذب اور دروغ گو اور روایت کے اشخاص رجال سے اسکو نابلد محض کہتے ہیں نتیجہ ظاہر ہے۔

اب ان دونوں کے راویوں کا حال دیکھتے ہیں تو پاتے ہیں کہ بخاری اپنی ہر روایت کے شروع سے اخیر تک راویوں کو نام بنام گناتے ہیں اور ان میں سے اسکے

ہر دور کا راوی اپنے زمانہ کا مشہور و معروف متدین، راست باز اور معتبر تھا۔ دوسری طرف واقدی کے یہاں سرے سے یہی معلوم نہیں کہ اس نے واقعہ کو کس سے سنا؟ اس نے کس سے کہا اور اسکا شاہد عینی کون تھا؟ ہر منصف مزاج روایت کے دونوں مصنفوں کے بیانات کے رد و قبول کا بہ آسانی فیصلہ کر سکتا ہے۔

واقدی نے اگر کہیں کہیں ایک دو راویوں کے نام لکھے بھی ہیں تو وہ غیر مشہور نامعتبر یا مجہول ہیں اور بخاری کا ہر راوی اپنی جگہ پر معاصرین میں مسلم الثبوت اور اہل فن کے نزدیک مستند رہا ہے۔ پھر نفس واقعہ اور اسکی تفصیلات کو دیکھتے ہیں تو ثابت ہوتا ہے کہ بخاری کے بیان کی تصدیق دوسری معاصر و مماثل روایتوں کی تائید سے بھی ہوتی ہے اور واقدی کے خاص بیان کی تائید کسی معاصر سے نہیں ملتی۔ اس قسم کی متعدد مثالیں جب دو مصنفوں میں ملینگی تو ضرور ایک کو مستند اور دوسرے کو غیر مستند قرار دیا جائے گا۔ یہ اصول ہے جسکی بنا پر ایک مصنف کو قبول اور دوسرے کو رد کیا جاتا ہے۔

جس طرح دوسرے علوم و فنون کے ممتاز و مستند محققین ہر زمانہ میں ہوتے رہے ہیں اسی طرح اسلامی علم روایت کے ممتاز و مستند محققین بھی ہر دور میں گذرتے رہے ہیں جن کا تدین، جن کی ثقاہت، جنکا علم و فضل خود انکے کارناموں علمی کاوشوں، انکی زندگیوں کے سوانح اور انکے معاصرین کی شہادتوں سے ثابت ہے۔ اور جنھوں نے اپنی پوری زندگی، اور زندگی کا ہر لمحہ روایتوں کی تحقیق، راویوں کی چھان بین، رجال کی تلاش و تفتیش میں بسر کیا اور انکے عہد کے انسانوں نے انکے تدین، تحقیق اور فضل و کمال پر بھروسہ کیا۔ ان کی

تحقیقات اور بیانات اس عہد کے راویوں کے متعلق معیار قرار پائے۔

اور چونکہ مختلف اشخاص کے متعلق انکے مختلف واقف کاروں کے تجربے کبھی کبھی مختلف بھی ہوتے ہیں اسلیے راویوں کے متعلق مختلف رائیں بھی ہیں ان رایوں کی صحت کا معیار خود ان اصحاب رائے کا فضل و کمال ہے۔ اور یہ اختلاف رائے خود علم اسماء الرجال کی صداقت کی دلیل ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ واقعی مختلف اشخاص کے ذاتی تجربوں پر قائم ہے۔ اگر ان میں بجائے اختلاف کے یکسانی ہوتی تو اول تو یہ اشخاص کے متعلق نقد و تجربہ کی غیر فطری مثال ہوگی۔ دوسرے اس سے شبہہ پیدا ہو سکتا تھا کہ یہ ایک جعلی، بناوٹی اور متفقہ جھوٹ ہے۔ اس بنا پر کسی راوی کے متعلق اگر مختلف ناقدین کی مختلف رائیں ہوں تو ان رایوں میں سے کسی ایک پہلو کی ترجیح کیلئے حسب ذیل اصول ہیں۔

۱۔ معاصر ناقدین کی اکثریت کدھر ہے؛

۲۔ مختلف رتبوں کے ناقدوں میں سے اعلیٰ درجہ کے مستند ناقدین کس طرف ہیں؟۔

۳۔ عام ناقدین کی اکثریت کس طرف مائل ہے؟

کسی راوی کے متعلق متاخر عہد کے غیر معاصر ناقد جب اپنی رائے دیتے ہیں تو اسکی بنیاد حسب ذیل چیزوں پر ہوتی ہے۔

۱۔ راوی کی موجودہ روایات کے ذخیرہ کی نوعیت کیا ہے؛ اور زیادہ تر اس میں معروف یا منکر کس قسم کی باتیں ملتی ہیں۔

۲۔ دوسرے مستند لوگوں کے بیانات سے اسکا بیان کہاں تک مطابق

یا مخالف ہے۔

۳۔ اس مختلف فیہ راوی کے معاصر فضلا کی رائیں اسکے متعلق کیا ہیں اور اگر وہ مختلف ہیں تو ان میں مشہور و معروف ناقدین کدھر ہیں یا انکی کثیر تعداد کس جانب ہے۔

۴۔ متاخر ناقد نے گو خود اس راوی کو نہیں جانچا مگر اسکے متعلق اسنے اپنے شیوخ کی زبان سے سنا جو اس راوی کے معاصر تھے۔

اس تفصیل سے واضح ہوگا کہ "واقدی کے متعلق پچاس برس بعد امام بخاری کیونکر اپنی رائے ظاہر کر سکتے ہیں"

واقدی کے متعلق ابو حاتم رازی کی رائے موضوع سے خارج ہے۔ ابو حاتم کا منشا یہ ہے کہ واقدی کے ہمعصر محدثین اور فضلائے روایت نے دیکھا کہ واقدی مدینہ کے نامعلوم اور غیر معروف راوی جن کے حالات سے واقفیت نہیں ان سے روایت کیا کرتا ہے۔ اور ایسی روایتیں کرتا ہے جو منکر ہیں یعنی کسی ثقہ اور معتبر راوی کے بیان سے انکی تائید و تصدیق نہیں ہوتی اور نہ جن کو ہم جانتے ہیں اب ایسی حالت میں یہ اشتباہ ہو سکتا تھا کہ ممکن ہے کہ یہ منکر اور غیر مصدقہ روایتیں خود واقدی نے گھڑلی ہوں اور دوسرے غیر معروف شیوخ کی طرف انکو منسوب کر دیا ہو یا یہ کہ یہ جھوٹی روایتیں انھیں غیر معروف شیوخ کی ساختہ ہوں اور واقدی نادانستگی میں ان کو لے کر بیان کیا کرتا ہے۔ شک کے ان دونوں پہلوؤں میں سے ایک کی تعیین واقدی کے ہمعصر فضلا نے اس طرح کی کہ دیکھا کہ وہ مشہور و معروف اساتذہ جو اس قسم کی منکر روایتیں ہرگز نہیں کرتے اور نہ انھوں نے کی۔

واقدی ان سے بھی اس قسم کی روایتیں علانیہ انکی طرف نسبت کر کے کیا کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ ان لغو و مہمل اور غیر مصدق روایتوں کے گھڑنے کا کارخانہ خود اسی کے گھر میں قائم تھا۔

کیا یہ موضوع بحث سے خارج رائے ہے؟

ابراہیم حربی جنھوں نے واقدی کی حمایت کی ہے اور کہا ہے کہ:۔

"مفصل سند کے بغیر روایت کرنا اگر جرم ہے تو امام زہری اور محمد بن اسحق بھی اس سے بری نہیں"۔

میں نے اپنے گزشتہ مضمون میں اسکے دو جواب دیئے ہیں:۔

۱۔ زہری اور ابن اسحق، واقدی سے بہت زیادہ بلند ہیں اسلئے ان کی بلا سند بات بھی واقدی کی بے سند بات سے زیادہ وقیع ہے کہ واقدی کا جعل ساز ہونا ثابت تھا۔ اور وہ دونوں اس الزام سے قطعاً بری ہیں اور خصوصاً زہری تو امام الائمہ ہیں اور ابن اسحق گو ان سے بہت کم رتبہ ہیں۔ تاہم واقدی سے تو انکا پایہ بلند ہے۔

۲۔ زہری اور ابن اسحق نے ایسی بے سند بات کی کہیں کہیں مختلف سندوں کو ایک جگہ ملا کر روایت کی ہے۔ بقیہ ہر جگہ انھوں نے اپنی ہر بات اور ہر روایت کی الگ الگ سندیں ذکر کی ہیں۔ اور واقدی نے یہ کیا ہے کہ ایک جگہ کتاب کے آغاز میں سو پچاس آدمیوں کے نام اکھٹے کر کے باقی پوری کتاب بلا سند ایک کہانی اور ایک قصے کی طرح سنا دی ہے۔ اس لئے ان میں عظیم الشان فرق ہے۔

علاوہ ازیں اگر زہری اور ابن اسحٰق نے واقدی ہی طرح کوئی بے سند روایت کر دی ہے تو اس روایت کا درجہ بھی واقدی ہی کی روایت کے قریب ہوگا گو زہری اور واقدی کے ذاتی امتیاز اور فضل وکمال کا جو فرق ہے وہ اب بھی محسوس ہوگا۔ اور یہی وجہ ہے کہ مغازی کی کتابوں کا درجہ احادیث کی کتابوں سے نہایت فروتر ہے۔ واقدی ہی کی مغازی کی تخصیص نہیں مغازی کی ہر کتاب احادیث کی کتاب کے مقابلہ میں کم رتبہ ہے۔

پھر آپ میری نسبت کہتے ہیں کہ "آپ کے مضمون نگار نے یہ جواب دیا ہے کہ زہری اور ابن اسحاق کی سطح واقدی سے بلند ہے لیکن کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ کیوں؟" آپ یقیناً پوچھ سکتے ہیں۔ یہ سطح کا نشیب فراز اسلئے ہے کہ امام زہری کا کوئی جھوٹ ثابت نہیں ہوا۔ محمد بن اسحاق بھی اس الزام سے بری رہے ہیں۔ گو ان پر بے احتیاطی کے اور الزامات ثابت ہوں اور واقدی کی نسبت انکے معاصرین کا بار بار یہ تجربہ ہوا ہے کہ وہ جھوٹی اور گھڑ کر اور بے احتیاطی سے روایت کیا کرتا تھا۔ زہری ہمیشہ ایسے راویوں سے اپنی روایتیں کرتے ہیں جو اپنے عہد کے مشہور و معروف و ثقہ تھے۔ اور محمد بن اسحاق ان سے کم درجہ اور واقدی بالکل غیر معروف اور مجہول ہیں اور اس بنا پر ہر علم اور ہر فن کے واقف کار اور ماہروں کے تفاوت مدارج کی نسبت ہر زمانہ کے علما فیصلہ کیا کرتے ہیں اسی طرح زہری اور ابن اسحاق اور واقدی کی سطح کی بلندی اور پستی کا فیصلہ بھی انھیں نے کیا ہے تاہم سند کے لحاظ سے زہری کی بھی ہر قسم کی روایتیں یکساں نہیں ہیں اور ان کی بے سند روایت بھی مستند روایت کے مقابلہ میں چھوڑ دی

جائے گی یا کم لکھی جائے گی۔

آپ لکھتے ہیں کہ میں جانتا ہوں کہ علمائے مذہب (تھیالوجینس) میں انکی (زہری اور ابن اسحاق) کی وقعت زیادہ ہے لیکن مغازی میں انکی وقعت کیوں زیادہ ہے؟ اول عرض یہ ہے کہ زہری تو بلاشبہ ہر صنف روایت میں اعتبار و استناد کے بلند ترین درجہ پر ہیں۔ مگر ابن اسحاق کا یہ حال نہیں ہے وہ صرف مغازی میں مقبول ہیں۔ احکام میں دوسرے معتبر لوگوں کے مقابلہ میں انکی کوئی وقعت نہیں ہے۔ بہرحال آپ کا یہ سوال ہے کہ "مغازی میں زہری اور ابن اسحاق کی وقعت واقدی سے کیوں زیادہ ہے"؟ کئی دفعہ عرض ہو چکا کہ اسلامی اصول روایت میں مغازی اور غیر مغازی کا کوئی فرق نہیں ہے۔ وہ شخص جو آنحضرت صلعم کے متعلق کوئی بات نقل کرتا ہے اسکو اسی مقررہ اصول پر جانچا جائے گا خواہ وہ لڑائیوں کا حال ہو یا اخلاق کا بیان ہو یا کسی مذہبی حکم کا ذکر ہو۔ گو یہ سچ ہے کہ محدثین نے عملاً جانچ پڑتال کی وہ سختی اور شدت مغازی اور فضائل کے باب میں اتنی نہیں کی جو احکام کے باب میں کی اور اسکا انھوں نے علانیہ اقرار کیا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ مغازی اور فضائل میں کثرت سے لوگوں نے فضول اور لغو روایتیں شامل کر دی ہیں اور فن کے ناآشناؤں میں وہ مقبول ہیں اور عوام میں دل پسند ہیں۔

واقدی کی مدافعت میں تین باتیں کہی گئی ہیں:-

۱۔ واقدی کی ذات سے ایک نسل بعد کا طریقہ روایت یا طرز تحریر (یعنی حذف اسناد یا خلط اسناد کا طریقہ) قابل اعتراض نہ تھا۔

۲۔ امام زہری اور ابن اسحاق نے بھی ایسا ہی کیا ہے پھر وہ کیوں واقدی کے مقابلہ میں معتبر اور مقبول ہیں۔

۳۔ امام بخاری پر بھی لوگوں نے جرحیں کی ہیں پھر وہ کیوں غیر معتبر نہیں اور انکو اسکے بعد کیا حق رہتا ہے کہ وہ واقدی پر معترض ہوں۔

گو میں اپنے سابقہ بیانات میں ضمناً ان سوالات کا جواب دے چکا ہوں مگر براہ راست بھی دے دینا چاہتا ہوں۔

۱۔ یہ صحیح نہیں ہے کہ واقدی کی ایک نسل بعد تک یہ طرز تحریر یا طریقہ روایت قابل اعتراض نہ تھا۔ جن لوگوں نے واقدی کے اس طرز پر اعتراض کیا ہے وہ اسکے معاصر ہی تھے۔ اس سے ثابت ہوا کہ خود اسکے عہد میں یہ طرز ناپسندیدہ تھا۔ زہری اور ابن اسحاق کے طرز عمل سے اس پر استدلال کرنا صحیح نہیں ہے جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے اور آگے پھر لکھتا ہوں۔

۲۔ زہری نے کہیں کہیں ساری روایتوں میں دس پانچ جگہ ایسا کیا ہے۔ ابن اسحاق نے اس سے زیادہ ایسا کیا ہے لیکن واقدی نے اپنی پوری کی پوری کتاب اسی طرز پر لکھ ڈالی ہے۔ اسلئے اگر زہری اور ابن اسحاق کی صرف چند روایتیں جو اس طرز پر ہیں قابل اعتراض ہیں تو واقدی کی پوری کتاب قابل اعتراض ہے واقدی نے جہاں جہاں سندیں لکھی ہیں انکے کہیں ایک جگہ بھی اصولاً اخیر شاہد عینی تک پہونچانے کی کوشش نہیں کی ہے یہانتک کہ زہری کی روایتوں کا بھی اس نے یہی حال کیا ہے۔

زہری باوجودیکہ امام الائمہ اور تمام محدثین کے شیخ اعظم ہیں تاہم ان کی

مرفوع ومتصل روایتوں کا جو مرتبہ ہے وہ انکے مراسیل اور بلاغات کا نہیں ہے اور وہ بھی اسی طرح کم وقعت ہیں۔ جس طرح دوسرونکی غیر مرفوع اور غیر متصل روایتیں۔ صرف اتنا فرق ہوگا کہ چونکہ زہری بذات خود معتبر ہیں اور واقدی جھوٹا کاذب اور جعل ساز ہے اسلیئے زہری کی بے سند روایت کا اعتبار واقدی کی بے سند روایت سے زیادہ ہوگا۔ اور یہ وہی فرق ہے جو ایک صادق البیان مورخ اور ایک عامی گپ ہانکنے والے مصنف میں تمام دنیا کرتی ہے۔

۳۔ امام بخاری پر دارقطنی وغیرہ نے بیشک اعتراضات کئے ہیں۔ لیکن وہ اعتراضات صرف فضل وکمال کی نمائش کے لئے محض اصطلاحی اور لفظی (ٹکنیکل) ہیں واقعی نہیں ہیں۔ اسی لیئے وہ اعتراضات علما کے نزدیک ناقابل قبول ٹھہرے۔ اور ابن حجر نے مقدمہ میں ان میں سے ایک ایک اعتراض کو رد کردیا ہے۔ علاوہ ازیں کسی نے یہ جرأت نہیں کی ہے کہ واقدی کی طرح بخاری کو جھوٹا اور دروغ گو کہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ بخاری کے چند راویوں کی معتبری اور نامعتبری پر بعض لوگوں کو اعتراضات ہیں۔ اسکا نتیجہ یہی نکلے گا کہ ان معترضین کے نزدیک بخاری کی وہ روایتیں قابل اعتراض ہونگی۔ مگر اس سے یہ لازم نہیں آیگا کہ بخاری کی ۱۵ ہزار روایتیں دفعتہً معیار سے گرجائیں۔ برخلاف واقدی کے اسکی ہر غیر مصدق روایت پایۂ اعتبار سے ساقط اور نامعتبر ہے۔

بخاری کو ضعیف ثابت کرنے کے لیئے آپ نے لکھا ہے کہ اسکے راویوں میں ایک ابوہریرہ ہیں جنھوں نے شق القمر جیسا واقعہ نقل کیا ہے۔ یہ طرز استدلال تو صحیح نہیں ورنہ دنیا کے ہر مذہب کا مجموعہ روایت ناقابل تسلیم ہوجائے گا۔ خواہ

رہ "نبوت کے ستارہ کا طلوع ہو" یا "کسی کی موت کے وقت دنیا جہان کا تین دن تک اندھیرا ہو جاتا ہو" اور اس کے علاوہ سیکڑوں ہزاروں معجزات ہیں چاند کا پھٹنا۔ یا پانی پر چلنا عقلاً ممکن ہے یا نہیں؟ اور روٹی اور مچھلی کے چند ٹکڑے سیکڑوں انسانوں کو بیک وقت سیر کر سکتے ہیں یا نہیں؟ اسکی بحث کا یہ موقع نہیں۔ میں نے اپنی سیرۃ نبوی کی تیسری جلد میں اس پر کافی بحث کی ہے۔ اور ہیوم کے فلسفہ (معجزات) سے متفق ہوں کہ معجزات ممکن ہیں بشرطیکہ ان کا ثبوت قطعی شہادت سے ہو سکے۔ لیکن یہ مباحث اس موقع کے لئے موزون نہیں ہیں۔ بہرحال آپ بھی ہم سے متفق ہونگے کہ کسی راوی کے سچے یا جھوٹے ہونے کا یہ معیار نہیں کہ اس نے کسی معجزہ کی روایت کی ہے یا نہیں کی ہے۔ کہ اسکے وقوع اور عدم وقوع اور امکان اور عدم امکان میں ہم سب متفق نہیں ہیں۔

اب میں آگے بڑھ کر یہ دعوی کرتا ہوں کہ ابوہریرہ نے شق قمر کی روایت قطعاً نہیں کی ہے۔ اور نہ بخاری میں انکی یہ روایت مذکور ہے شق قمر کے راوی صحابہ میں عبداللہ بن مسعود و عبداللہ بن عباس۔ عبداللہ بن عمر۔ انس بن مالک۔ جبیر بن مطعم۔ علی بن ابی طالب۔ اور حذیفہ بن یمان وغیرہ ہیں۔ ابوہریرہ اس واقعہ کے تقریباً آٹھ برس بعد مسلمان ہو کر اپنے وطن یمن سے مدینہ آئے ہیں۔ اس بارہ میں انکا کوئی بیان بخاری میں قطعاً نہیں ہے اور نہ کسی دوسری کتاب میں میری نظر سے گذرا ہے۔

اس الزام کی بھی کوئی حقیقت نہیں ہے کہ امام زہری نے خود اقرار کیا ہے کہ

انھوں نے دباؤ سے مجبور ہو کر جھوٹی حدیثیں بنائی ہیں اور میں یہ کہنے کی ہمت نہیں پاتا کہ انگلینڈ کی ایک بڑی یونیورسیٹی کا عربی پروفیسر ایک معمولی عربی عبارت کے سمجھنے میں قصداً غلطی کرتا ہے۔ یا وہ اضطراراً غلطی پر مجبور ہے۔ خوش قسمتی سے اس نے وہ عبارت بھی نقل کر دی ہے جس کے معنی اس نے یہ سمجھے ہیں کہ زہری نے خود اعتراف کیا ہے کہ انھوں نے بادشاہوں کے دباؤ سے جھوٹی حدیثیں بنائی ہیں۔ اصل عبارت یہ ہے :۔

اکرہنا علیہ ہؤلاء الامراء   بادشاہوں نے ہم کو اس امر پر مجبور کیا

اب فوراً سوال ہوتا ہے کہ کس امر پر مجبور کیا؟ اسکا مشارٌ الیہ اس منقولہ عبارت میں موجود نہیں اسلیئے جہاں سے یہ عبارت بالا نقل کی گئی ہے وہیں سے اسکا بقیہ ٹکڑا بھی نقل کر کے فقرہ کو مکمل کیا جائے۔

عن عبد الرزاق عن معمر عن الزہری قال کنا نکرہ کتاب العلم حتی اکرہنا علیہ ہؤلاء الامراء فرأینا ان لا یمنعہ احد من المسلمین (ابن سعد جزء ۲ قسم ثانی ص ۱۳۵)	عبدالرزاق معمر سے اور معمر زہری سے روایت کرتے ہیں کہ زہری کہتے ہیں کہ ہم لوگ علم (حدیث) کو لکھنا ناپسند کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ہم کو بادشاہوں نے (یعنی خلفائے بنو امیہ نے اسکے لکھنے پر مجبور کیا۔ اور اب ہم یہ سمجھتے ہیں کہ کوئی مسلمان اب اسکو منع نہ کرے۔

یہی عبارت مختصر جامع بیان العلم لابن عبدالبر (ص ۳۶ مصر) تقیید العلم ابن جوزی اور تہذیب التہذیب وغیرہ میں ہے۔ اسکا تعلق اس مسئلے سے ہے کہ

بعض علما حدیث کے لکھنے سے منع کرتے تھے اور وہ بہ شدت اس سے پرہیز کرتے تھے مگر سلاطین بنو امیہ نے فرمائش کرکے محدثین کو مجبور کردیا کہ وہ احادیث کو اوراق میں لکھیں اور انکے تحریری مجموعے ترتیب دیں۔ اور آخر امام زہری کو بھی اسکی مصلحت معلوم ہوئی اور انھوں نے اسکی تعمیل کی۔ چنانچہ ان کے ترتیب دیئے ہوئے احادیث کے مجموعے ولید کے خزانہ سے اسکے قتل کے بعد برآمد ہوئے (ابن سعد ۲-۲-۱۳۶) غور کیجیے کہاں زہری کا یہ اقرار کہ انھوں نے سلاطین کی فرمائش سے احادیث کے مجموعے مرتب کیے۔ اور کہاں یہ اقرار کہ سلاطین کے مجبور کرنے سے انھوں نے حدیثیں وضع کیں اور گھڑیں" اللہ اکبر!

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

فاضل پروفیسر کا یہ کہنا کہ "وہ سندیں جو واقدی کی نسبت عمدہ رائیں ظاہر کرتی ہیں وہ ان سے جو اسکی تنقیص کرتی ہیں ایک نسل مقدم ہیں تحقیق پر مبنی نہیں۔ بلکہ فقط واقدی کے ساتھ حسن ظن پر مبنی ہے۔ واقدی کے موافقین اور مخالفین دونوں میں اسکے ہمعصر اور اسکے بعد کے لوگ داخل ہیں۔ مزید ثبوت کیلئے ذیل میں دونوں کی ولادت اور وفات کی تاریخیں لکھ دی جاتی ہیں۔ چونکہ واقدی کے موافقین اس کے مخالفین کے مقابلہ میں کم درجہ لوگ ہیں اسلئے اُن میں اکثر کی ولادت کی تاریخیں کم از کم مجھکو نہ مل سکیں

۱۔ محمد بن عمر الواقدی۔

سنہ ولادت: سنہ ۱۳۰ھ سنہ وفات: سنہ ۲۰۷ھ

(۲) موافقین واقدی

نام	سنہ ولادت	سنہ وفات	نام	سنہ ولادت	سنہ وفات
۱۔ عبدالعزیز بن محمد دراوردی	۰	سنہ ۱۸۶ھ	۶۔ محمد بن اسحاق مسیبی	۰	سنہ ۲۳۶ھ
۲۔ یزید بن ہارون	سنہ ۱۱۷ھ شاید	سنہ ۲۰۶ھ	۷۔ عباس عنبری	۰	سنہ ۲۴۶ھ
۳۔ ابو عبیدہ قاسم ابن سلام	سنہ ۱۵۷ھ شاید	سنہ ۲۲۴ھ	۸۔ یعقوب بن شیبہ	۰	سنہ ۲۶۲ھ
۴۔ مصعب بن عبداللہ الزبیری	سنہ ۱۵۶ھ شاید	سنہ ۲۳۶ھ	۹۔ محمد بن اسحاق الصنعانی	۰	سنہ ۲۷۰ھ
۵۔ محمد بن عبداللہ ابن نمیر	۰	سنہ ۲۳۴ھ	۱۰۔ ابراہیم الحربی	۰	سنہ ۲۸۰ھ

(۲) مخالفین واقدی

نام	سنہ ولادت	سنہ وفات	نام	سنہ ولادت	سنہ وفات
۱۔ امام شافعی	سنہ ۱۵۰ھ	سنہ ۲۰۴ھ	۵۔ اسحاق بن راہویہ	سنہ ۱۶۱ھ	سنہ ۲۳۸ھ
۲۔ یحیی بن معین	سنہ ۱۵۸ھ	سنہ ۲۳۳ھ	۶۔ محمد بن بشار بندار	سنہ ۱۶۷ھ	سنہ ۲۵۲ھ
۳۔ احمد بن حنبل	سنہ ۱۶۰ھ	سنہ ۲۴۱ھ	۷۔ ابوحاتم رازی	سنہ ۱۹۵ھ	سنہ ۲۷۷ھ
۴۔ علی بن المدینی	سنہ ۱۶۱ھ	سنہ ۲۳۴ھ	۸۔ امام بخاری	سنہ ۱۹۴ھ	سنہ ۲۵۶ھ

نام	سال ولادت	سال وفات	نام	سال ولادت	سال وفات
۹- جوزجانی (ابراہیم بن یعقوب)	۰	سنہ ۲۵۶ھ	۱۳- ابو البشر دولابی	سنہ ۲۲۴ھ	سنہ ۳۱۰ھ
۱۰- ابوزرعہ رازی	سنہ ۲۰۰ھ	سنہ ۲۶۴ھ	۱۴- ابن عدی	سنہ ۲۷۷ھ	سنہ ۳۶۵ھ
۱۱- ابوداؤد سجستانی	سنہ ۲۰۲ھ	سنہ ۲۷۵ھ	۱۵- دارقطنی	سنہ ۳۰۶ھ	سنہ ۳۸۵ھ
۱۲- امام نسائی	سنہ ۲۱۵ھ	سنہ ۳۰۳ھ	۰	۰	۰

امام بخاری کی وفات کا واقدی کی وفات کے پچاس برس بعد واقع ہونا ان دونوں کی معاصرت کی نفی کی کوئی دلیل نہیں۔ معاصرت کا حساب دونوں کی زندگیوں کے کم و بیش ایک ساتھ ہونے سے لگایا جاتا ہے نہ موت سے۔ واقدی نے سنہ ۲۰۷ھ میں وفات پائی اور امام بخاری سنہ ۱۹۴ھ میں پیدا ہوئے ہیں اسلیئے وہ اس وقت ۱۳ برس کے طالب العلم تھے۔ اور واقدی کے ذاتی طور سے ملنے والے اور جاننے والے تمام درسگاہوں میں موجود تھے۔ امام بخاری نے اپنی کتاب تاریخ صغیر میں جو کچھ لکھا ہے اسکا یہی مطلب ہے۔ انھوں نے واقدی کے متعلق لکھا ہے (صفحہ ۲۲۵-الہ آباد) ترکوہ یعنی لوگوں نے اسکو چھوڑدیا ہے یہ ظاہر ہے کہ یہ وہی لوگ ہوسکتے ہیں جو امام بخاری سے پہلے کے تھے۔ یا انکے زمانہ میں تھے۔ پہلی صورت میں یہ چھوڑنے والے خود واقدی کے معاصرین ہونگے۔ اور دوسری صورت میں کچھ معاصر ہونگے اور کچھ معاصرین سے سننے والے ہونگے۔ اس سے ثابت ہوا کہ بخاری کے مرنے سے واقدی کا پچاس برس پہلے مرجانا بخاری کی واقدی سے عدم واقفیت کی دلیل نہیں ہوسکتی۔ خصوصًا

جب کہ یہ معلوم ہوگا کہ وہ بچپن سے تحصیل علم میں مصروف ہو گئے تھے اور واقدی کی وفات کے دو برس بعد ہی وہ عرب جانے کے لیئے عراق پہونچ چکے تھے۔

بہرحال موافقین کی ولادت کی تاریخیں چونکہ کمتر معلوم ہیں اسلیئے واقدی المتولد سنہ ۱۳۰ھ اور المتوفی سنہ ۲۰۷ھ کے معاصرین کا حال پورے یقین سے نہیں معلوم ہو سکتا۔ تاہم مخالفین کی تاریخیں نظر سامنے رکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ سنہ ۱۵۰ھ تک جس نے وفات پائی ہے اس نے واقدی کا زمانہ پایا ہے، اس لحاظ سے موافقین میں سے نمبر ۷ تک یعنی عباس عنبری تک اسکے معاصرین میں ہیں۔ اور تین متاخر ہیں۔

مخالفین میں امام شافعی المتولد سنہ ۱۵۰ھ، یحییٰ بن معین المتولد سنہ ۱۵۸ھ، احمد بن حنبل المتولد سنہ ۱۶۴ھ، علی بن المدینی المتولد سنہ ۱۶۱ھ۔ اسحاق بن راہویہ المتولد سنہ ۱۶۱ھ۔ بندار المتولد سنہ ۱۶۷ھ چھ ایسے جلیل القدر ائمہ فن ہیں جنہوں نے اسکی ہمعصری کا زمانہ پایا ہے۔ اور کم از کم ۵۷ برس سے ۴۰ برس تک اس سے انکی معاصرت قائم رہی ہے۔ واقدی کی وفات کے وقت امام بخاری کی عمر ۱۴ برس کی تھی جیسا کہ ابھی کہا گیا۔ ابوحاتم رازی کی عمر اس وقت ۱۳ برس کی اور ابوزرعہ رازی کی عمر ۸ برس کی تھی۔ اور اس وقت واقدی کا چرچا درس کے ان حلقوں میں کافی موجود ہوگا جن میں جا کر وہ بیٹھے۔ بقیہ اشخاص کی رائیں ذاتی تجربہ پر نہیں بلکہ واقدی کے مجموعوں اور اپنے ان شیوخ کی آراء پر مبنی ہیں جنہوں نے واقدی کو خود دیکھا تھا یا واقدی کے دیکھنے والوں کو دیکھا تھا۔ البتہ

ابوبشر دولابی۔ ابن عدی۔ اور دارقطنی کی رائیں اسکے متعلق اسکے معاصر جمہور علماء اور بعد کے اکابر کے اختتامی فیصلہ پر مبنی ہیں۔ اسلیئے واقدی کے معاملہ کے متعلق یہ اصول صحیح نہ ہوگا کہ جب کسی شخص کے خود معاصرین اسکو اعلیٰ شان تسلیم کریں تو مشکل مناسب ہوگا ”کہ بعد کی نسل کے تھیالوجینس کی بلا دلیل رایوں“ کی بنا پر اسکو جھوٹا کہکر بدنام کیا جائے۔

واقدی کے مخالفین اور موافقین کی ترجیحی ترازو کا فیصلہ دو اور پاسنگ سے بھی ہوسکتا ہے۔ ایک انکے فضل وکمال، جمہور اہل عصر میں ان کے اعتبار، استناد اور انکی شہرت اور عزت کی بنا پر۔ چنانچہ آپ خود فیصلہ کرسکتے ہیں کہ بحیثیت ایک سچے طالب العلم، اسلام کے ان دو جماعتوں میں آپ سب سے زیادہ کس سے واقف ہیں۔ اور اسلامی لٹریچر میں کس کے نام کو اہمیت اور کس کی رائے کو وقعت حاصل ہے۔ امام شافعی۔ امام بخاری۔ علی بن مدینی۔ ابن حنبل۔ ابن معین۔ اور ابن راہویہ کو یا دراوردی۔ زبیری۔ مسیبی۔ یزید بن ہارون اور عنبری کو۔

دوسرا ترجیحی معیار یہ ہے کہ واقدی کا ابتدائی زمانہ گو مدینہ میں گذرا لیکن اسکی عمر کا بڑا حصہ بغداد میں بسر ہوا اور وہیں اسکو شہرت حاصل ہوئی۔ اس بنا پر ان ائمہ کی رائے کو ترجیح حاصل ہے جو بغداد اور عراق میں عموماً سکونت رکھتے تھے یا اکثر آتے جاتے تھے۔ اس حیثیت سے ان دونوں جماعتوں کا یہ حال ہے کہ دراوردی مدینہ میں رہے ۱۸۶ھ میں وفات پائی اور بغداد آکر واقدی میں جو خاص انقلاب ہوا اور جو انکی موت سے کم از کم ۲۲ برس بعد تک رہا

اسکی واقفیت سے وہ قطعاً محروم رہے۔ اسلیئے انکی رائے واقدی کی صرف مدنی زندگی تک محدود ہے۔ بقیہ میں ایک زبیری البتہ بغداد میں رہتے تھے۔ ابن نمیر کوفہ میں اور یزید بن ہارون واسط میں رہتے تھے مگر مخالفین کو دیکھو کہ ان میں بیشتر اصحاب یا بغداد ہی میں رہتے تھے یا بہت دنوں تک مدینہ اور بغداد دونوں میں رہے تھے۔ چنانچہ احمد بن حنبل اور یحیی بن معین خاص بغداد کے تھے۔ علی بن مدینی مدینہ اور بصرہ میں تھے۔ بندار بصرہ اور بغداد میں سکونت رکھتے تھے۔ اسحاق بن راہویہ عراق ہی میں سکونت پذیر تھے امام شافعی مدینہ میں رہے اور بغداد بھی آتے رہے۔ نتیجہ صاف ظاہر ہے۔

⁂

خلیل اللہ کی بشریت

حضرات انبیائے کرام کے اوصاف غالبہ

(۱)

انبیا کے اوصاف کمالی

"خلیل اللہ" کے لغوی معنی "خدا کے دوست" کے ہیں اور یہ حضرت ابراہیم کا لقب ہے۔ لیکن کیا اسکے معنی یہ ہیں کہ دوسرے انبیائے کرام اللہ تعالےٰ کے دوست نہ تھے۔ کیا کوئی پیغمبر ایسا بھی ہو سکتا ہے جو خدا کا دوست نہ ہو۔ پھر صرف حضرت ابراہیم ہی خلیل اللہ کیوں ہوں۔

اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کا لقب کلیم اللہ مشہور ہے جس کے معنی ہیں "خدا سے باتیں کرنے والا۔" "جس نے خدا سے باتیں کیں" لیکن کیا کوئی پیغمبر ایسا بھی ہے جس سے خدا نے کسی نہ کسی طرح باتیں نہ کی ہوں پھر حضرت موسیٰ ہی کلیم اللہ کیوں کہلائیں۔

اسی طرح حضرت عیسیٰ کو روح اللہ کہتے ہیں حالانکہ تمام انبیا اور نہ حضرت

انبیاء بلکہ ہر انسان کی روح خدا ہی کی روح ہے۔ پھر صرف حضرت عیسیٰ کو روح اللہ کیوں کہیے۔

اسی طرح اگر کوئی شخص حضرت محمد رسول اللہ صلعم کو بہ تخصیص شاہد و مبشّر و نذیر و داعی الی اللہ و سراج منیر کہے تو ایسا کہنا کیونکر درست ہو گا، درآنحالیکہ ہر نبی شہادت دینے والا، نیکو کاروں کو بشارت سنانے والا گنہگاروں کو تنبیہ کرنے والا۔ خدا کی طرف پکارنے والا۔ اور روشنی بخشنے والا چراغ بنکر آیا۔

عام لوگوں کو یہ شبہہ اسلیئے پیش آتا ہے کہ وہ زبان کے ایک نکتے سے پہلو تہی کرتے ہیں وہ نکتہ یہ ہے کہ ہر شخص کو اسکے صرف اسی وصف سے ملقب کیا جاتا ہے جو وصف اس میں بمرتبہ کمال ہوتا ہے۔ باتیں ہر شخص کرتا ہے اسلیئے لغت کے لحاظ سے ہر شخص ابو الکلام ہے مگر استعمال میں ابو الکلام اسی کو کہینگے جس میں کلام کی خوبی، برجستگی یا طول وجہ کمال ہو۔

آنکھیں اور ہاتھ کس انسان کے پاس نہیں اسلیئے اولی الایدی والابصار (ہاتھوں اور آنکھوں والے) سبھی ہیں مگر قرآن پاک نے اسکو خاص طور سے انبیائے کرام کا وصف قرار دیا اور فرمایا:۔

واذکر عبادنا ابراھیم و اسحاق ویعقوب اولی الایدی والابصار (ص۔۴)	اور ہمارے بندوں ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب کو یاد کر جو ہاتھوں اور آنکھوں والے تھے۔

ہاتھ عمل کے لیئے اور بصارت علم کے لیئے ہے۔ اس سے مقصود انسان کی عملی اور علمی قوتوں کا کمال ہے چونکہ حضرات انبیا کی عملی اور علمی دونوں قوتیں

مرتبہ کمال پر ہوتی ہیں اسلیئے تمام انسانی طبقوں میں "اولی الایدی والابصار" (ہاتھوں اور آنکھوں والے) کے لقب کے وہی مستحق قرار پائے۔

یہی سبب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مختلف انبیا علیہم السلام کو مختلف اوصاف کاملہ سے یاد فرمایا۔ حضرت ابراہیمؑ کی نسبت فرمایا۔

واتخذ اللہ ابراھیم خلیلا (نساء-۱۸) | اور خدا نے ابراہیم کو دوست بنایا۔

حضرت موسیٰؑ کی نسبت ارشاد ہوا۔

وکلم اللہ موسیٰ تکلیما (نساء-۲۲) | اور اللہ تعالیٰ نے موسیٰؑ سے بہت سی باتیں کیں۔

حضرت اسماعیلؑ کو فرمایا:۔

انہ کان صادق الوعد (مریم-۴)۔ اسماعیل وعدہ کے سچے تھے۔

حضرت ایوب کے متعلق ارشاد باری ہے۔

انا وجدناہ صابرا (ص) ہم نے اسکو صابر پایا۔

غور کیجئے کہ انبیا میں کون نہیں جس نے خدا سے دوستی نہیں کی یا خدا نے اس سے باتیں نہ کیں۔ یا وہ وعدہ کا سچا نہ تھا۔ یا حق کی راہ میں وہ صابر نہ ٹھہرا۔ لیکن اسکے باوجود اللہ تعالیٰ نے دوستی کے وصف سے حضرت ابراہیم کو ہم کلامی کے وصف سے صرف حضرت موسیٰ کو، صدق وعدہ کے وصف سے صرف حضرت اسماعیل کو اور صبر کے وصف سے صرف حضرت ایوب کو ممتاز فرمایا۔ حالانکہ خود قرآن کہتا ہے:۔

واصبر کما صبر اولوا العزم | (اے رسول) آپ بھی ویسے ہی صبر کیجئے۔

مِنَ الرسل (احقاف۔۵) جیسے ہمت والے رسولوں نے کیا ہے۔

مگر اس عموم کے باوجود تمام انبیا میں سے مخصوص طور پر صرف حضرت ایوبؑ ہی کو صابر کہکر یاد فرمایا گیا۔ جسکے معنی یہ نہیں کہ نعوذ باللہ دوسرے انبیا اس صبر کے وصف سے معرا تھے۔

بات یہ ہے کہ گو ہر شخص کو خدائے تعالیٰ کی طرف سے ہر قسم کی استعدادیں ملتی ہیں مگر ان میں سے ایک ہی دو استعدادونکا کمال نصیب ہوتا ہے۔ بالقوی استعدادوں کی فعلیت، زمانہ کے اقتضاء حالات کی مناسبت، وقت کی ضرورت اور پیش آمدہ واقعات کے مطالبہ کی بناء پر ہوتی ہے۔ جہاد کا حکم ہر پیغمبر کو ہوا مگر ہر ایک کی زندگی میں اسکے مناسب حالات پیش نہیں آئے اسلیے حضرت موسیٰؑ اور حضرت محمد رسول اللہ صلعم کی پاک زندگیوں میں جہاد کے جو مناظر پیش آئے وہ دوسرے پیغمبرونکے سامنے پیش نہیں آئے۔

غرض کسی شخص میں کسی وصف کا موجود ہونا اور بات ہے اور اس وصف کے عملی ظہور کے مواقع پیش آنا اور انکے مطابق اس صفت کا بمرتبہ کمال ظاہر ہونا اور بات ہے۔ انبیا کا کسی وصف خاص سے ملقب اور ممتاز ہونا پہلے اوصاف کی بناء پر نہیں بلکہ دوسرے اوصاف کی بناء پر ہوتا ہے اسی لیئے حضرت ابراہیمؑ خلیل اللہ۔ حضرت موسیٰؑ کلیم اللہ۔ حضرت عیسیٰؑ روح اللہ۔ حضرت اسمٰعیل صادق الوعدؑ اور حضرت ایوبؑ صابر ٹھہرے۔ کیونکہ حضرت ابراہیمؑ سے اللہ تعالیٰ نے نسلاً بعد نسلٍ دوستی کا جو وعدہ فرمایا اور جس کی علامت کے طور پر انکی اولاد در اولاد کو نبوت و برکت سے سرفراز فرمایا یہ دوستی کا کمال کسی اور نبی کو عنایت نہیں ہوا۔

حضرت موسیٰؑ کو کوہِ طور پر جس طرح ہم کلامی کا شرف بخشا گیا وہ کسی اور نبی کے حصّہ میں نہیں آیا۔ حضرت عیسیٰؑ کو روحِ الٰہی کا فیضان جس کمال کے ساتھ ملا وہ کسی اور نبی کو نہیں دیا گیا۔ چنانچہ فرمایا۔

تلک الرسل فضّلنا بعضھم	یہ پیغمبر ان میں سے بعض کو بعض پر
علیٰ بعض منھم من کلم	ہم نے برتری دی۔ ان میں سے کوئی
اللہ ورفع بعضھم درجٰت	تو ایسے ہیں جن سے خود اللہ نے کلام
واٰتینا عیسی بن مریم البینٰت	کیا اور بعض کے درجے بلند کیے۔ اور
وایّدناہ بروح القدس	مریم کے بیٹے عیسیٰ کو کھلی نشانیاں دیں۔
(البقرہ - ۳۳)	اور روح القدس سے ان کی تائید کی۔

اس پاک آیت میں تین پیغمبروں کا وصف امتیاز بیان کیا گیا۔ پہلے حضرت موسیٰ کا کہ ان کو کلیمیت ملی۔ اور سب سے آخر میں حضرت عیسیٰ کا کہ انکو معجزات اور روح القدس کی تائید بخشی گئی اور دونوں کے بیچ میں ایک پیغمبر کا ذکر ہے جس کو درجوں اور مرتبوں کی بلندی ملی۔ یہ بیچ کے پیغمبر ہمارے رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جن کی شریعت وسط اور صراطِ مستقیم اور موسویت اور عیسویت کے بیچ میں معتدل ہے اسلیئے آپکا ذکر بھی ان دونوں کے بیچ میں ہے۔

ہمارے رسول اللہ صلعم کو درجوں اور مرتبوں کی جو بلندی ملی اسکی تفصیل اور تشریح جتنی بھی کی جائے کم ہے۔ اور قرآن پاک میں جابجا اسکی تشریح ہے منجملہ اسکے ایک یہ ہے کہ حضرت موسیٰ کو کلیمیت اور حضرت عیسیٰ کو تائید بروح القدس کی جو فضیلت عطا ہوئی وہ شخصی فضیلتیں ہیں۔

اور ہمارے رسول کو جن درجوں اور مرتبوں کی فضیلت عطا ہوئی وہ شخصی کے علاوہ دینی وعمومی ہیں۔ آپ کو جو بالذات فضیلت بھی عطا کی گئی مثلاً خاتمیت وہ بھی آپ کی کتاب، آپ کی شریعت اور آپ کی امت کو مشتمل ہے۔ آپ کے دین کو عموم بخشا گیا۔ آپ کو نبی الامم اور نبی الانبیا دونوں بنایا گیا آپ کے دین پر دین الٰہی کے ہر گوشہ کی تکمیل کی گئی۔ آپ کی کتاب کو خاتم الکتب اور ناسخ الکتب بنایا گیا۔ اور قیامت تک کے لیے اسکی حفاظت کا وعدہ کیا گیا اور آپ کی امت کو آخر الامم کا لقب ملا ع

ہر چند وصفت می کنم لیکن ازاں بالاتری

با اینہمہ اسکے یہ معنی نہیں ہیں کہ نعوذ باللہ آنحضرت صلعم کو خدا نے ہم کلامی کا شرف نہیں بخشا۔ یا روح القدس کی تائید عطا نہیں ہوئی۔ یہ دونوں باتیں آپ کو بھی ملیں لیکن یہ باتیں آپ کا وصف امتیازی نہیں بنائی گئیں بلکہ اور دوسری دوسری باتوں کو آپ کا وصف امتیازی ٹھہرایا گیا۔ مثلاً فرمایا۔

اِنّا ارسلناکَ شاھدًا ومُبشرا ونذیرا (فتح۔۱)	ہم نے تجھ کو گواہ اور خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا
یا ایّھا النبی انا ارسلناکَ شاھدًا ومبشرا ونذیرا وداعیا الی اللہ باذنہ وسراجًا منیرا (احزاب ۶)	اے پیغمبر ہم نے تجھ کو گواہ اور خوشخبری سنانے والا۔ اور ڈرانے والا۔ اور خدا کی طرف پکارنے والا۔ اور روشن کرنے والا چراغ بنا کر بھیجا۔

یہ آپ کے منجملہ دیگر امتیازی صفات کے چند امتیازی صفات ہیں جنکا یہ منشا نہیں کہ ان صفات سے دیگر انبیا علیہم السلام خالی تھے بلکہ یہ ہے کہ ان اوصاف کمالیہ کا یہ اجتماع انکی ذات میں اس درجہ کمال میں نہ تھا جو محمد رسول صلعم کی ذات پاک میں تھا۔ چنانچہ پورے قرآن میں کسی خاص پیغمبر کے یہ اوصاف بہ تخصیص نام لیکر سوائے حضرت محمد رسول اللہ صلعم کے نہیں قرار دیئے گئے۔ کیونکہ مقام مدح میں وہی اوصاف بیان کئے جاتے ہیں جو کسی موصوف کے اوصاف امتیازی اور کمالی ہوتے ہیں جنکو اوصاف غالبہ کہتے ہیں

اسی نکتہ کو مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ اپنے رسالے "تحذیر الناس" میں یوں بیان فرماتے ہیں:۔

> "مگر کوئی ملقب ہوتا ہے تو اپنے اوصاف غالبہ کے ساتھ ملقب ہوتا ہے۔ مرزا جان جاناں صاحبؒ اور شاہ غلام علی صاحبؒ اور شاہ ولی اللہ صاحبؒ۔ اور شاہ عبدالعزیز صاحبؒ چاروں صاحب جامع بین العلم والفقر تھے۔ پر مرزا صاحب اور شاہ غلام علی صاحبؒ تو فقیری میں مشہور ہوئے اور شاہ ولی اللہ صاحب اور شاہ عبدالعزیز صاحب علم میں۔ وجہ اسکی یہی ہے کہ انکے علم پر انکی فقیری غالب تھی اور انکی فقیری پر انکا علم۔ اگرچہ ان کے علم سے ان کا علم یا ان کی فقیری سے انکی فقیری کم نہ ہو۔ سو انبیا میں علم عمل سے غالب ہوتا ہے اگرچہ انکا عمل اور ہمت اور قوت اورونکے عمل اور ہمت اور قوت سے غالب ہو۔ بہرحال علم میں انبیا اوروں سے ممتاز ہوئے ہیں (صف ۵)

آگے چل کر فرماتے ہیں:۔

"نبوت کمالاتِ علمی میں سے ہے۔ اور آپ جامع العلوم ہیں
اور انبیا باقی جامع نہیں" (صفحہ ۵)

غرض یہ ہے کہ مقامِ مدح میں خاص خاص انبیا علیہم السلام کے وہی اوصاف گنائے جاتے ہیں جن میں انکو دوسروں پر امتیاز اور فضیلت حاصل ہو اس بنا پر آنحضرت صلعم کی مدح میں جو شاہد و مبشر و نذیر و داعی الی اللہ و سراج منیر کے الفاظ بہ اطلاق آئے ہیں انکا یہی مقصد ہے کہ آپ میں یہ اوصاف مجتمعہ ایسے مرتبۂ کمال پر تھے جو کسی اور نبی میں نہ تھے۔

اوصافِ کمالی کے علم کے طریقے

انبیا علیہم السلام کے یہ امتیازی اوصاف دو طریقوں سے معلوم ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ بہ نصِ صریح انکا اظہار ہو جیسے حضرت موسیٰ کیلئے کلیمیت، حضرت عیسیٰ کے لیے تائید بروح القدس یا حضرت اسماعیل کے لیے صدقِ وعدہ اور حضرت ایوب کے لیے صبر۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ لفظوں میں اس صفت کی تصریح نہ ہو مگر انکی زندگی کے عملی کارناموں میں وہ وصف علانیہ نظر آتا ہو جیسے حضرت موسیٰ اور حضرت نوح علیہما السلام میں نذیریت کا۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام میں مبشریت کا کمال۔

نذیریت کے کمال کے یہ معنی ہیں کہ اس میں خدا کی قہاری و جباری اوصاف کا ظہور زیادہ ہو۔ اور کمال مبشریت کے یہ معنی ہیں کہ خدا کے فضل و کرم اور رحمت عام کا رنگ زیادہ نمایاں ہو جیسا کہ خدا نے آنحضرت صلعم کو مبشر وغیرہ کہکر

فرمایا تو وہیں اسکی تصریح فرمائی۔ وَ بشر المومنین بان لھم من اللہ فضلا کبیرا

(احزاب-۶)

اور ایمان والوں کو خوشخبری سنا دیجئے کہ ان کے لیۓ خدا کی طرف سے بڑی مہربانی (فضل) ہے۔

کمال نذیریت میں اللہ تعالےٰ کے قہر و عذاب کا پہلو اسکے فضل و کرم سے زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔ جیسے نوح علیہ السلام اپنی ہزار سالہ تبلیغ کی ناکامی سے جب مایوس ہوئے تو آن کا نمایاں پہلو یہ ہے کہ خدا کی بارگاہ میں کفار کی پوری نسل کی بربادی و ہلاکت کی دعا مانگی۔ عرض کی:۔

ربّ لا تذر علی الارض من الکفرین دیّارا انک ان تذرھم یضلوا عبادک و لا یلدوا الا فاجرا کفارا رب اغفرلی ولوالدی ولمن دخل بیتی مومنا وللمومنین و للمومنت ولا تزد الظلمین الا تبارا۔

(نوح-۳)

اے میرے پروردگار تو زمین پر کافروں میں سے کوئی گھر بسانے والا مت چھوڑ۔ بیشک اگر تو آن کو چھوڑے گا تو وہ تیرے بندوں کو گمراہ کرینگے اور انکی اولاد جو ہوگی وہ بھی بدکار اور سخت کافر۔ اے میرے رب مجھے اور میرے والدین کو اور جو میرے گھر میں با ایمان آۓ اور مومن مردوں اور مومن عورتوں کو بخش دے اور ظالموں کو نہ بڑھا مگر تباہی میں

اس آیت میں نذیریت اور بشیریت دونوں کے جلوے ہیں مگر غور

کیجئے کہ نذیریت کا غلبہ بشیریت سے کتنا زیادہ ہے۔ اہل ایمان کیلئے صرف مغفرت کی دعا کے ساتھ ساتھ پورے روئے زمین کے کافروں اور انکی پوری نسل کی ہلاکت کی دعا ہے۔ اور پھر انہی کی کامل تباہی و بربادی کی خواہش پر دعا کا خاتمہ ہے اور آخر ساری قوم تباہ و برباد ہوگئی۔

حضرت موسیٰؑ اہل فرعون کے حق میں یہ دعا مانگ کر اپنی نذیریت کی شان کا کمال ظاہر فرماتے ہیں۔

ربنا انك اتيت فرعون و	ہمارے پروردگار تونے فرعون اور
ملأه زينة واموالاً في	اس کے درباریوں کو شان و شوکت
الحيوة الدنيا ربنا ليضلوا	اور دولت دنیا میں دی ہے۔ اے
عن سبيلك ج ربنا اطمس	ہمارے پروردگار تاکہ تیرے راستہ سے بہکا دیں
على اموالهم واشدد على	اے ہمارے پروردگار ان کی دولت کو
قلوبهم فلا يومنوا حتى يروا	مٹا دے اور انکے دلوں کو سخت کردے تو
العذاب الاليم	وہ ایمان نہ لائیں۔ یہانتک کہ
(یونس-۱۰)	دردناک عذاب دیکھ لیں۔

اس کے بالمقابل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی صفت تبشیر کا کمال ملاحظہ ہو کہ اللہ تعالےٰ اُن سے اُن لوگونکی نسبت جب دریافت کریگا جو ان کے بعد شرک میں مبتلا ہوئے تو موقع پاکر عرض کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی شان رحمت سے اپیل کرتے ہیں۔

ما قلت لهم الا ما امرتني	میں نے اُن سے وہی کہا جو تونے

بہ ان اعبدوا اللہ ربی و ربکم و کنت علیھم شھیدًا ما دمت فیھم فلمّا توفیتنی کنت انت الرقیب علیھم و انت علیٰ کل شیئ شھید ان تعذبھم فانھم عبادک و ان تغفرلھم فانک انت العزیز الحکیم (مائدہ-۱۶)	حکم دیا کہ میرے اور اپنے رب کو پوجو، اور جب تک میں انکے درمیان تھا اُن کو دیکھتا بھالتا تھا۔ اور جب تو نے مجھے وفات دی، تو ہی ان کا نگہبان تھا اور تو ہر چیز کی خبر رکھتا ہے اگر تو انکو عذاب دے تو یہ تیرے بندے ہیں۔ اگر تو ان کو معاف کردے تو تو قدرت اور حکمت والا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی شان رحیمی کی یہ تحریک اُن کے حق میں ہے جن کی نسبت حضرت عیسیٰ خود ہی نذیری فرما چکے ہیں۔

انہ من یشرک باللہ فقد حرّم اللہ علیہ الجنۃ و مَاوٰہ النّار (مائدہ-۱۰)	بیشک جو کسی کو خدا کا شریک بنائیگا تو اللہ نے جنت اُس پر حرام کردی ہے اور اسکا ٹھکانا دوزخ ہے۔

مگر بایں ہمہ اُن کی بخشش کے لیے بھی رحمت الٰہی کی سلسلہ جنبانی فرماتے ہیں ظہور محمدی کی بشارت کا پیغام لے کر بھی وہ آئے اور کہا۔

مبشرًا برسولٍ یاتی من بعدی اسمہ احمد	اس رسول کی بشارت لیکر آیا ہوں جو میرے بعد آئیگا اور جسکا نام احمدؐ ہے

حضرت ابراہیمؑ کی بشیریت

اس سے زیادہ جمالِ بشارت حضرت ابراہیمؑ کے روئے اقدس میں ہے۔ وہ

مجسم خیر و برکت لے کر آئے۔ نبیوں اور رسولوں کے مورث قرار پائے۔ اسماعیلؑ و اسحاقؑ کے خاندانوں کی برکتیں انہی کے ذریعہ اُتریں اور آدم کے سارے گھرانوں کو انکے ذریعہ ہدایت کی روشنی ملی۔ نبی المرسلین، رحمۃ للعالمین علیہ السلام کے ظہور کی دُعا انھوں نے کی۔

دعائے خلیل و نوید مسیحا

اور دونوں مُبشر

(۲)

نمرود کی آگ اُن کے لیئے ٹھنڈی ہو جاتی ہے اور ندا آتی ہے کہ سلامتی ہو ابراہیم کی سلامًا علیٰ ابراھیم۔ بت پرست باپ کو سمجھاتے ہیں نہیں مانتا اور کفر پر اَڑا رہتا ہے تو اسکو خدا کا ڈر ان لفظوں میں سناتے ہیں۔

یا ابت انی اخاف ان	اے میرے باپ میں ڈرتا ہوں کہ
یمسک عذاب من الرحمٰن	تجھے رحمت والے خدا کی طرف سے
فتکون للشیطٰن ولیًّا	کوئی عذاب نہ چھوئے تو تو شیطان
(مریم - ۳)	کا ساتھی بنے۔

باپ نے یہ سُن کر بیٹے کو سزا کی دھمکی دی اور گھر سے نکل جانے کا حکم دیا بیٹا اب بھی باپ کی خیرخواہی میں مصروف ہے، سلام کرتا ہے اور اپنے خدا سے اسکے گناہوں کی معافی کے لیئے دعا کا وعدہ کرتا ہے۔

قال سلٰمٌ علیک ساستغفر   ابراہیم نے کہا۔ تم پر سلامتی ہو میں

لک ربی انہ کان بی حفیًا واعتزلکم وما تدعون من دون اللہ وادعوا ربی عسیٰ الا اکون بدعاء ربی شقیًا

(مریم - ۳)

تمھارے لیئے اپنے رب سے دُعا مانگونگا کہ تمھارے گناہ معاف فرمائے وہ مجھ پر مہربان ہے۔ اور میں تم سے اور تمھارے معبودوں سے الگ ہوتا ہوں اور اپنے رب سے دعا کرتا ہوں۔ اور امید ہے کہ میں اس دعا میں بے نصیب نہ رہونگا۔

حضرت ابراہیم نے اپنا یہ دعویٰ پورا کیا اور بارگاہ الٰہی میں عرض کی:-

ربّنا اغفر لی ولوالدیّ وللمومنین یوم یقوم الحساب

(ابراھیم - ۶)

اے ہمارے پروردگار مجھے اور میرے ماں باپ اور ایمان والونکو اس دن بخش دے جب حساب کتاب قائم ہو۔

یہ بشارت کی پے درپے التجا کافر باپ کے حق میں ہوا اور جب آنحضرت صلعم کو اور مسلمانونکو مشرکوں کی مغفرت کی دعا مانگنے کی ممانعت آئی تو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کے اس فعل کی توجیہ فرمائی۔

وما کان استغفار ابراھیم لابیہ الا عن موعدۃ وعدھا ایاہ فلما تبین لہ انہ عدو للہ تبرا منہ ان ابراھیم لاواہ حلیم

(توبہ - ۱۴)

اور ابراہیم کا اپنے باپ کی مغفرت کی دعا مانگنا نہ تھا مگر وعدہ کے سبب سے جو اُسنے اُس سے کیا تھا۔ پھر جب ابراہیم پر ثابت ہوگیا کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو وہ اس سے الگ ہوگیا بیشک ابراہیم بڑا نرم دل اور بردبار تھا

اس آیت پاک سے دو باتیں معلوم ہوئیں ایک یہ کہ حضرت ابراہیم کی دعا اس توقع میں تھی کہ اُن کا باپ مسلمان ہو کر رحمت الٰہی کا مستحق ٹھہرے لیکن انکی یہ توقع درست نہیں نکلی۔ دوسری بات یہ کہ حضرت ابراہیمؑ چونکہ کمال بشیریت سے ممتاز تھے اسلیئے خدا نے انکی نرم دلی اور بردباری کی تعریف فرمائی۔

اس طرح حضرت لوط کی قوم کی تباہی کی خبر جب مہمان فرشتوں نے اُن کو سنائی تو ان کو بڑا صدمہ ہوا اور بارگاہ الٰہی میں اسکی طرف سے عرض معروض کرنے لگے تو خدا نے پھر انکی نرم دلی اور بردباری اور حق ظاہر ہونے کے بعد انکے رجوع حق کی مدح فرمائی۔

فلما ذهب عن ابراهيم الروع وجاءته البشرى يجادلنا في قوم لوط ان ابراهيم لحليم اواه منيب يا ابراهيم اعرض عن هذا انه قد جاء امر ربك وانهم اتيهم عذاب غير مردود۔

(هود - ۷)

تو جب ابراہیم سے خوف جاتا رہا۔ اسکو (اولاد کی) بشارت مل چکی۔ ہم سے لوط کی قوم کے بارے میں جھگڑنے لگا بے شک ابراہیم بردبار، نرم دل اور رجوع کرنے والا تھا۔ (خدا نے فرمایا) اے ابراہیم اس خیال کو چھوڑ دے تیرے رب کا حکم آچکا اور لوط کی قوم کو وہ عذاب آنے ہی والا ہے جو واپس نہ ہوگا۔

حضرت ابراہیم قوم لوط کی طرف سے کیونکر جناب باری سے جھگڑنے لگے

ایک دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضرت لوط کو پیش کر کے رحمت الٰہی کے خواستگار ہوئے۔

ولما جاءت رسلنا ابراهیم بالبشریٰ قالوا انا مهلکوا اهل هذه القریة ان اهلها کانوا ظالمین قال ان فیها لوطاً ط قالوا نحن اعلم بمن فیها لننجینه واهله الا امراته کانت من الغابرین

(عنکبوت - ۴)

جب ہمارے فرستادے ابراہیم کے پاس (اولاد کی) بشارت لے کر آئے انھوں نے بیان کیا کہ ہم اس آبادی کے رہنے والوں کو ہلاک کرنے آئے ہیں بیشک وہ ظالم ہیں۔ ابراہیم نے کہا اس گاؤں میں لوط ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہم کو خوب معلوم ہے جو اس میں ہیں ہم ان کو اور انکے گھر والونکو بچا لینگے لیکن ان کی بیوی وہ تو رہ جانے والوں میں سے ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم کے اسی عرض و معروض کا یہ نتیجہ تھا کہ حضرت بارگاہ الٰہی سے انکو یہ خوشخبری سنائی گئی اور ہمیشہ کیلئے یہ قانون الٰہی قرار پایا کہ ایک کی برائی کا بوجھ دوسرے پر لادا نہ جائے۔

ام لم ینبأ بما فی صحف موسیٰ و ابراهیم الذی وفیٰ الا تزر وازرة وزر اخریٰ وان لیس للانسان الا ما سعیٰ ۝

کیا انھیں بتایا نہیں گیا جو موسیٰ کے اور اس ابراہیم کے صحیفوں میں ہے۔ جس نے پورا حق ادا کیا۔ کہ کوئی شخص دوسرے شخص کا بوجھ نہیں اٹھائیگا۔

(نجم - ۳)

اور یہ کہ انسان کے لئے نہیں ہے بلکہ وہی جو کہ اسنے کوشش کی ہے۔

سورۂ انعام کے آخر میں حضرت ابراہیم کے تعلق سے یہ آیت پھر آتی ہے۔ آنحضرت صلعم کو ارشاد ہوتا ہے کہ کہدے کہ ہم تو ابراہیم کے دین کے پیرو ہیں جس کا مسلک یہ تھا۔

قل انّنی ھدانی ربی الی صراط مستقیم دینا قیّما ملّۃ ابراھیم حنیفا وما کان من المشرکین قل ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العالمین لاشریک لہ وبذلک امرت وانا اول المسلمین قل اغیر اللہ ابغی ربّا وھو رب کل شیئ ولا تکسب کل نفس الا علیھا ولا تزر وازرۃ وزر اخریٰ

(انعام - ۲۰)

کہدے کہ مجھے میرے رب نے سیدھا راستہ دکھا دیا ہے سیدھا دین ابراہیم کا دین جو موحد تھا۔ اور مشرکوں میں سے نہ تھا۔ کہدے کہ میری نماز، میری قربانی، میرا جینا، میرا مرنا عالم کے پروردگار اللہ کیلئے ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ اور اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور میں مسلمانوں کا پہلا ہوں۔ کہدے کہ کیا خدا کے سوا کسی اور کو پروردگار چاہوں حالانکہ وہی تو ہر شئے کا رب ہے اور ہر جان کی کمائی اُسی پر ہے۔ کوئی شخص کسی دوسرے شخص کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

یہ سب وہی باتیں ہیں جو حضرت ابراہیم کے صحیفے میں تھیں اور ان کا اعادہ پھر صحیفۂ محمدی میں کیا جا رہا ہے۔

میرا خیال ہے کہ توراہ کا صحیفۂ پیدائش ہی حضرت ابراہیم کے اس عرض معروض کی پوری تفصیل ہے جو انھوں نے حضرت لوط کی قوم کے بارہ میں بارگاہ الٰہی میں پیش کی۔

"ابراہام ہنوز خداوند کے حضور میں کھڑا رہا۔ تب ابراہام نزدیک جا کے بولا کیا تو نیک کو بد کے ساتھ ہلاک کریگا۔ شاید پچاس صادق اس شہر میں ہوں کیا تو اسے ہلاک کریگا۔ اور ان پچاس صادقوں کی خاطر جو اس کے درمیان ہیں اس مقام کو نہ چھوڑیگا۔ ایسا کرنا تجھے بعید ہے۔ کیا تمام دنیا کا انصاف کرنے والا انصاف نہ کریگا۔ اور خداوند نے کہا کہ اگر میں سدوم (قوم لوط کا شہر) میں شہر کے درمیان پچاس صادق پاؤں تو میں انکے واسطے تمام مکان کو چھوڑونگا۔ تب ابراہام نے جواب دیا اور کہا اب دیکھ میں نے خداوند سے بولنے میں جرأت کی۔ اگرچہ میں خاک اور راکھ ہوں شاید پچاس صادق سے پانچ کم ہوں۔ کیا ان پانچ کے واسطے تو تمام شہر کو نیست کریگا۔ اور اس نے کہا اگر میں وہاں پینتالیس پاؤں تو نیست نہ کرونگا۔ پھر اس نے اس سے کہا کہ شاید وہاں چالیس پائے جائیں تب اس نے کہا کہ میں ان چالیس کے واسطے نہ کرونگا۔ پھر اس نے کہا میں منت کرتا ہوں کہ اگر خداوند خفا نہ ہوں تو میں پھر کہوں۔ شاید وہاں تیس پائے جائیں۔ وہ بولا اگر میں وہاں تیس پاؤں تو میں یہ نہ کرونگا۔ دیکھ میں نے

خداوند سے بات کرنے میں جرأت کی شاید وہاں بیس پائے جائیں۔ وہ بولا میں بیس کے واسطے بھی اُسے نیست نہ کرونگا۔ تب اُس نے کہا میں منت کرتا ہوں کہ خداوند خفا نہ ہوں تب میں فقط ابکی بار پھر کہوں شاید وہاں دس پائے جائیں وہ بولا میں دس کے واسطے بھی اُسے نیست نہ کرونگا۔ جب خداوند ابراہام سے باتیں کرچکا تو چلا گیا اور ابراہام اپنے مقام کو پھرا۔"

(باب ۸۔ ۲۳ سے ۳۳ تک)

توراۃ کے اس بیان سے اس "جدال" کی پوری تفصیل معلوم ہوتی ہے جو وہ بار بار سدوم کے گنہگاروں کو بچانے کے لیئے بارگاہِ الٰہی میں پیش کرتے تھے اور اس نرم دلی، بردباری اور رجوع حق کی تصدیق ہوتی ہے جس سے قرآن نے حضرت ابراہیم کو متصف کیا ہے اور ان آیاتِ الٰہی کی تصدیق ہوتی ہے جن کو قرآن نے صحیفۂ ابراہیمی کے حوالے سے پیش کیا ہے۔ اور حضرت ابراہیمؑ کی اس شانِ بشیریت کا اظہار ہوتا ہے جو جمال الٰہی کا پرتو تھی۔

حضرت ابراہیمؑ جب کعبہ کی تعمیر سے فراغت پاتے ہیں اور اپنی اولاد کو اسکی پاسبانی کیلئے بارگاہِ الٰہی میں پیش کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ اس بے آب و دانہ بنجر زمین میں خداوندا اسکو تیرے گھر کی پاسبانی اور تیرے دین کی حفاظت کی خاطر بساتا ہوں۔ خداوندا ان کو روزی دینا۔ ان میں اپنا رسول بھیجنا انکو بتو(ں کی) پوجا سے بچانا۔

واذ قال ابراھیم رب اجعل	اور جب ابراہیم نے کہا کہ اے
ھذا البلد امنًا واجنبنی	میرے پروردگار اس شہر کو امن والا

وبنیّ ان نعبد الاصنام ربّ انہن اضللن کثیرًا من الناس فمن تبعنی فانہ منی ومن عصانی فانک غفور رحیم

(ابراہیم - ۶)

بنا اور مجھے اور میری اولاد کو تو اس سے بچا کہ وہ بتوں کو پوجیں خداوندا ان بتوں نے بہت لوگوں کو گمراہ کیا تو جو میری پیروی کرے وہی مجھ سے ہے اور جس نے میری نافرمانی کی تو بیشک تو بخشنے والا رحمت والا ہے۔

یہ خدا کی بخشش و رحمت کی تحریک کن کے لئے ہو رہی ہے۔ ان کے لیئے جو بت پرست ہوکر ان کی نافرمانی کریں۔

یہ ہے حضرت ابراہیم کی بشیری شان!

صحابہ میں اسکے جلوے

اوپر کی سطروں میں انبیا علیہم السلام کی نذیریت اور بشیریت کی جو تشریح کی گئی ہے وہ میری نہیں بلکہ خود حضور انور صلے اللہ علیہ وسلم کی زبان حق ترجمان سے ادا ہوئی ہے۔ غزوۂ بدر میں جب کفار قریش گرفتار ہوکر آئے تو آنحضرت صلعم نے صحابہ سے مشورہ طلب کیا۔ حضرت عبداللہ بن رواحہ رضؓ نے کہا کہ انکو آگ میں جلا دیا جائے۔ اور حضرت عمر رضؓ نے کہا کہ انکو قتل کردیا جائے لیکن حضرت ابوبکر رضؓ نے عرض کی کہ یارسول اللہ یہ آپکے خاندان اور قوم کے ہیں ان پر رحم فرمائیے۔ آپ نے ان دونوں فریق کے مشورہ کو سنکر فرمایا کہ ایک فریق اپنے پہلے بھائیوں نوح اور موسیٰ کی طرح ہے۔ نوح نے کہا۔

"پروردگار زمین پر کافروں میں سے کسی گھر بسانے والے کو مت چھوڑ۔" اور موسیٰؑ نے کہا ہمارے پروردگار ان کی دولت میٹ دے اور ان کے دلوں کو سخت کر دے۔" اور دوسرا فریق ابراہیمؑ کی طرح ہے۔ ابراہیم نے کہا "جس نے میری پیروی کی وہ مجھ سے ہے اور جس نے میری نافرمانی کی تو تو بخشنے والا اور رحم والا ہے" اور عیسیٰؑ کی طرح ہے۔ کہ عیسیٰؑ نے کہا کہ اگر تو ان کو سزا دے تو وہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو ان کو معاف کر دے تو تو قدرت والا اور حکمت والا ہے۔ (مستدرک حاکم ۳ ص۲۱ و ص۲۲)

اس سے معلوم ہوا کہ آپ نے عبداللہ بن رواحہ رضؓ اور حضرت عمر رضؓ کو حضرت نوحؑ اور حضرت موسیٰؑ کی نذیری شان اور حضرت ابوبکر رضؓ کو حضرت ابراہیم اور حضرت عیسیٰؑ کی بشیری شان کی مثال ظاہر فرمایا۔ اس تفصیل سے معلوم ہو گیا کہ بشیریت اور نذیریت کے کمال سے کیا منشاء ہے۔

عام طور سے ہر نبی نذیر اور بشیر ہے

اس بیان سے کسی کو یہ شبہہ نہ ہو کہ اس مضمون کا منشاء نعوذ باللہ یہ ہے کہ کوئی نبی صرف مبشر یا کوئی نذیر صرف اس معنی میں ہوتا ہے کہ ایک صرف بشارت سناتا ہے اور دوسرا صرف انذار کرتا ہے۔ بلکہ یہ منشاء ہے کہ کسی نبی میں عام وصف انذار کے ساتھ مبشریت کا کمال ہوتا ہے اور کسی میں مبشریت کے عام وصف کے ساتھ نذیریت کا کمال ہوتا ہے۔ ورنہ خود اللہ تعالیٰ نے بلا استثناء تمام پیغمبروں کو بشیر و نذیر ایک ساتھ فرمایا ہے۔ لیکن اس بشیریت و نذیریت کے معنی واضح بھی فرما دیئے ہیں جو عام وصف بشیر و نذیر کی

حقیقت ہیں۔ فرمایا:۔

وما نرسل المرسلین الا مبشرین ومنذرین۔	اور ہم نہیں بھیجتے رسولوں کو لیکن بشارت سنانے والا اور ڈر سنانے والے بنا کر۔

یہ بشارت کیا ہوتی ہے اور یہ ڈر سنانا (انذار) کیسے ہوتا ہے۔ آیت بالا کے ساتھ ہی اس بشارت اور انذار کی یہ تشریح ہے۔

فمن امن واصلح فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون۔ والذین کذبوا بایٰتنا یمسھم العذاب بما کانوا یفسقون۔ (انعام۔ ۵)	تو جو ایمان لایا اور اچھے کام کیئے تو ان کو نہ ڈر ہوگا اور نہ غم۔ اور جنھوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا ان کو ان کی نافرمانی کے سبب سے عذاب چمٹے گا۔

لیکن بشیریت یا نذیریت کے اوصاف غالبہ جن پیغمبروں کو ملتے ہیں انکی بشیریت اور نذیریت کی شان اس سے بہت بلند ہوتی ہے جسکی مثالیں ایک طرف حضرت نوح اور حضرت موسیٰ ہیں۔ دوسری طرف حضرت ابراہیم اور حضرت عیسیٰ میں نظر آتی ہیں اور دونوں کا مجموعہ حضرت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک میں صلوات اللہ علیھم اجمعین

یہ جمال و جلال کے پرتو ہیں کسی نبی میں شان نذیری کا غلبہ اور کسی نبی میں شان بشیری کا کمال، باہم ایک دوسرے پر ترجیح کا سبب نہیں۔ انبیا علیہم السلام کے یہ دونوں اوصاف اللہ

تبارک وتعالی کی شان جلال وجمال کے مظہر ہیں۔ کسی میں جلالی شان کی چمک زیادہ ہوتی ہے اور کسی میں جمالی شان کی۔ جب اور جس زمانہ میں حکمت الٰہی کا اقتضاء جلال یا جمال میں سے جس شانِ کمال کا اظہار ہوتا ہے وہ اس وقت کے پیغمبروں میں ظاہر فرماتا ہے۔ دونوں اسکی شانیں ہیں اور دونوں اسکے اسمائے حسنیٰ۔

الملک القدوس السلام المومن المہیمن العزیز الجبار المتکبر سبحان اللہ عما یشرکون۔

ذبح عظیم

حضرت ابراہیمؑ کو اپنے جس اکلوتے بیٹے کے ذبح کرنے کا خدا کی طرف سے خواب میں حکم ہوا تھا یہود کہتے ہیں کہ وہ اسحاقؑ تھے۔ لیکن مسلمانوں کے نزدیک حضرت اسمٰعیل تھے۔ اور اسی لیئے ذبیح اللہ مسلمانوں میں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کا لقب مشہور ہے۔ اسکے لغوی معنی ہیں خدا کا ذبح کیا ہوا یا خدا کی راہ میں ذبح کیا ہوا۔ اس لقب کا ماخذ قرآن پاک کی یہ آیت ہے:

یا بنیّ انی اریٰ فی المنام انی اذبحک فانظر ماذا تریٰ (والصفٰت ۔ ۳)	(حضرت ابراہیم نے کہا) میرے پیارے بیٹے میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ تجھے ذبح کر رہا ہوں تیری رائے کیا ہے۔

حضرت اسمٰعیل نے جواب میں کہا۔

یا ابت افعل ما تؤمر ستجدنی ان شاء اللہ من الصابرین (والصفٰت ۔ ۳)	اے میرے باپ جو تجھے کہا جاتا ہے وہ کر گذر۔ خدا نے چاہا تو مجھے تو ثابت قدم رہنے والوں میں پائیگا۔

مقدّس باپ نے اپنے بیٹے کے اس صبر و ثبات کو دیکھا تو اُنکو لے کر قربانگاہ کو روانہ ہو گئے۔ جو اُن کی جائے قیام سے کئی دن کی مسافت پر تھی۔ وہاں پہنچکر بیٹے کو لے کر اور آگے بڑھے اور بیٹے کو پیشانی کے بل گرا کر چھری اُن کی گردن پر رکھ دی۔ آواز آئی۔ اے ابراہیم!

قد صدقت الرؤیا انّا کذٰلک نجزی المحسنین	تو نے خواب کو سچ کر دکھایا۔ ہم اسی طرح نیکو کاروں کو جزائے خیر دیتے ہیں۔
(صفٰت۔ ۳)	

طغیانِ ناز بیں کہ جگر گوشۂ خلیل   سر زیر تیغ رفت و شہیدش نمی کنند

ابھی یہ منظر آنکھوں سے دُور نہیں ہونے پایا تھا کہ ندا آئی۔

وفدینٰہ بذبح عظیم	اور ہم نے اس کو (اسمٰعیل کو) ایک بڑی قربانی دے کر چھڑایا
(صفٰت۔ ۳)	

اس آیت میں یہ ذکر ہے کہ خدا فرماتا ہے کہ میں نے ایک دوسری بڑی قربانی کا فدیہ دیکر اسمٰعیل کو اُنکی اس قربانی سے نجات بخشی۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ بڑی قربانی کیا تھی؟ جسکو حضرت اسمٰعیلؑ کی اس قربانی اور فدیہ اور بدلہ قرار دیا گیا۔ مفسرین کی عام روایتیں یہ ہیں کہ جنت کا ایک مینڈھا لا کر حضرت ابراہیم کے سامنے کر دیا گیا کہ وہ حضرت اسمٰعیل کی جگہ قربانی کیا جائے چنانچہ حضرت ابراہیم نے ایسا ہی کیا اور اس مینڈھے کو حضرت اسمٰعیل کی جگہ قربانی کیا۔ مگر یہ روایتیں اسرائیلیات سے زیادہ نہیں اور ان سب کا ماخذ توراۃ ہے۔

> "تب ابراہام نے اپنی آنکھیں اٹھائیں اور اپنے پیچھے ایک
> مینڈھا دیکھا جس کے سینگ جھاڑی میں اٹکے ہیں۔ تب
> ابراہام نے جاکر اس مینڈھے کو لیا اور اسکو اپنے بیٹے کے بدلہ
> میں سوختنی قربانی کے لیے چڑھایا" (پیدائش ۲۲-۱۳)

لیکن قرآن پاک میں اس مینڈھے کا ذکر نہیں بلکہ اس کے بجائے "ایک بڑی قربانی" کہا گیا ہے۔ اگر یہ بڑی قربانی مینڈھے یا بکرے ہی کی صورت میں ہوتی تو قرآن مجید اسے "ایک بڑی قربانی" کیوں کہتا؟

ہمارے مفسرین نے اسکے یہ جوابات دیئے ہیں۔

(۱) چونکہ یہ قربانی کا مینڈھا جنت سے لایا گیا تھا اس لیئے اس کو بڑی قربانی کا لقب ملا۔

(۲) یہ وہی مینڈھا تھا جس کو ہابیل نے قربان کیا تھا اور جس کو خدا نے قبول فرمایا تھا۔ تو چونکہ خدا اسکو قبول کر چکا تھا اسلیئے اسکو بڑی قربانی فرمایا

(۳) ان روایات میں سب سے بہتر جواب حسن بصری کا ہے۔ فرمایا کہ اس بڑی قربانی سے مقصود وہ خاص جانور نہیں جو حضرت ابراہیم کے سامنے قربانی کے لیئے پیش ہوا بلکہ وہ مطلق قربانی ہے جو اسکے بدلے میں پوری ملت کیلئے قیامت تک یادگار سنت قرار پائی۔

جسمانی یادگار کی حیثیت سے اس میں شک نہیں کہ ابراہیمی ملت میں عید قربان یا عید اضحیٰ کا سالانہ جشن، اور اس میں غریبوں اور مسکینوں کے کھلانے اور اور دوستوں کی ضیافت اور خوشی کے اظہار کے لیئے کسی جانور کی قربانی اسی

واقعہ کی یادگار ہے۔ اسلام میں دو ہی تہوار ہیں عید اور بقرعید، بقرعید ملت ابراہیمی کا جشن ہے یعنی اس واقعہ کی یادگار ہے جس کی بنا پر ملت ابراہیمی کی تاسیس اور مکہ میں خانۂ الٰہی کی تعمیر ہوئی اور وہ تعمیر ملت ابراہیم کا قبلہ قرار پائی اور عید ملت محمدی کا جشن ہے یعنی نزول قرآن کی یادگار جس سے بے پردہ عالم میں ملت محمدی کا ظہور ہوا۔

یہ سب کو معلوم ہے کہ حضرت ابراہیم نے اپنے اکلوتے بیٹے کو قربانی کرتے ہوئے خواب میں دیکھا تھا۔ شریعت میں خواب کی دو قسمیں ہیں۔ ایک کا نام رویائے تمثیلی اور دوسرے کا نام رویائے حقیقی ہے۔ رویائے حقیقی میں اصل حقیقت بے پردہ نظر آتی ہے اور وہی مقصود ہوتی ہے جیسے کسی نے خواب میں دیکھا کہ فلاں شخص مرگیا ہے اور وہ واقعی مرگیا تھا۔ یہ رویائے حقیقی ہے۔ رویائے تمثیلی یہ ہے کہ مقصود اس واقعہ سے ملتی جلتی کوئی مشابہ چیز ہو جیسے حضرت یوسف نے قحط کو سوکھی بالوں اور دبلی پتلی گایوں کی صورت میں دیکھا امام خطابی معالم السنن میں کہتے ہیں۔

وبعض الرؤیا مثل یضرب لیتأول علی الوجه الذی یجب ان یصرف الیه معنی التعبیر فی مثله وبعض الرؤیا لا یحتاج الی ذلک بل یاتی کالمشاهدة (فتح الباری جلد ۱۲ صفحہ ۳۸۲ مصر)۔	بعض خواب تمثیل ہوتے ہیں جسکو اس مثالی صورت میں اسلئے بیان کیا جاتا ہے کہ اس طریقہ پر اسکی تعبیر کی جائے جس طریقہ پر ایسے خواب کی تعبیر پھیری جاتی ہے اور بعض خواب اسکے محتاج نہیں ہوتے بلکہ وہ مشاہدہ بن کر سامنے آتے ہیں۔

اس بنا پر ہم کو غور کرنا ہے کہ حضرت ابراہیم نے جو اپنے بیٹے کو قربانی کرتے ہوئے خواب میں دیکھا تو یہ خواب تمثیلی تھا یا حقیقی تھا۔ اس گرہ کے کھلنے سے وفدیناہ بذبح عظیم کے معنی بھی کھل جائینگے۔

درحقیقت اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو جو خواب دکھایا تھا وہ تمثیلی تھا یعنی یہ کہ وہ اپنے بیٹے کو قربانی کر رہے ہیں کے یہ معنی تھے کہ وہ اسکو ہمیشہ کیلئے خدا کی راہ میں خانہ کعبہ کی خدمت گذاری اور دین حنیف کی تبلیغ کیلئے خدا کی راہ میں قربانی کردیں۔ حضرت ابراہیم نے فداکاری کے سچے جوش میں اس خواب کو حقیقی سمجھا اور چلے اپنے اکلوتے بیٹے کو خدا کی راہ میں واقعی جسمانی طور سے قربانی کرنے۔ مکہ کے پاس پہنچکر بیٹے کو قربانگاہ پر چڑھا کر چاہا ہی تھا کہ اسکے گلے پہ چھری پھیر دیں کہ بارگاہ قدس سے ندا آئی قد صدقت الرؤیا۔ اے ابراہیم تو نے اپنا خواب سچ کر دکھایا اور اب خداوند حق نے حضرت ابراہیم کو وحی سے مطلع فرمایا کہ یہ خواب حقیقی نہیں بلکہ تمثیلی تھا۔ اور حضرت اسمٰعیل کی جسمانی قربانی نہیں بلکہ روحانی قربانی مقصود ہے۔ اور یہ جانور کی جسمانی قربانی اس روحانی قربانی کی تمثیل ہے۔ اب غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ وہ "ذبح عظیم" جسکو دیکر حضرت اسمٰعیل جسمانی قربانی سے بچ جاتے ہیں وہ انکی روحانی قربانی ہے۔

روحانی قربانی جسمانی قربانی کے مقابلہ میں یقیناً ذبح عظیم ہے۔ جسمانی قربانی کی تکلیف تو ایک لمحہ کی بات ہے مگر روحانی قربانی تو کسی امر حق کی خاطر ساری زندگی کی جیتے جی کی قربانی ہے جس میں مر کر نہیں بلکہ جی کر حق کی

راہ میں ہر تکلیف اور مصیبت کو انگیز کرنا اور ہر وقت موت کے لیئے آمادہ رہنا ہے۔

حضرت اسمٰعیل نے اسکی خاطر ملک شام کے سبزہ زار کو چھوڑا۔ وہاں کے عیش و آرام کو خیر باد کہا۔ عزیز و اقارب کو ترک کیا اور ایک لق و دق صحرا میں تن تنہا رہنا گوارہ کیا۔ وہاں خدا کے نام کا ایک گھر بنایا اور اسکو آنے جانے والے مسافروں اور سوداگری کے قافلوں کے لیئے مرکزی گذرگاہ ٹھہرایا اور اس طرح دین حق کی تبلیغ اور خانۂ خدا کی پاسبانی کے لیئے نہ صرف اپنی زندگی تک بلکہ محمد رسول اللہ صلعم کے ظہور تک جو رب وابعث فیھم کی ابراہیمی دعا کی قبولیت کا زمانہ تھا۔ اپنی پوری نسل کو ایسے صحرا بے آب و دانہ میں گذار دینے کا حکم دیا۔ یہ تھی وہ عظیم الشان قربانی جو حضرت اسمٰعیل کی جسمانی قربانی کی تمثیل میں حضرت ابراہیم کو دکھائی گئی۔ اور آج کے دن تک یہ روحانی قربانی ملت ابراہیمی کی حقیقت اور نسل اسماعیلی کی شریعت ہے اور جانور کی جسمانی قربانی اس حقیقت کا مجاز ہے اور اسلام میں جہاد اس مجاز کی حقیقت ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوگا کہ وہ ذبح عظیم کا فدیہ جسکے بدلے میں حضرت اسمٰعیل کی جسمانی قربانی معاف کی گئی اُن کی وہ روحانی قربانی ہے جو نسلاً بعد نسلٍ ان پر فرض ہوئی اور اسکی جسمانی تمثیل جانور کی قربانی کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ اور اسی لیئے یہ ہر سال کے جشن قربانی میں حضرت اسمٰعیل کے جسمانی اور روحانی فرزندوں پر واجب ہے۔

جہاد اور شہادت جن کی فضیلتوں میں اسلام کا سارا دفتر لبریز ہے وہ اسی ذبح عظیم کی تفسیریں ہیں۔ جو مسلمان اس ذبح عظیم کا منظر پیش کرتا ہے بارگاہِ قدس سے وہ بقائے دوام، حیات جاوید اور بل ھم احیاء کے سرخ خلعت سے سرفراز ہوتا ہے۔ جنت کے دروازے اسکے لیے کھل جاتے ہیں اور خداوند تعالیٰ اپنے پاس کی روزی سے اسکو سیر فرماتا ہے۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

* * *

قربانی کا اقتصادی پہلو

عید اضحیٰ جس کے معنی جشن قربانی کے ہیں حضرت اسمٰعیل اور حضرت ابراہیم کے تاریخی واقعہ کی یادگار ہے، اس وقت کے جو سامی بادشاہ عراق، شام اور مصر پر حکمران تھے، وہ اپنے نمرودی و فرعونی کبر و نخوت میں مبتلا تھے۔ ہر جگہ آسمان کے ستاروں اور زمین کے بادشاہوں کی پوجا ہو رہی تھی۔ ضرورت تھی کہ ان نمرودوں اور فرعونوں کی جابر و ظالم سلطنتوں کے حدود سے آزاد کسی سرزمین میں اس پیام حق کے لیے جو حضرت ابراہیم کے ذریعہ دنیا میں آیا تھا، کوئی مرکز قائم کیا جائے جو ہر قسم کی دنیاوی سرسبزی و شادابی سے پاک ہو تاکہ سلاطین کی حرص و آز کے ہاتھوں سے وہ ہمیشہ محفوظ رہے۔

انتخاب کی نظر عرب کی اس شور اور بنجر زمین پر پڑی جس کا نام حجاز ہے جو بحر احمر کے کنارے شام اور یمن کے دو زرخیز علاقوں کے بیچ میں آمدورفت کا راستہ اور تجارت کے قافلوں کا گذرگاہ تھا۔ تاہم چونکہ وہ ہر قسم کی روئیدگی اور سیرابی سے مبرّا تھا اسلئے اس میں کوئی مستقل آبادی نہ تھی لیکن سوداگروں

کی آمد و رفت سے وہ تبلیغ کا اہم مرکز ہو سکتا تھا اسلیے زمین کے اس چھوٹے سے ٹکڑے کی قسمت میں ازل سے جو عزت مقدر ہوچکی تھی حضرت ابراہیم کے عہد میں اسکے ظہور کا وقت آیا۔

حجاز دعوت حق کا مرکز قرار پایا اور خانہ کعبہ کی تعمیر اور تطہیر کا حکم آیا اور اسکی پاسبانی کے لیے حضرت ابراہیم کو اپنی سب سے پیاری اور اکلوتی اولاد حضرت اسمٰعیل کی قربانی کا منظر خواب میں دکھایا گیا۔ اس جسمانی قربانی کے خواب کی تعبیر روحانی قربانی تھی۔ حضرت ابراہیم نے مژدہ سمجھکر اپنے خواب کی جسمانی تکمیل کرنی چاہی تو ندا آئی ــ اے ابراہیمؑ تم اپنے خواب کو پورا کرچکے اور اب اس خواب کی تعبیر وہ "ذبح عظیم" یعنی عظیم الشان قربانی ہے جو اپنی جان کو راہِ حق میں دیکر اور اپنے مال کو خدا کی راہ میں لٹا کر ادا کرسکتے ہو۔ اس رمز کی جسمانی تمثیل جانور کی قربانی ہے۔ جو ہر حاجی پر ہر سال فرض ہے۔ ہر مسلمان پر جس میں استطاعت ہو واجب ہے۔

اس خواب کی حقیقی تعبیر کی تکمیل میں حضرت ابراہیم نے اپنے اکلوتے بیٹے کو شام کے مرغزار سے لاکر حجاز کے بے آب و دانہ اور شور زمین میں خانہ خدا کے پاس آباد کیا۔ تاکہ حق کا پیغام اور توحید کی دعوت سلاطین زمانہ کی جابرانہ تعدّی سے محفوظ رہکر آخری پیغام الٰہی کے ظہور کے لیے تیار رہے۔

اس بے آب و دانہ بنجر اور شور زمین میں کبھی انسانی آبادی کی بقا کسی مادی اقتصادی انتظام کے بغیر ناممکن تھی اور ہے۔ اسکے لیے قدرت الٰہی نے دو انتظام کیے۔ حج اور قربانی۔ حج کے علاوہ اپنے روحانی فیوض و برکات

اقوام عالم کی تجارتی نمائشگاہ یا عالمگیر تجارتی میلہ ٹھہرایا۔ اشہر حرم کے مامون زمانہ میں عرب کے سارے گوشوں سے تاجر اور سوداگر آتے اور مکہ کے میدان میں قیام کرکے سال بھر کی روزی پیدا کرتے۔

اسی نکتہ کو سامنے رکھ کر حضرت ابراہیم کی اس دعا کے معنی سمجھیے:۔

واذ قال ابراھیم رب اجعل ھذا البلد امنا وارزق اھلہ من الثمرات (بقرہ۔ ۱۵)	اور جب ابراہیم نے کہا۔ اے میرے پروردگار اسکو امن والا شہر بنا۔ اور یہاں کے رہنے والونکو کچھ پھلوں میں سے روزی کر
ربنا انی اسکنت من ذریتی بواد غیر ذی ذرع عند بیتک المحرم ربنا لیقیموا الصلوۃ فاجعل افئدۃ من الناس تھوی الیھم وارزقھم من الثمرات لعلھم یشکرون (ابراہیم۔ ۶)	اے ہمارے پروردگار! میں نے اپنی کچھ اولاد بن کھیتی کے میدان میں تیرے عزت والے گھر کے پاس اسلیئے بسائی ہے کہ نماز کو قائم کریں۔ تو انسانوں کے کچھ دلوں کو انکی طرف مائل کر اور ان کو کچھ پھلونکی روزی دے تاکہ وہ شکر گذار ہوں۔

حج کی تجارتی گرم بازاری اور حاجیونکی آمد و رفت سب اسی لیئے ہے تاکہ اسکے ذریعہ اس ویرانہ کی روحانی وجسمانی و مالی آبادی ہو۔ اسلام آیا تو لوگوں نے سمجھا کہ روحانی مقصد سے حج کے مالی مقاصد رد کر دیئے گئے۔ مگر خدا نے تصریح کی کہ ایسا نہیں ہے۔ فرمایا:۔

لیس علیکم جناح ان تبتغوا
فضلا من ربکم (بقرہ-۲۵)

تمہارے لئے یہ گناہ نہیں کہ (حج میں) خدا کی روزی کو تلاش کرو۔

اسی لئے خدا کی روزی تلاش کرنے والے حاجیوں کیلئے راستوں کے امن کا حکم دیا گیا۔ فرمایا۔

یا ایہا الذین امنوا لا تحلوا
شعائر اللہ ولا الشہر الحرام
ولا الہدی ولا القلائد و
لا آمین البیت الحرام یبتغون
فضلا من ربہم و رضوانا
(مائدہ-۱)

اے ایمان والو! اللہ کے شعائر کی بے توقیری نہ کرو۔ اور نہ حرمت والے (حج کے) مہینے کی۔ اور نہ حج کی قربانی کی اور نہ قربانی کے جانوروں کے پٹوں کی اور نہ انکی جو عزت والے گھر (کعبہ) کے قصد سے نکلے ہوں۔ اپنے پروردگار کے فضل (تجارت) اور اسکی رضامندی کی تلاش میں۔

اس سے معلوم ہوا کہ حج کے اغراض میں ایک اہم غرض اسکا تجارتی اور اقتصادی پہلو ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم کو اس اعلان کا حکم ہوا تھا:۔

و اذن فی الناس بالحج
یاتوک رجالا وعلی کل ضامر
یاتین من کل فج عمیق ۔
لیشہدوا منافع لہم و

اور لوگوں میں حج کو پکارتے۔ وہ پیادہ اور ہر دبلی پتلی سواریوں پر ہر دور دراز راستے سے تیرے پاس آئینگے تاکہ اپنے (دینی و دنیاوی)

ویذکروا اسم اللہ فی ایام معلومات علی ما رزقھم من بھیمۃ الانعام فکلوا منھا واطعموا البائس الفقیر (حج - ۴)	منافع کے مقاموں پر حاضر ہوں اور چند مقررہ دنوں میں اللہ کا نام جانوروں پر لیں جو ہم نے ان کو روزی کئے تو ان جانوروں کے گوشت میں سے کچھ کھاؤ اور بدحال فقیروں کو کھلاؤ۔

ان آیتوں میں خاص تصریح ہے کہ حج کے مقاصد میں سے ایک خاص مقصد یہ ہے کہ لوگ تجارتی و مالی منافع کے مقاموں پر اکٹھے ہوں باہم مبادلہ اور خرید و فروخت سے اقتصادی فائدے اٹھائیں۔ اسی لیے بعض مفسروں نے آیت میں منافع سے مراد تجارت لی ہے اور کسی نے مغفرت مگر اکثروں نے ان دونوں کو شامل کیا ہے۔

آیت میں اس بات کی بھی تصریح ہے کہ قربانی سے مقصود یہ ہے کہ جانوروں کی جو نعمت انسانوں کو ملی ہے اسکا وہ شکریہ ادا کریں اور اس مسرت اور جشن کے موقع پر خود اسکا گوشت کھائیں اور فقیروں اور مسکینوں کو کھلائیں کہ وہ بھی اس خوشی میں شریک ہوسکیں۔ قربانی کا یہ مقصد نہیں کہ نفس جانور کی خونریزی خدا کو محبوب ہے یا اسکا گوشت اسکو پہنچتا ہے

فرمایا۔

لن ینال اللہ لحومھا و لا دماؤھا ولکن ینالہ التقوی	اللہ کے پاس قربانی کے جانور کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا بلکہ تمہارے

منکم (حج - ۵)   دل کی پرہیزگاری پہنچتی ہے۔

اب معلوم ہوا کہ حج میں قربانی کی غرض ایک تو یہ ہے کہ اس جشن میں دعوت کا سامان ہو۔ دوسری غرض یہ ہے کہ بدحال فقیروں کو کھلایا جائے۔ اسلئے قربانی کے اتنے حصے کے علاوہ جو ذاتی صرف میں آئے بقیہ کل گوشت پوست سب فقیروں کو ہدیہ ہے۔

دولت کا سرچشمہ تین چیزیں ہیں۔ زراعت، صنعت اور مویشی کی پرورش۔ عربوں کے پاس زراعت نہیں اور نہ صنعت ہی ہے اسلئے دوسری قوموں کے تجارتی سامانوں کی دلالی کے بعد جو چیز انکی دولت کا سرمایہ ہے وہ جانوروں کی پرورش ہے اور یہی انکی سب سے بڑی دولت ہے۔

بے مایہ عربوں کو بیت حرام کی پاسبانی کی اجرت اور انکی اقتصادی امداد کا ذریعہ یا تو خیرات ہو سکتی تھی جو چار درجہ انکی دنائت اور پست حالی کو ہر حال میں بڑھاتی جس طرح وہ آج کل خلاف شریعت خیرات لے لے کر تمام دنیا کی نگاہوں میں عربوں کی عزت کو بٹہ لگا رہے ہیں یا کوئی دوسری صورت ہوتی۔ اسلام نے دوسری صورت نکالی اور وہ انکی پرورش کیلئے تجارت، حاجیوں کا کرایہ مکان، حاجیوں کی خدمت کی مزدوری۔ حاجیوں کی سواری کی اجرت اور دوسرے ذریعے مقرر کئے ہیں انہی میں سے ایک قربانی بھی ہے۔

پہلے زمانہ میں پانچ لاکھ حاجیوں کا تخمینہ ہوتا تھا اور اب ایک لاکھ، ہر حاجی کم از کم ایک دنبہ یا بکرا قربانی کرتا ہے، بعض اونٹ کرتے ہیں جن کی گو قیمت زیادہ ہوتی ہے مگر اس میں شرکت بھی ہوتی ہے۔

بہرحال اوسط ایک لاکھ دنبہ رکھ لیجئے، ایک دنبہ کی قیمت اوسطاً چار روپئے ہوتی ہے تو اس طرح اہل بادیہ عرب کو ہر سال حج میں کم از کم چار لاکھ روپئے تقسیم ہوتے ہیں۔ اور پہلے کے حساب سے بیس لاکھ روپئے تقسیم ہوتے تھے۔

غیر حاجی مسلمان ہندوستان کے علاوہ دوسرے ملکوں میں بھی جو قربانی کرتے ہیں اُسکا روپیہ بھی ہر ملک کے دیہاتی مسلمانوں کو پہنچتا ہے۔ ہندوستان میں گو اکثر قربانی کے جانور قصائیوں کے ذریعہ خریدے جاتے ہیں۔ مگر شاید مسلمانوں سے زیادہ نامسلمان مویشی کی پرورش کرتے ہیں اور وہ فائدہ اٹھاتے ہیں مگر یہ قصور کس کا ہے؟

جانور کا گوشت، پوست، ہڈی، سب کی قیمت بازار میں ہے اور ان سب کا نفع زکوٰۃ کی طرح مستحقین کے لیئے مخصوص ہے۔ اگر عرب یا حجاز کی حکومت اسکا مناسب انتظام نہیں کرتی اور اُسکا نفع حاصل کر کے غریبوں کو نہیں دیتی تو یہ قصور اسلام کا نہیں مسلمانوں کا ہے۔ اسکے لیئے اسلام میں اصلاح کی ضرورت نہیں، مسلمانوں میں اصلاح کی ضرورت ہے۔

عرب سے باہر دوسرے اسلامی ملکوں کا حال گو نہیں معلوم مگر اسکو ہندوستان پر قیاس کیا جاسکتا ہے۔ ہندوستان میں ۸ کروڑ مسلمانوں میں ۸ لاکھ قربانیاں ہوتی ہونگی۔ اور آٹھ لاکھ قربانیوں کی کھالوں کی قیمت اگر آٹھ ہی لاکھ کم و بیش رکھی جائے تو یہ آٹھ لاکھ روپئے سالانہ عربی مدرسوں، مکتبوں، قومی اداروں اور شہر و دیہات کے غریبوں میں بانٹے جاتے ہیں

اگر ہر سال ان آٹھ لاکھ روپیوں کے جمع وخرچ کا ٹھیک انتظام نہیں کیا جاتا ہے تو یہ مسلمانوں کا قصور ہے۔ پھر بھی یہ معلوم ہو کہ ہندوستان کے تعلیمی اداروں کے کئی مہینوں کے اخراجات اس قربانی کی مد سے پورے ہوتے ہیں۔

جشن قربانی کے اظہار کیلئے کوئی ایسا طریقہ جس میں جشن کا اظہار ہو باہم دوستوں کی سادہ دعوت اور ہدیہ کا انتظام ہو اور پھر غریبوں اور مسکینوں اور قومی ضرورتوں کا فنڈ بھی اس سے قائم ہو فدیناہ بذبح عظیم کا مصداق بھی ہو قربانی کے سوا کوئی دوسرا نہیں۔

آج کل کی مہذب سلطنتوں میں ٹیکس کے دو طریقے ہیں ایک براہ راست ٹیکس جیسے انکم ٹیکس۔ دوسرا بواسطہ ٹیکس جس طرح ہم اس سلطنت میں ہر چیز پر ہر وقت ٹیکس ادا کر رہے ہیں۔ مگر یہ دیکھا گیا ہے کہ براہ راست ٹیکس ہمیشہ گراں گذرتا ہے۔ اور بواسطہ ٹیکس کبھی معلوم بھی نہیں ہوتا یہی سبب ہے کہ جتنے لوگ زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اس سے زیادہ لوگ قربانی دیتے ہیں۔ اسلام نے ان دونوں ٹیکسوں سے کام لیا ہے۔ زکوٰۃ براہ راست انکم ٹیکس ہے اور قربانی بواسطہ ٹیکس ہے۔ اور اس کی ادائی کا راز اسی قربانی کے پرپیچ رمز میں ہے۔ اگر کوئی اس دینی راز کے نفسیاتی فلسفہ کو کھول کر اسکو نقد روپئے سے بدلنا چاہے تو وہ دیکھے گا کہ چند ہی سال میں بیشتر بے اثر اور عید اضحی کا فلسفہ باطل ہو جائے گا۔ اور [illegible] جشن نہیں بلکہ تحصیل وصول کا [illegible]

دل بن جائے گا۔

الغرض قربانی بہت سے نفسیاتی، روحانی اور مادی اقتصادی فوائد پر مبنی ہے۔ اور اس میں جو کمی نظر آتی ہے وہ مسلمانوں کے ہر شعبہ میں نمایاں ہے۔ ضرورت ہے کہ مسلمان اپنی اصلاح کریں اسلام کی اصلاح نہیں کہ وہ ہر اصلاح سے پاک و بلند ہے۔

اسلام میں حیوانات کے ساتھ سلوک

اسلام دنیا میں لطف و محبت کا جو عام پیغام لیکر آیا تھا اسکا سلسلہ حیوانات تک وسیع ہے اس لیے حیوانات کے ساتھ متعدد طریقوں سے سلوک کرنے کی ہدایت کی۔ اہل عرب وحشت اور قساوت کی وجہ سے حیوانات پر طرح طرح کے مظالم کرتے تھے۔ وہ جانوروں کو اندھا دھند مار کر گرا دیتے تھے اور لوگوں سے کہتے تھے کہ تم ان کو کھا جاؤ اور اسکو فیاضی سمجھتے تھے۔ دو آدمی شرط باندھ کر کھڑے ہو جاتے تھے اور باری باری سے اپنا اپنا ایک اونٹ ذبح کرتا چلا جاتا تھا۔ جو رک جاتا وہ ہار جاتا۔ یہ سب جانور دوست احباب کی دعوت میں نذر ہو جاتے تھے۔ یہ بھی فیاضی سمجھی جاتی تھی۔ ان واقعات کا ذکر اشعار عرب میں موجود ہے۔ ایک دستور یہ بھی تھا کہ جب کوئی مرجاتا تو اسکی سواری کے جانور کو اسکی قبر پر باندھتے تھے اور اسکو دانہ گھاس اور پانی نہیں دیتے تھے اور وہ اسی حالت میں سوکھ کر مرجاتا ایسے جانور کو بلیہ کہتے تھے۔ اسلام آیا تو اس نے اس سنگدلی کو مٹا دیا۔

عرب میں ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ جانور کو کسی چیز سے باندھ کر اس پر

نشانہ لگاتے تھے۔ آنحضرت صلعم نے اس قسم کے جانوروں کے گوشت کو ناجائز قرار دیا اور عام حکم دیا کہ کسی ذی روح چیز کو اس طرح نشانہ نہ بنایا جائے[1]۔ ایک بار ایک لڑکا اسی طرح ایک مرغی کو باندھ کر تیر کا نشانہ بنا رہا تھا حضرت عبد اللہ بن عمر رض نے مرغی کو کھول دیا۔ اور مرغی کے ساتھ اس لڑکے کو لیکر اسکے خاندان میں آئے اور کہا کہ اپنے لڑکے کو اس سے منع کرو کیونکہ رسول اللہ صلعم نے اس طریقہ سے جانور یا اور کسی جاندار کے نشانہ بنانے کی ممانعت فرمائی ہے۔ اسی طرح کچھ لوگ مرغی کو باندھ کر نشانہ بنا رہے تھے حضرت عبد اللہ بن عمر رض کا گذر ہوا تو وہ لوگ بھاگ گئے۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رض نے کہا کہ ایسا کس نے کیا ہے۔ جو لوگ ایسا کرتے ہیں رسول اللہ صلعم نے ان کو ملعون قرار دیا ہے[2]۔ اس سے بھی زیادہ بے رحمانہ طریقہ یہ تھا کہ زندہ اونٹ کے کوہان اور دنبہ کے دم کی چکتی کاٹ کر کھاتے تھے۔ رسول اللہ صلعم نے مدینہ میں آکر یہ حالت دیکھی تو فرمایا کہ اس طریقہ سے زندہ جانوروں کا جو گوشت کاٹ کر کھایا جاتا ہے وہ مردار ہے[3]۔ یہ ایک خاص صورت تھی لیکن عموماً زندہ جانوروں کے مثلہ کرنے یعنی انکے کسی عضو کے کاٹنے کی ممانعت فرمائی اور ایسا کرنے والے پر لعنت بھیجی[4]

---

[1] ترمذی ابواب الصید باب ما جاء فی کراهیۃ اکل المصبورۃ ص ۲۵۵ [2] بخاری کتاب الذبائح والصید باب ما یکرہ من المثلۃ والمصبورۃ والمجثمۃ [3] ترمذی ابواب الصید باب ما جاء ما قطع من الحی فھو میت [4] بخاری کتاب الذبائح والصید باب ما یکرہ من المثلۃ والمصبورۃ والمجثمۃ

بلا ضرورت کسی جانور کے قتل کرنے کو بہت بڑا گناہ قرار دیا[1]۔ ایک حدیث میں ہے کہ کسی نے اگر گنجشک یا اس سے بھی کسی چھوٹے جانور کو اسکے حق کے بغیر ذبح کیا تو خدا اسکے متعلق اس سے باز پرس کریگا۔ صحابہ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! اس کا حق کیا ہے؟ فرمایا کہ اسکو ذبح کرے اور کھائے یہ نہیں۔ کہ اس کا سر کاٹ کے پھینک دے[2]۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جن جانوروں کا گوشت کھایا نہیں جاتا اور وہ درندہ بھی نہیں اُن کا مارنا جائز نہیں۔ سنن نسائی میں ہے کہ جو شخص گنجشک کو بلا ضرورت ماریگا۔ وہ قیامت کے دن خدا کے یہاں فریاد کریگی کہ فلاں نے مجھ کو بلا ضرورت مارا ہے۔ اس سے اسکا کوئی فائدہ نہ تھا[3]۔ جو جانور کوئی نقصان نہیں پہنچاتے یا اُن سے انسانوں کو کوئی فائدہ پہنچتا ہے ان کا مارنا بھی جائز نہیں چنانچہ آپ نے خاص طور پر چیونٹی، شہد کی مکھی، ہُدہُد اور صرو کے مارنے کی ممانعت فرمائی ہے[4]۔

جو جانور ضرورۃً مارے یا ذبح کئے جاتے ہیں انکے مارنے یا ذبح کرنے میں بھی ہر طرح کی نرمی کرنے کا حکم دیا۔ ایک حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ خدا نے ہر چیز پر احسان کرنا فرض کیا ہے اسلئے جب تم لوگ کسی جانور کو مارو تو اچھے طریقے سے مارو۔ اور جب ذبح کرو۔ تو

---

[1] مستدرک حاکم جلد ۲ ص ۱۸۲ [2] مشکوٰۃ کتاب الصید والذبائح ص ۳۵۵ [3] نسائی کتاب الضحایا ص ۶۴۹ [4] مشکوٰۃ کتاب الصید والذبائح ص ۳۶۲

تو اچھے طریقے سے ذبح کرو۔ تم میں ہر شخص چھری کو تیز کر لے اور اپنے ذبیحہ کو آرام پہنچائے[1]

ایک حدیث میں ہے کہ ایک صحابی نے کہا کہ یا رسول اللہ میں بکری کو ذبح کرتا ہوں تو مجھے اس پر رحم آتا ہے۔ یا یہ کہ مجھے اس پر رحم آتا ہے کہ بکری کو ذبح کروں۔ فرمایا کہ اگر تم بکری پر رحم کرتے ہو تو خدا تم پر رحم کریگا[2]

یہی وجہ ہے کہ دانت سے کاٹ کر یا ناخن سے خراش دیکر جانوروں کے ذبح کرنے کی ممانعت فرمائی[3]۔ کیونکہ اس سے جانوروں کو تکلیف ہوتی ہے۔ کنکر، پتھر یا غلیل چلانے کی بھی ممانعت فرمائی۔ اور فرمایا کہ اس سے نہ شکار ہو سکتا نہ دشمن شکست کھا سکتا۔ البتہ اس سے دانت ٹوٹ سکتا ہے اور آنکھ پھوٹ سکتی ہے[4]۔ مطلب یہ کہ بلا ضرورت جانوروں اور پرندوں کو جسمانی صدمہ پہنچانا جائز نہیں۔

جانوروں کے ساتھ جو بے رحمیاں کی جاتی تھیں ان کا اصل سبب یہ تھا کہ اہل عرب کو یہ معلوم نہ تھا کہ جانوروں کو دکھ پہنچانا گناہ کا کام ہے۔ اس لیئے رسول اللہ صلعم نے اہل عرب کو بتایا کہ جس طرح انسانوں کی ایذا رسانی ایک شرعی جرم ہے اسی طرح جانوروں کی ایذا رسانی بھی ایک

---

[1] مسلم کتاب الصید والذبائح باب الامر باحسان الذبح والقتل و تحدید الشفرہ [2] مسند احمد بن حنبل جلد ۳ ص۴۳۶ [3] نسائی ص۱۶۷ [4] بخاری کتاب الذبائح والصید و باب الخذف والبندقہ۔

مذہبی گناہ ہے چنانچہ ایک عورت کی نسبت آپ نے فرمایا کہ اس پر صرف اسلیئے عذاب ہوا کہ اس نے ایک بلی کو باندھ دیا اور اسکو کھانا پانی کچھ نہ دیا۔ اور آخر وہ اسی طرح بندھی بندھی مرگئی[1] بلکہ لوگ چونکہ انسانوں کی بہ نسبت جانوروں کو زیادہ ستاتے ہیں اس لئے وہ اس معاملے میں بہت زیادہ گنہگار ہیں چنانچہ آپ نے فرمایا کہ تم لوگ جانوروں کے ساتھ جو بدسلوکیاں کرتے ہو اگر خدا انکو معاف کردے تو سمجھو کہ اس نے تمھارے بکثرت گناہ معاف کر دیئے[2]

ایک حدیث میں ہے کہ ایک پیغمبر کسی درخت کے نیچے اترے تو انکو ایک چیونٹی نے کاٹ لیا۔ انھوں نے پہلے اپنا سامان اس جگہ سے ہٹایا پھر تمام چیونٹیوں کو آگ سے جلا دیا۔ اس پر خدا نے انکو وحی کے ذریعے سے متنبہ کیا کہ صرف ایک ہی چیونٹی کو کیوں نہیں جلایا[3] یعنی قصاص کی مستحق صرف یہی چیونٹی تھی جس نے کاٹا تھا۔ تمام چیونٹیوں کا قصور نہ تھا۔ ایک حدیث میں ہے کہ ایک سفر جہاد میں صحابہ کرام ایک چڑیا کے دو بچے پکڑ لائے۔ چڑیا فرط محبت سے انکے گرد منڈلانے لگی۔ رسول اللہ صلعم قضائے حاجت کے لئے گئے ہوئے تھے۔ واپس آکر یہ حالت دیکھی تو فرمایا کہ اسکے بچوں کو پکڑ کر کس نے اسکو بیقرار کیا ہے۔ اسکے بچوں کو چھوڑ دو۔ صحابہ کرام نے چیونٹیوں کے ایک گھر کو بھی جلا دیا تھا۔ دریافت کرنے پر جب معلوم ہوا کہ

---

[1] بخاری کتاب الانبیاء ص ۴۹۵ [2] مسند احمد بن حنبل جلد ۶ ص ۴۴۱ [3] بخاری جلد اول کتاب بدء الخلق ص ۴۶۷

یہ خود صحابہ کا فعل تھا۔ تو فرمایا کہ آگ کی سزا دینا صرف خدا ہی کے لیئے سزاوار ہے[1]

اسی طرح اہل عرب کو یہ معلوم نہ تھا کہ جس طرح انسانوں کے ساتھ سلوک کرنا ثواب کا کام ہے بعینہٖ اسی طرح جانوروں اور پرندوں کیساتھ سلوک کرنا بھی موجب ثواب ہے۔ اسی عدم واقفیت کی بنا پر ایک صحابی نے آپ سے دریافت کیا کہ میں نے خاص اپنے اونٹوں کے لیئے پانی کے جو حوض بنائے ہیں اُن پر بھولے بھٹکے اونٹ بھی آجاتے ہیں۔ اگر میں انکو پانی پلادوں تو کیا مجھکو اس پر ثواب ملے گا؟ فرمایا کہ ہر پیاسے یا ہر ذی حیات کے ساتھ سلوک کرنے پر ثواب ملتا ہے[2]

ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص راستے میں جارہا تھا کہ اسکو سخت پیاس لگ گئی۔ اتفاق سے اسکو ایک کنواں مل گیا اور اُس نے کنوئیں میں اتر کر پانی پی لیا۔ کنوئیں سے نکلا تو دیکھا کہ کتا پیاس سے زبان نکال رہا ہے۔ اور کیچڑ چاٹ رہا ہے۔ اُس نے اپنی پیاس کی شدت کو یاد کرکے اس پر ترس کھایا اور کنوئیں میں اتر کر پانی لایا اور اسکو پلایا۔ خدا کے نزدیک اسکا یہ عمل مقبول ہوا اور خدا نے اسکو بخش دیا۔ صحابۂ کرام نے اس واقعہ کو سُنا تو بولے کہ یا رسول اللہ کیا جانوروں کے ساتھ سلوک کرنے میں بھی

---

[1] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی کراہیۃ حرق العدو [2] ابن ماجہ باب الادب۔ باب فضل صدقۃ الماء۔

ثواب ملتا ہے؟ فرمایا کہ ہر ذی حیات کے ساتھ سلوک کرنا موجب ثواب ہے[1]
اس اصول کی بنا پر رسول اللہ صلعم نے مسلمانوں کے تمام احسانات کو عام کر دیا اور فرمایا کہ جو مسلمان درخت نصب کرتا ہے یا کھیتی باڑی کرتا ہے اور اسکو چڑیا یا انسان یا جانور کھاتا ہے تو یہ ایک صدقہ یعنی ثواب کا کام ہے[2]

اس اصول کے بتانے کے بعد عملی طور پر جانوروں کے ساتھ سلوک کرنے کے متعدد اصول بتائے یعنی :-

۱- جو جانور جس کام کے لیئے پیدا کیا گیا ہے اس سے وہی کام لینا چاہیئے۔ چنانچہ فرمایا کہ ایک شخص ایک بیل پر سوار ہو کر جا رہا تھا بیل نے مڑ کر کہا کہ میں اس کے لیئے نہیں پیدا کیا گیا ہوں۔ صرف کھیتی باڑی کے لیئے پیدا کیا گیا ہوں[3] نیز فرمایا کہ اپنے جانوروں کی پیٹھ کو منبر نہ بناؤ۔ خدا نے انکو تمہارا فرمانبردار صرف اسلیئے بنایا ہے کہ وہ تم کو ایسے مقامات میں پہنچا دیں جہاں تم بڑی مشقت سے پہنچ سکتے تھے۔ تمہارے لیئے خدا نے زمین کو پیدا کیا ہے اپنی ضرورتیں اسی پر پوری کرو[4]۔ اگرچہ رسول اللہ صلعم نے بعض موقعوں پر اونٹ کی پشت پر بیٹھ کر خطبہ دیا ہے۔ اسلیئے اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ بلا ضرورت سواری کے جانوروں کی پشت پر بے سبب

---

[1] بخاری کتاب الادب باب رحمۃ الناس و البہائم [2] بخاری ابواب الحرث والمزارعۃ باب فضل الزرع والغرس اذا اکل منہ [3] بخاری ابواب الحرث والمزارعۃ باب استعمال البقر للحراثۃ [4] ابوداؤد کتاب الجہاد فی الوقوف علی الدابۃ۔

بیٹھے رہنا مناسب نہیں کہ اس سے جانور کو غیر ضروری تکلیف ہوتی ہے صرف سفر کی حالت میں اس پر سوار ہونا چاہیئے۔

۲۔ جانوروں کے آرام و آسائش کا خیال رکھنا چاہیئے چنانچہ فرمایا کہ جب تم لوگ سرسبزی اور شادابی کے زمانہ میں سفر کرو تو اونٹوں کو زمین کی سرسبزی سے فائدہ پہنچاؤ اور جب قحط کے زمانہ میں سفر کرو تو اسکو تیزی کے ساتھ چلاؤ[1] تاکہ نقاہت کی وجہ سے اسکو گھاس یا چارے کی جو تکلیف راستہ میں ہوتی ہے اس سے وہ جلد نجات پائے۔ ایک بار آپ نے ایک اونٹ دیکھا جس کا پیٹ بھوک کی وجہ سے پیٹھ سے لگ گیا تھا۔ فرمایا ان بے زبان جانوروں کے معاملہ میں خدا سے ڈرو۔ ان پر سوار ہو تو انکو اچھی حالت میں رکھ کر سوار ہو اور ان کو کھاؤ تو ان کو اچھی حالت میں رکھکر کھاؤ۔

ایک بار آپ ایک انصاری کے باغ میں رفع حاجت کے لیئے گئے۔ اس میں ایک اونٹ تھا جو رسول اللہ صلعم کو دیکھکر بلبلایا اور آب دیدہ ہو گیا۔ آپ اس کے پاس گئے اور اسکی کنپٹی پر ہاتھ پھیرا اور فرمایا کہ یہ کس کا اونٹ ہے؟ ایک انصاری نوجوان نے آکر کہا کہ "میرا یا رسول اللہ" فرمایا اس جانور کے بارے میں جس کا خدا نے تم کو مالک بنایا ہے خدا سے نہیں ڈرتے۔ اس نے مجھ سے شکایت کی کہ تم اسکو بھوکا

---

[1] مسلم کتاب الامارۃ باب مراعاۃ مصلحۃ الدواب فی السیر والنہی عن التعریس فی الطریق۔

رکھتے ہو اور اس پر جبر کرتے ہو[1]

۳۔ جانوروں کے منہ پر مارنے یا اس پر داغ دینے کی ممانعت فرمائی اور ایسا کرنے والے کو ملعون قرار دیا۔[2]

۴۔ جانوروں کے باہم لڑانے سے بھی منع فرمایا[3] کہ اس سے وہ بے فائدہ گھائل اور زخمی ہو کر تکلیف پاتے ہیں۔

---

[1] ابو داؤد کتاب الجہاد باب ما یومر بہ من القیام علی الدواب والبہائم۔ [2] ابو داؤد کتاب الجہاد باب وسم الدواب۔ [3] ابو داؤد کتاب الجہاد باب فی التحریش بین البہائم۔

⁂

اسلام اور سوشلزم

(۱)

آج کل کی جدید عربی مصطلحات میں "سوشلزم" کو "اشتراکیت" سے تعبیر کرتے ہیں اور سوشلزم کے معتقد اور پیرو یعنی سوشیالسٹ کو "اشتراکی" کہتے ہیں۔

سوشلزم اس خیال پر مبنی ہے کہ دنیا میں ایک طرف تو ایسے اشخاص پائے جاتے ہیں جو لاکھوں اور کروڑوں روپئے کی جائداد رکھتے ہیں اور جنکے قبضے میں اُن کی حاجت سے بہت زیادہ روپیہ ہے۔ دوسری طرف ایسے افراد پائے جاتے ہیں جن کے پاس اتنا بھی نہیں جس سے اپنی ستر پوشی کرسکیں یا شکم سیر ہو سکیں۔ اسلئے وہ کروڑوں روپئے جو ارباب ثروت کے پاس بیکار پڑے ہیں وہ ان فقراء اور مساکین پر تقسیم کردیئے جائیں تاکہ دونوں گروہ بہ آسانی زندگی بسر کرسکیں۔

اس مسئلہ کو زیادہ صاف کرنے کے لیے ہم کو علم اقتصاد سیاسی یعنی پولیٹیکل اکانمی کی طرف رُخ کرنا چاہیئے۔ اکانمی نے یہ طے کردیا ہے کہ انسان کی

ہر قسم کی دولت اور پیداوار کے اصول اولی دو چیزیں ہیں "محنت" اور "راس المال" کیونکہ انسان کے تمام ذرائع آمدنی کا اصلی منبع صرف دو چیزیں ہیں "زراعت" اور "صنعت" انکے علاوہ اور دوسری ہر قسم کی آمدنیاں انہیں دونوں ذرائع مذکورہ کے ماتحت ہیں، مثلاً "زمینداری" کہ اسکی اصلی آمدنی زراعت پر موقوف ہے۔ "تجارت" صنعت اور زراعت کی پیداوار کے باہمی تبادلہ کا نام ہے۔ نوکریونکے ذریعے سے جو روپیہ مالک سے وصول کیا جاتا ہے وہ درحقیقت اسی زراعت اور صنعت کی بواسطہ یا بلاواسطہ آمدنی ہے۔

پہلے ہمکو صنعت اور زراعت کی حقیقت پر غور کرنا چاہیئے۔ صنعت ان مادی چیزونکو جنکو ہر مقام پر یا بعض بعض مقام پر خدا نے فطرتی طور سے پیدا کر دیا ہے اور جو بیکار پڑی ہیں، حاجت انسانی کے مناسب بنانے کا نام ہے۔ ان مادی چیزونکو حاجت انسانی کے مناسب بنانے کے لیئے دو چیزونکی ضرورت ہے "کام کرنے والونکی محنت کی" اور "ان آلات اور اوزار کی جن سے کام کرنے والا اپنے اثر فاعلی کو ان مادی چیزوں پر صرف کرتا ہے" آلات اور اوزار کے لیئے "راس المال" اور "سرمایہ" کی ضرورت ہے۔ اسلیئے صنعت و دستکاری کی اصلی آمدنی کا منبع "مزدوروں کی محنت اور کارخانہ دار کا سرمایہ ہے یہی حال زراعت کا ہے۔ زمین کی درستگی کیلیئے مزدور کی اور آلات زراعت کیلیئے سرمایہ کی ضرورت ہے۔

خلاصہ تفصیل ماسبق یہ ہے کہ دنیا کی ہر نوع اور قسم کی آمدنی کی اصل مزدور اور اہل سرمایہ ہیں۔ دونوں آمدنی کے پیدا کرنے میں برابر کے شریک

ہیں اسلیئے تقاضائے انصاف یہ ہے کہ زراعت اور صنعت کی تمام آمدنی دو مساوی حصوں میں تقسیم ہونی چاہیئے۔ ایک حصہ مزدوروں کو دیا جائے اور دوسرا حصہ اہل سرمایہ لیں۔ لیکن تمام دنیا میں اہل سرمایہ اور کارخانہ دار تمام منافع کے اصلی مالک بن جاتے ہیں اور مزدوروں کو اُنکے حق سے اسقدر کم دیا جاتا ہے کہ وہ مشکل سے اوقات بسری کر سکتے ہیں اسلیئے ضرورت ہے کہ مزدوروں کی اعانت کی جائے۔

ان تمام مقدمات بالا کا نتیجہ یہ ہے کہ فقرا اور مزدوروں کی امداد کی جائے یہی خیال سوشیلزم اور اشتراکیت کا سنگ بنیاد ہے۔ اس خیال کی کامیابی کے لیئے اُن کو بہت سے مراتب طے کرنے پڑتے ہیں جنکا ماحصل یہ ہے کہ موجودہ نظام زندگی بالکل بدل دیا جائے۔ ہر قسم کی جائدادیں اور ملکیتیں اہل سرمایہ اور ارباب ثروت کی شخصی ملکیت و تصرف سے نکال کر وقف عام کر دی جائیں تمام کاشتکاریاں، جائدادیں اور کارخانے جمہور ملک کی ملکیت ہوں۔ گورنمنٹ کو مخصوص افراد کے قبضے سے نکال کر عام پبلک کے زیر انتظام کیا جائے۔ ہر قسم کے آلات و سرمایہ مشترک طور سے تمام اہل ملک یا گورنمنٹ کی ملک ہوں، ملک کے تمام افراد محنت صرف کریں۔ ہر قسم کا منافع ایک جگہ جمع ہو اور وہ تمام اہل ملک پر مساوی طور سے گورنمنٹ کی زیر نگرانی تقسیم ہو۔ ہر شخص کے امتیازات شخصی مٹا دیئے جائیں ذاتی اعزاز و تفوق کی کوئی مثال باقی نہ رہے۔ بادشاہ اور رعایا۔ غلام اور حاکم۔ امیر اور فقیر۔ معزز اور ذلیل غرضکہ ہر قسم کے تفاوت مراتب کو

صفحۂ عالم سے محو کر دیا جائے۔ اور تمام عالم میں ہر چیز کے اندر مساوات عامہ ہو جائے۔ انتہا یہ ہے کہ انکا خیال مساوات خدا کی غیر معمولی عظمت کو بھی تسلیم نہیں کرتا!۔

"اکانمی" جس سے "اشتراکیت" کو تعلق ہے اسکا بانی اول گو ایک فرانسیسی عالم انٹوان ڈی منکرٹیان المتوفی سنہ ۱۶۱۵ھ ہے اور اسکا مدون ڈاکٹر کینسی سنہ ۱۷۵۸ء ہے۔ لیکن اکانمی کو فن کی حیثیت سے جس نے دنیا کے سامنے روشناس کیا وہ ایڈم اسمتھ ہے۔ جسکی اس فن میں پہلی تصنیف سنہ ۱۷۷۶ء میں شایع ہوئی۔ اسمتھ کے بعد دو انگریز عالم اللتھ، ریکارڈو اور فرانسیسی عالم جان بیلپسٹ پیدا ہوئے۔ انھوں نے اس فن کو تکمیل تک پہنچا دیا۔ یہ علمائے فن اقتصاد انیسویں صدی کے ابتدائی حصے میں تھے۔ اس بیان سے ثابت ہوا کہ اشتراکیت انیسویں صدی کی پیداوار ہے۔

جن اکانمسٹ اور علمائے اقتصادیات کا ہم نے تذکرہ کیا وہ نفس فن کے اصول اور ان کو عملی صورت میں لانے کی نسبت کسی قدر مختلف الرائے ہیں اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ اشتراکیین اور سوشیالسٹس کے چند فرقے ہو گئے۔

(۱) فوضوی یا کمونسٹ یا نہلسٹ۔ اس فرقہ کا خیال یہ ہے کہ تمام دنیا سے ہر قسم کی شخصی ملکیتیں اور امتیازات مٹا دیے جائیں۔ دنیا کا ذرہ ذرہ ذاتی ملک سے نکل کر جمہور کی ملک ہو جائے۔ تاکہ تمام انسان مساویانہ حیثیت سے زندگی بسر کریں۔ یہ فرقہ بجبر ملکیت کو مٹانا چاہتا ہے

عہدہ داران و ارباب ثروت کو مار ڈالنا انکے نزدیک ثواب ہے۔

(۲) اجتماعی یا سوشیالسٹ۔ یہ فرقہ یہ چاہتا ہے کہ صرف آلات شخصی تصرف سے نکال کر عام پبلک کی ملک کر دیئے جائیں تاکہ فقرا اور مزدور ارباب ثروت و اہل سرمایہ کی احتیاج کے بغیر کام کر سکیں۔

(۳) قومی یا نیشنلسٹ۔ اس فرقہ کی تھیوری یہ ہے کہ صرف کاشت اور سکونت کی زمینیں شخصی ملکیت سے نکال لی جائیں کیونکہ ثروت کا اصلی منبع زمین ہے اور جب تمام زمین جمہور یا گورنمنٹ کی ملک ہو جائیگی تو اہل حاجت اور مزدوروں کی حالت بہت کچھ سنبھل جائیگی۔

اشتراکیین کے یہ مختلف فرقے تمام ممالک متمدنہ میں روز بروز پھیلتے جاتے ہیں اور ہر جگہ انکی تعداد روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ یورپ کے بعض بعض ملک کے اکثر باشندے سوشیلزم کے معتقد ہوتے جاتے ہیں اس فرقہ کی تمام اطراف عالم میں خفیہ سوسائٹیاں، انجمنیں اور اخبارات ہیں۔ جو انکے خیالات کی اشاعت کرتے ہیں۔ پبلک میں موجودہ نظام سلطنت کے برخلاف جوش پیدا کرتے ہیں۔ سلاطین، حکام ملک اور ارباب ثروت کے قتل کی تدبیریں کرتے ہیں۔ ناچار گورنمنٹوں کو انکی مزاحمت پر آمادہ ہونا پڑتا ہے۔ اور بہ زور قوت انکی بیخ کنی کی کوششیں کرنی پڑتی ہیں۔ لیکن یہ تمام کوششیں بے سود ہوتی ہیں اور سوشیلزم کا سیلاب نہیں تھمتا۔

سنہ ۱۸۸۶ء سے اس مذہب کے پیرو جرمنی میں بہت بڑھ رہے ہیں۔ سنہ ۱۹۰۸ء میں جرمنی میں اشتراکیین کی تعداد دس لاکھ تھی۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں بیس

لاکھ ہوگئی۔ جرمنی کے علاوہ فرانس، بلجیم، ہولینڈ، پولینڈ، روس، امریکا رومانیہ، اٹلی، پروشیا، سوئٹزرلینڈ، اور انگلینڈ کا بھی یہی حال ہے۔

اشتراکیین کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہونا کوئی تعجب انگیز امر نہیں کیونکہ سوشلزم کا اصلی مقصود فقرائے قوم اور مزدور پیشہ اشخاص کی حمایت ہے۔ اور یہ معلوم ہے کہ ممالک میں مزدوروں اور فقیر و تنگ کی تعداد تمام فرقوں سے زیادہ ہے۔ اس حالت میں فرض کرلینا چاہیئے کہ یورپ کے تمام فقرا اور مزدور پیشہ درحقیقت سوشیالسٹ ہیں لیکن عجیب تر یہ ہے کہ سوشیلزم کی آواز سے تمام یورپ اسقدر گونج اٹھا ہے کہ اسکی تاثیر سے یورپ کا کوئی فرقہ نہیں بچ سکتا۔ کنسرویٹو پارٹی جسکا منتہائے مقصد قدیم آداب و رسوم کی حمایت اور ذاتی اعزاز و مناصب کی محافظت ہے اسکو بھی کسی قدر تغیر کے بعد سوشیلزم کا ہم آہنگ ہونا پڑا۔ انتہا یہ ہے کہ کالج اور اسکول کے پروفیسر اور ٹیچر اور دیر و کنیسہ کے راہب اور پادری بھی اصول اشتراکیت میں کسی قدر ترمیم کے بعد اشتراکیین کے ہم آواز ہوگئے ہیں۔

اس چیخ پکار، شور و فریاد، واویلا و ہنگامہ کا اثر یہ ہے کہ تمام یورپ کے خیالات میں موجودہ نظام تمدن کے انقلاب کے متعلق عجیب قسم کا تلاطم برپا ہوگیا اور ہر شخص جدید تمدن کے مصائب کو محسوس کر رہا ہے۔

اس مقدمہ کے ساتھ چند مقدمات کا اور اضافہ کرو۔

(۱) یورپ میں تمدن کی بنا شخصی فوائد، خود غرضی اور ذاتی منافع پر ہے باپ بیٹے کو نہیں پوچھتا۔ بیٹا باپ کی خبر نہیں لیتا۔ پھر ملک کے عام افراد کے

کے ساتھ اُسکو کیا ہمدردی ہوسکتی ہے؟

(۳) یورپ کی ثروت اور دولت کا اصلی سرچشمہ صنعت اور تجارت ہے۔ ہر شہر میں کمپنیاں اور کارخانے ہیں جن کے مالک اشخاص یا جماعت کے چند افراد ہیں۔ ہر کارخانہ میں ہزاروں مزدور کام کرتے ہیں جنکی روزانہ آمدنی ان کے روزانہ اخراجات کے لیئے مشکل سے کافی ہوسکتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ایک طرف تو کارخانہ دارونکی مختصر جماعت کارخانہ کے منافع کثیرہ سے مالا مال ہوجاتی ہے۔ دوسری طرف ادنی طبقے میں فقرا اور مساکین کی تعداد بھی بڑھ رہی ہے۔ بینکوں کے وجود نے یہ قیامت برپا کر رکھی ہے کہ ایک پیسہ کا قرض بھی بغیر سود کے نہیں مل سکتا۔ جائدادیں عام پبلک کے ہاتھ سے نکل کر مالکان بنک کے تصرف میں آتی جاتی ہیں۔ اِس سے فقرا اور نادارونکی کثرت ہورہی ہے۔

(۴) تمدن جدید نے ضروریات زندگی کی قیمت اسقدر بڑھادی ہے کہ کم ثروت والونکو وہاں زندگی بسر کرنا مشکل ہے۔ کھانے کی چیزیں اسقدر گراں ہیں کہ فقرا انکو خرید نہیں سکتے۔ ملک کی شدت حاجت کی وجہ سے نرخ اشیاء میں گرانی حد سے زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ اور آزادی تجارت کی بنا پر گورنمنٹیں اس میں زیادہ روک ٹوک نہیں کرسکتیں۔

(۵) گورنمنٹوں نے فقیروں اور بے ساز و سامان شخصوں کے ذاتی مصارف کے لیئے کوئی سامان نہیں کیا۔ یہ تو ہے کہ اندھوں، کوڑھیوں لولوں اور مجبوروں کے لیئے امدادی محکمے قائم ہیں۔ لیکن ایک مجبور قرضدار کے ادائے قرض کی

کوئی صورت نہیں۔ ایک مزدور اگر آج کوئی مزدوری نہ مل سکی تو وہ کل کیا کھائیگا؟ ایک فقیر کے پاس کپڑا نہیں، وہ کپڑا کہاں سے لائیگا؟ یورپ عام مصالح کی نگرانی تو کر رہا ہے لیکن شخصی ضرورتیں اور اتفاقی حاجات کا اسکے یہاں کوئی بندوبست نہیں۔

(۶) اتفاق سے اول تو یورپ مذہب سے آزاد ہے اور اس لیئے وہ شخصی ہمدردی کی قدر نہیں کر سکتا۔ علم و تمدن نے اسکے بجائے ملکی اور جمہوری ہمدردی قائم کر دی ہے۔ جو شخصی ضروریات کیلیئے کافی نہیں۔ دوسرے وہاں جس مذہب کا رواج ہے وہ عیسائیت ہے۔ جس نے مال و دولت کی سخت تحقیر کی ہے۔ عام نصائح کے سوا اس نے ارباب ثروت کو اہل حاجت کی مالی امداد کیلیئے بھی کوئی حکم نہیں دیا۔ اسلیئے عیسائی ممالک میں فقرا کے ساتھ یہ بے اعتنائی کچھ بعید نہیں ہے۔

یورپ کے تمام ممالک میں انگلستان باعتبار ثروت کے سب سے زیادہ ممتاز ہے لیکن یہاں بھی یہ حالت ہے کہ جنگ سے پہلے ۱۷۰۰۰۰۰ تعداد صرف ان فقرا کی تھی جنکی گورنمنٹ امداد کرتی تھی جرمنی کی سنہ ۱۸۷۱ء میں مجموعی آبادی ۴۰۰۰۰۰۰۰ کروڑ تھی۔ آج کل ۶۰۴۰۰۰۰۰ کروڑ ہے سالانہ اموات کی تعداد سے پیدائش کی تعداد ۹ لاکھ زیادہ ہو رہی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ فقرا اور مساکین کی تعداد بھی بڑھ رہی ہے۔ جرمنی کے کارخانے، کاشتکاریاں، دستکاریاں اور ہر قسم کے ذرائع صرف چار کروڑ آدمیوں کی کفالت کرتے ہیں۔ اسکا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اشتراکیین کی تعداد نہایت سرعت کے ساتھ بڑھ رہی ہے۔

ان تمام بیانات مذکورۂ بالا سے بالکل واضح ہو گیا کہ یورپ آج کل عجیب قسم کے اقتصادی مصائب میں مبتلا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس نے ان مشکلات کے حل کرنے کیلئے کیا تدابیر اختیار کی ہیں؟

جرمنی نے جنگ سے پہلے یہ طے کیا تھا کہ اشیا کے نرخ میں کمی کی جائے۔ اس نے فقرا اور مساکین کے لیئے الگ بازار قائم کیئے۔ جہاں خوراک کی معمولی چیزیں ارزاں قیمت پر فروخت ہوتی ہیں۔ پولیس کو حکم دیا ہے کہ ان بازاروں میں اہل ثروت نہ جانے پائیں۔ اس قسم کے چار بازار صرف برلن میں قائم کیئے گئے ہیں۔

انگلستان کی گورنمنٹ بھی فقرا کی اعانت کیلئے آمادہ ہوئی ہے۔ سنہ ۱۹۰۶ء میں انگلستان نے فقرا اور اہل حاجت پر ۱۴۷۸۶۰۰ گنی صرف کیا۔ ان اخراجات سے ۱۷۰۰۰۰۰ لاکھ افراد کی اس نے اعانت کی۔ ان میں سے ۵۳۸۰۰۰ کی تا زندگی ۵۳۰۰۰۰ کی ایک مدت دراز تک، ۶۴۰۰۰ کی صرف ایک سال تک۔ انگریز مزدوروں نے باہمی مشورہ و امداد کیلئے ٹراڈیسی نین ایک عام انجمن بھی قائم کی ہے جو بہت کامیاب ہو رہی ہے۔

پروشیا (جرمنی) کی گورنمنٹ نے اصول اشتراکیت کے مطابق حسب ذیل قوانین جاری کیئے جو پروشیا کے شہری قانون کے اونیسویں باب کی مختلف دفعات میں مذکور ہیں:-

دفعہ اول:- گورنمنٹ پر فرض ہے کہ اُن لوگوں کی معاش کی متکفل ہو جو خود اپنی معاش پیدا نہیں کر سکتے۔

دفعہ دوم: بیکاروں کے لیے اُن کی حالت کے مناسب کوئی خدمت یا کام مقرر کیا جائیگا۔

دفعہ سوم: جو لوگ سستی، کاہلی، یا کسی اور عادت مذموم کے سبب سے کام سے متنفر ہوں اُن کو گورنمنٹ کی نگرانی میں مفید اشغال کے اندر مصروف کیا جائے گا۔

دفعہ ششم: گورنمنٹ پر فرض ہے کہ وہ ایسے کارخانے اور ملز قائم کرے جن سے محتاجوں کی زندگی کا سامان ہوسکے اور فضول خرچ لوگوں کی بھی تہذیب اخلاق ہو۔

دفعہ دہم: دیہاتوں میں میونسپلٹی کا فرض ہے کہ دیہات کے مفلسوں اور محتاجوں کی حاجت پوری کیا کرے۔

دفعہ یازدہم: میونسپلٹی پر فرض ہے کہ وہ ناداری اور افلاس اسباب کے تحقیق کرے اور اسکے انسداد کی تدابیر اختیار کرے۔

یہانتک گورنمنٹوں اور حکومتوں کی کوششوں کا بیان تھا۔ مذہب کی حیثیت سے یورپ کے مذہبی علما اور پادری بھی ان اقتصادی مشکلات اور معاشرتی مصائب کو دور کرنے کے لیے اٹھے ہیں لیکن کیا تم خیال کرتے ہو کہ ان علمائے مسیحیت نے انجیل مقدس یا مسیحی تعلیمات کی ہدایت سے ان عقدوں کے حل کرنے کی کوشش کی ہوگی؟ نہیں، اُنکو اُن کے مذہب میں اسکی کوئی ہدایت نہیں ملتی جس نے اہل دولت کو سخت تحقیر کے ساتھ اپنی آسمانی بادشاہت سے نکال دیا ہے۔ اسلیے ان کو چارہ کار اسکے سوا

اور کچھ نظر نہ آیا کہ وہ بھی تھوڑی ترمیم کے ساتھ اشتراکیین کی صف میں کھڑے ہو جائیں۔ ان مذہبی علما کے اشتراکی اصول کے لحاظ سے دو فرقے ہیں۔ "فرقہ انجیلی اشتراکی" اور "کیتھولک اشتراکی" ان مذہبی فرقوں کو اشتراکی یا سوشیالسٹ کہنا صرف اسلیئے جائز ہے کہ سوشیالسٹ کا لقب خود انھوں نے اپنے لئے خوشی سے اختیار کیا ہے۔ ورنہ درحقیقت وہ سوشیالسٹ نہیں ہیں انھوں نے فقرا، اہل حاجت و افلاس اور غریب مزدوروں کی حمایت صرف اسلیئے جائز رکھی ہے کہ مذہبی وقار آزاد خیال یورپ کے ادنی طبقہ میں قائم ہو جائے۔ بہرحال انجیلی اشتراکیین نے (جسکے ممبر زیادہ تر گرجوں کے پادری ہیں) حسب ذیل تجویزیں اختیار کی ہیں:۔

"مسیحی اشتراکی مزدوروں کی انجمن مذہبی عقاید کے احترام اور ملک و حکومت کے محبت پر مبنی ہے۔ وہ گورنمنٹ سے درخواست کرتی ہے کہ اہل پیشہ اور مزدوروں کے لیئے خاص مفید قوانین وضع کیئے جائیں یتیم بچوں، بیوہ عورتوں اور مجبور لوگوں کے لیئے امدادی فنڈ قائم کیئے جائیں کام کی مناسبت سے مزدوروں کے لیئے کام کرنے کے گھنٹے محدود کر دیئے جائیں۔ سرکاری املاک اور دیہاتی جائدادیں مزدوروں کو معمولی نرخ سے زیادہ ارزاں نرخ پر دیں۔ اعانت فقرا کے لیئے آمدنی پر ٹیکس اور وراثت کے قرب و بعد اور کمی و بیشی کے لحاظ سے ترکہ پر محصول لگایا جائے۔

کیتھولک اشتراکیین کی حسب ذیل تجاویز ہیں:۔

باہمی امداد کے لیئے انجمنیں قائم کی جائیں۔ سرمایہ مزدوروں کے سپرد

کیا جائے۔ گورنمنٹ اجرت کار اور اوقات کار کی تعیین کرے مستورات اور بچوں کا اور اہل سرمایہ اور مزدوروں کا باہمی تعلق صاف کرے۔ قرضہ دہی کی انجمنیں قائم ہوں جو اہل حاجت کو بغیر سود کے قرض دیں۔

اس تفصیل سے ہم اس نتیجہ پر پہنچ گئے ہیں کہ یورپ میں جنگ نہ ہوتی تب بھی وہ سخت مصیبت میں مبتلا تھا۔ اقتصادی مشکلات روز بروز بڑھتے جاتے ہیں۔ اہل افلاس اور ارباب احتیاج کی امداد و اعانت کی کوئی صحیح راہ اب تک نہ نکل سکی۔ مختلف ممالک اور انجمنیں مختلف تدابیر سے ان مشکلات کی عقدہ کشائی کر رہی ہیں لیکن اب تک کوئی باقاعدہ اصول اسکے لئے مدون نہیں ہوا۔

اب ہم کو یہ ثابت کرنا ہے کہ گذشتہ اقوام کے تمدن میں بھی اس قسم کی مشکلات پیدا ہوئیں اور وہ بھی انکو حل نہ کر سکیں۔ گذشتہ زمانے میں یہود اور سلانی اقوام میں دستور تھا کہ تمام زمین ایک وقت پر تمام افراد میں تقسیم کر دی جاتی تھی۔ بعض قوموں میں زمین کا تمام اختیار ایک شخص کو دے دیا جاتا تھا۔ وہ زمین اور اسکے منافع کو تمام قوم میں تقسیم کر دیتا تھا۔ فراعنہ مصر کے زمانے میں بھی اسی اصول اشتراکیت پر عمل ہوتا تھا۔

گذشتہ اقوام میں یونان بھی ایک خاص پایہ رکھتا ہے لیکن اپنے زمانہ تمدن میں وہ بھی اشتراکیت اور سوشلزم سے نہ بچ سکا۔ مشہور مقنن سولن کے عہد میں ایتھنز کے اندر ارباب ثروت اور نادار فرقہ میں ایک عجیب فتنہ برپا ہوا۔

نادار اور مفلس فرقہ کو ضد تھی کہ شہر کی تمام دولت ایک جگہ اکٹھی کر کے تمام افراد پر مساوی طور سے تقسیم کر دی جائے۔ اہل ثروت کی جماعت کو اصرار تھا کہ دولت و ثروت کی مقدار حسب مدارج اعزاز ہونی چاہیئے۔ سولن نے اس فتنہ پر کوئی توجہ نہ کی لیکن اسپارٹا میں لیکارگا نے اصولِ اشتراکیت تسلیم کر لیا۔ اور اسپارٹا کی تمام دولت اس نے افراد پر برابر برابر تقسیم کر دی۔ ایران میں مزدکی فرقہ کا وجود بھی انہی بواعث کا نتیجہ تھا۔ مزدک کی رائے تھی کہ تمام فتنوں کا سبب واحد دولت اور عورتیں ہیں اسلیئے دولت کو بندشِ ملکیت سے اور عورتوں کو قیود زوجیت سے آزاد کر کے تمام ملک کے استعمال کے لیئے عام کر دینا چاہیئے۔ ایران کے طبقۂ زیریں نے حصول دولت کے لیئے اور طبقۂ اعلیٰ نے حصول سامان عیش و مسرت کیلیئے ان خیالات کو قبول کر لیا لیکن اسکا جو نتیجہ ہوا وہ مدائن کے کھنڈروں سے پوچھو۔

ان واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ ان اقتصادی اور اشتراکی مصائب کا کامل اندفاع نہ گذشتہ اقوام سے ہو سکا اور نہ موجودہ زمانہ میں یورپ ان عقدوں کو حل کر سکا۔ نیز ان سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اشتراکیت ہر اُس تمدن کیلیئے لازمی ہے جسکی بنیاد روحانیت اور مذہب پر نہ ہو۔ بہر حال موجودہ یورپ اور اقوام گذشتہ کے عقلا اور اشتراکیین نے ایک مدت کے تجربوں کے بعد ان دقتوں کو ہموار کرنے کے لیئے جو تجویزیں پیش کی ہیں گو انکا مفصل ذکر پہلے گذر چکا ہے لیکن یہاں بطور نتیجہ بہ اختصار پھر اعادہ

کرتے ہیں:-

(۱) ذاتی اعزاز و امتیاز مٹا دیا جائے اور تمام افراد مساوی الرتبہ ہو جائیں

(۲) حکومت جمہور ملک کی مجموعی طاقت کا نام ہو۔

(۳) اہل حاجت کی امداد کیلئے لوگوں کی آمدنی پر ٹیکس لگایا جائے۔ اور اسکے لئے فنڈ مقرر کیا جائے۔ سود سے بچنے کے لئے قرض دینے والی انجمنیں قائم کی جائیں۔ گورنمنٹ کا فرض ہے کہ وہ فقرا اور محتاجوں کی خبر لے۔ اور وہ بازار کا نرخ مقرر کرے۔

یہ وہ اصول ہیں جن کی بنا پر اقوام عالم نے کشاکش و مشکلات مذکورہ سے رہائی حاصل کرنی چاہی ہے۔ ان اصول کی یہ تین دفعات بالا درحقیقت تین قسم کی اصلاحات سے مرکب ہیں:-

(۱) اصلاح معاشرت (۲) اصلاح حکومت (۳) اصلاح اقتصاد۔

لیکن اب تک یہ اصول خیالی ہیں۔ عالم وجود میں کوئی منتظم سلسلہ انکا اب تک قائم نہ ہوا۔ اب آؤ ہم تحقیق بتلائیں کہ اسلام نے ان اصولوں کو کہاں تک ملحوظ رکھا۔ جسکی وجہ سے اسکا تمدن اشتراکیت کے جراثیم سے ہمیشہ محفوظ رہا ہے۔

(۳)

اب ہم دکھلانا چاہتے ہیں کہ اس بارے میں اسلام کی تعلیمات کیا ہیں؟ سوشیلزم کے اعتبار سے سب سے پہلے اصلاح معاشرت کا مسئلہ سامنے آتا ہے یعنی ذاتی اعزاز و امتیاز مٹا دیا جائے۔ اور تمام افراد باعتبار معاش و مال کے مساوی الرتبہ

ہو جائیں۔

مساوات کی چار صورتیں ہیں۔ مساوات نسبی و قومی۔ مساوات حقوق و قانون۔ مساوات رتبہ۔ مساوات مالی۔

مساواتِ نسبی و قومی

اسلام نے نسبی و قومی امتیاز بالکل مٹا دیا ہے۔ اور تمام مسلمانوں میں ایک عام اسلامی برادری قائم کر دی ہے۔ ایک مسلمان کو کسی دوسرے مسلمان پر کوئی قومی یا نسبی امتیاز نہیں ہے۔ قرآن مجید میں ہے:-

یا ایھا الناس انا خلقناکم من ذکر و انثی وجعلناکم شعوبا وقبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقٰکم (حجرات)	لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا۔ اور تم کو مختلف قوم اور قبائل بنایا۔ تاکہ آپس میں ایک دوسرے کو پہچانو۔ خدا کے نزدیک تم میں سے بزرگ اور مکرم وہی ہے جو زیادہ پرہیزگار ہو۔

دوسری آیت یہ ہے:-

انما المؤمنون اخوۃ (حجرات)	مسلمان سب آپس میں بھائی ہیں۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:-

ن اللہ قد اذھب عنکم بیۃ الجاھلیۃ وفخرھا بالآباء	خدا نے جاہلیت کی نخوت اور باپ دادوں پر فخر کرنا تم سے

انما هو مومن تقی او فاجر شقی۔ الناس کلهم بنو آدم وآدم من تراب (ترمذی باب المفاخرة)	دور کر دیا ہے۔ آدمی یا مومن اور پرہیزگار ہے۔ یا بدکردار اور شقی ہے۔ تم سب آدم کے بیٹے ہو۔ اور آدم مٹی سے بنا تھا۔
انسابکم هذه لیست بمسبة علی احد۔ کلکم بنو آدم...... لیس لاحد علی احد فضل الا بالدین وتقوی (مشکوٰة باب المفاخرة)	نسب کسی کا کسی کے لیئے باعث عار نہیں ہے۔ تم سب آدم کے بیٹے ہو...... ایک کو دوسرے پر دین و تقویٰ کے سوا اور کوئی سبب فضیلت نہیں ہے۔
لا فضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی	عرب کو عجم پر اور عجم کو عرب پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔

یہ احکام صرف عام نصائح ہی نہیں ہیں۔ بلکہ عملاً بھی اسلام نے اسکا نمونہ دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ حضرت زینبؓ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی زاد بہن تھیں اُن کو رسول اللہ نے ایک غلام سے بیاہ دیا۔ بلالؓ۔ سلمانؓ۔ حذیفہؓ۔ صہیبؓ۔ جو حبش، ایران اور یمن وغیرہ کے زر خرید غلام تھے اسلام نے معزز ترین عرب کی صف بصف اُن کو کھڑا کر دیا۔

حضرت بلال رضی اللہ عنہ حبش کے ایک ادنیٰ غلام تھے جنکو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے خرید کر آزاد کر دیا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ

اُنکو اپنا آقا کہا کرتے تھے۔ حضرت سلمان جو فارس سے عرب میں غلام بنکر آئے تھے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اُن کو اپنا نقیب فرمایا ہے اور اُنکا نام حضرت ابوبکر (رضی اللہ عنہ) حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) حضرت علی (رضی اللہ عنہ) حضرت ابن مسعود (رضی اللہ عنہ) کے پہلو بہ پہلو لیا ہے۔ حضرت بلال نے مدینہ میں آکر شادی کرنی چاہی تو مدینہ کی گلیوں میں لوگوں سے پکار کر کہا "لوگو! تم جانتے ہو کہ میں ایک معمولی زرخرید غلام ہوں۔ تم میں کوئی شریف ہے جو اپنی بیٹی میری زوجیت میں دے" انصار نے کہا "اے بلال! مدینہ کا ہر شریف اپنی بیٹی تمھاری زوجیت میں دینا اپنی عزت سمجھتا ہے"

مساواتِ حقوق قانونی

مساوات حقوق پر اسلام نے جس شدت سے عمل کیا ہے اُسکی نظیر تمام دنیا میں نہیں مل سکتی۔ اسلام کی نظر میں جس طرح ایک حبشی اور ایک قریشی نسب کی حیثیت سے برابر ہیں اسی طرح حقوق میں بھی بالکل مساوی ہیں اسکا ثبوت گو اوپر کی آیات اور احادیث سے نہایت وضاحت سے ہو رہا ہے تاہم مزید توضیح کے لیئے ہم چند آیات، احادیث اور واقعات پیش کرتے ہیں جن سے ثابت ہوگا کہ اسلام نے کیونکر اعلیٰ و ادنیٰ امیر غریب، قریب بعید، دوست و دشمن سب کے ساتھ عدل و انصاف اور قانون و حقوق میں مساوات کا حکم دیا ہے۔

يا ايها الذين امنوا كونوا قوامين بالقسط شهداء لله ولا يجرمنكم شنان قوم على ان لا تعدلوا اعدلوا هو اقرب للتقوى (ال عمران)	مسلمانو! انصاف پر مضبوطی سے قائم رہو۔ اور خدا ہی کیلئے گواہی دو۔ کسی گروہ کی دشمنی اس بات کا باعث نہ ہو کہ تم انصاف نہ کرو۔ انصاف کرو کہ یہ تقویٰ سے قریب تر ہے۔

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ ہم کو دوست و دشمن سب کے ساتھ عدل و مساوات کا حکم دیا گیا ہے۔

واذا قلتم فاعدلوا ولو كان ذا قربى (انعام)	جب بولو انصاف کی بات بولو اگرچہ کسی تمھارے قرابت داری کے خلاف ہو۔

اس آیت کریمہ نے قریب بعید میں مساوات کا فیصلہ کر دیا۔

كتب عليكم القصاص في القتلى (بقرہ)	تم پر مقتولین کا قصاص فرض کیا گیا۔
النفس بالنفس (مائدہ)	جان کے بدلے جان

ان دونوں آیتوں کا اطلاق تمام افراد انسان میں جان و زندگی کی مساوات ثابت کرتا ہے۔

عن عبادة بن الصامت قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم	عبادہ بن صامت سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

اقیموا حدود اللہ علی القریب والبعید کم ولا تاخذ فی اللہ لومۃ لائم۔

(ابن ماجہ کتاب الحدود)

نے فرمایا کہ خدا کے حدود (یعنی خدا کے مقرر کردہ قواعد وآئین) دور و قریب سب پر یکساں جاری کرو۔ اور خدا کے معاملہ میں تم ملامت کرنے والوں کی ملامت کی پرواہ نہ کرو۔

یہ حدیث تعزیر وسزا میں قانون مساوات کو ثابت کرتی ہے اور یہ اسلام کا صرف قولی حکم نہیں ہے بلکہ اسکا اس پر عمل بھی رہا۔ قبیلہ بنی مخزوم کی ایک عورت چوری میں ماخوذ ہوئی۔ قریش نے رسول اللہ صلعم سے سفارش کرنے کے لیے حضرت اسامہ کو آمادہ کیا جن کو رسول اللہ صلعم بہت عزیز رکھتے تھے لیکن جب اس واقعہ کے متعلق آپ سے سفارش کی گئی تو آپ نے لوگونکو جمع کرکے فرمایا:۔

انما اھلک الذین قبلکم انھم کانوا اذا سرق فیھم الشریف ترکوہ واذا سرق فیھم الوضیع اقاموا علیہ الحد وایم اللہ لو ان فاطمۃ بنت محمد سرقت لقطعت یدھا۔

(بخاری الشفاعۃ فی الحدود)

تم سے پہلی قومیں اسلئے ہلاک کی گئیں کہ جب کبھی ان میں کوئی بڑا آدمی چوری (یا کوئی جرم) کرتا تو اسکو چھوڑ دیتے اور جب کوئی معمولی آدمی چوری کرتا تو اسکو سزا دیتے۔ خدا کی قسم اگر محمد کی بیٹی فاطمہؓ بھی چوری کرتی تو میں اسکا ہاتھ کاٹتا۔

حضرت عمرؓ نے ایک جرم پر اپنے بیٹے عبید اللہ پر خود اپنے

ہاتھ سے حد جاری کی۔ اور گو وہ اسی سزا میں مر گئے لیکن حضرت عمرؓ نے حد سے ہاتھ نہیں روکا۔ ان احکام اور واقعات سے بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام نے مساوات قانونی کا کسقدر لحاظ کیا ہے؟۔

اب آؤ عام مساوات حقوق کی نسبت اسلام کا طرز عمل بتائیں۔

یہ ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلعم تمام مسلمانوں کے آقا اور سردار تھے لیکن کبھی آپ نے اپنے لیئے عام مسلمانوں سے زیادہ امتیاز نہیں چاہا۔ ایک سفر میں کھانا پکانے کے لیئے لوگوں نے کام تقسیم کر لیئے۔ رسول اللہ صلعم نے جنگل سے لکڑیاں لانے کا کام اپنے ذمہ لیا۔ حضرت انس ایک نوجوان صحابی دس برس رسول اللہؐ کی خدمت میں رہے۔ لیکن انکا بیان ہے کہ اس طویل عرصہ میں جتنی خدمت میں نے رسول اللہ کی اس سے زیادہ آپ نے میری خدمت کی۔

خلفائے راشدین جو اسلام کے زندہ نمونے تھے انکا بھی ہمیشہ یہی طرز عمل رہا۔ حضرت عمر جب بیت المقدس جا رہے تھے تو ایک اونٹ تھا۔ جس پر باری باری سے حضرت عمر کا غلام اور خود حضرت عمر سوار ہوتے تھے۔ جب بیت المقدس کے قریب پہونچے تو غلام کی باری تھی۔ غلام نے کہا "امیر المومنین شہر قریب ہے آپ سوار ہوں۔" حضرت عمر نے فرمایا "نہیں حق تمھارا ہے تم سوار ہو" آخر غلام سوار ہوا اور حضرت عمرؓ پیادہ اونٹ کی ڈوری پکڑے ہوئے شہر میں داخل ہوئے۔ حالانکہ یہ وہ وقت تھا کہ تمام مخلوق خلیفۂ اسلام کی شان و عظمت دیکھنے کیلیئے گھروں سے نکل آئی تھی۔

واقعہ اجنادین میں رومی سپہ سالار نے ایک جاسوس مسلمانوں کے

حالات دریافت کرنے کیلئے بھیجا۔ وہ جاسوس اسلام کے سچے نمونوں کو یعنی جب صحابہ کو دیکھکر واپس ہوتا ہے تو رومی سپہ سالار سے ایک تحیر کے عالم میں کہتا ہے:۔

ھم بالليل رھبان وبالنھار فرسان لو سرق ابن ملکھم قطعوہ واذا زنی رجموہ	یہ لوگ رات کو راہب عبادت گذار اور دن کو فوجی سوار ہیں۔ اگر ان کے بادشاہ کا لڑکا بھی چوری کرے تو ہاتھ کاٹیں اور اگر زنا کرے تو پتھراؤ کریں۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے خلافت کی پہلی تقریر جو کی تھی اُسکے حسب ذیل فقرے پڑھو:۔

وان اقواکم عندی الضعیف حتی اخذ له بحقه۔ وان اضعفکم عندی القوی۔ حتی اخذ منه الحق۔ (ابن سعد جزو ۳ ص ۱۲۹)	تم میں جو سب سے قوی ہے وہ میرے نزدیک ضعیف ہے۔ یہانتک کہ میں اس سے حق وصول کرلوں۔ اور تم میں جو سب سے کمزور ہے وہ میرے نزدیک قوی ہے یہانتک کہ اُسکا حق دلواؤں۔

شاہزادہ یمن مسلمان ہوگیا تھا۔ صرف اسلیئے مرتد ہوکر عیسائی ہوگیا کہ ایک عام اور غریب مسلمان کے مقابلہ میں حضرت عمر رضؓ نے اُس کو کوئی ترجیح نہ دی۔ حضرت علی رضؓ جب ایک مقدمہ میں مدعا علیہ بنکر آئے تو اُنکو مدعی کے برابر کھڑا ہونا پڑا۔ فارس کی لڑائی میں جب مغیرہ بن شعبہ

رستم کے پاس سفیر بن کر گئے اور اسلامی مساوات کے جوش میں وہ رستم کے برابر تخت پر بیٹھ گئے تو درباریوں نے یہ گستاخی دیکھکر انکو تخت سے اُتار دیا اُس وقت اُنکے مُنھ سے کس بے ساختگی کے ساتھ یہ الفاظ نکلے ہیں۔

لا یستعبد بعضنا بعضًا	ہمارے یہاں تو ایک دوسرے کو غلام
(طبری جلد۴ ص۱۸ مطبوعہ مصر)	بنانے کا دستور نہیں ہے۔

ایک مرتبہ ایک شخص نے صرف اسلیے حضرت عمر کی اطاعت سے انکار کیا کہ اسکو خیال ہوا کہ حضرت عمر نے تقسیم غنیمت میں اپنا حصہ عام مسلمانوں سے زیادہ لیا ہے۔ منصور عباسی بڑے جاہ وجلال کا خلیفہ تھا۔ ایک شخص نے جب اُس پر قاضی کے یہاں دعویٰ کیا تو معمولی آدمیوں کی طرح اُسکو مدعی کے برابر قاضی کے سامنے کھڑا ہونا پڑا۔ اسلام کے زیر سایہ جو قومیں رہیں اُنکو بھی ہر قسم کے مذہبی اور ملکی حقوق حاصل رہے۔ اس تفصیل کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ اسلام نے مساوات حقوق پہ عمل نہیں کیا۔

مساواتِ مراتب

اسلام باہمی افراد میں ترجیح رتبہ اور فضیلت مدارج کا قائل ہے۔ قرآن مجید میں ہے۔

انظر کیف فضلنا بعضهم	دیکھو! ہم نے کس طرح اُن میں سے
علی بعض	ایک کو دوسرے پر فضیلت دی۔

اور عقل بھی اُسکو تسلیم نہیں کرتی کہ مختلف اعمال۔ اخلاق۔ اطوار۔

اور اوضاع کے آدمی اعزاز و فضیلت میں مساوی الدرجہ ہو جائیں اسلئے اشتراکیت کا یہ اصول کسی قدر ترمیم طلب ہے۔ اسلام نے نہایت نکتہ سنجی کے ساتھ اسکی یوں ترمیم کی ہے کہ اُس نے اعزاز و مرتبت کی دو قسمیں قرار دی ہیں۔ "صحیح اعزاز و منزلت" اور "ناجائز اعزاز و منزلت"۔ ناجائز اعزاز و منزلت وہ ہے جو غرور و نخوت، مناصب دنیوی۔ وجاہت موروثی۔ نسب اور دولت پر مبنی ہو۔ صحیح اعزاز و منزلت وہ ہے جسکی بنا اخلاق، حسن عمل، اور نیک کرداری پر ہو۔ خدا فرماتا ہے۔

ان اکرمکم عند اللہ اتقٰکم (حجرات)	خدا کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ نیک کردار ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں

الکرم التقوٰی (ترمذی باب مفاخرت)	بزرگی نیک کرداری ہے۔

مساوات رتبہ کی واقفیت دریافت کرنے کے لئے حضرت مغیرہ بن شعبہ کا وہ قول پھر پڑھو۔ جو انھوں نے دربار فارس میں فخر و شرف کے لہجے میں کہا تھا۔

انا معشر العرب سواء الا یستعبد بعضنا بعضًا	ہم عرب لوگ آپس میں برابر ہیں ایک دوسرے کو غلام نہیں بناتے۔

مساوات رتبہ کی ایک صورت اور رہ گئی کہ حاکم و محکوم اور آقا و نوکر کا باہمی اختلاف رتبہ بھی اٹھ جائے لیکن اگر اس سے مقصد یہ ہے کہ دنیا میں کوئی حاکم ہو نہ محکوم۔ آقا ہو نہ غلام، تو اس وقت تک یہ ایک ناقابل عمل اصول ہے جب تک دنیا میں مختلف الاستعداد اور مختلف الاخلاق انسان موجود ہیں اور ان میں باہمی امداد کی احتیاج باقی ہے۔ قرآن کہتا ہے۔

ورفعنا بعضهم فوق بعض درجات ليتخذ بعضهم بعضا سخريا۔	ہم نے ایک کو دوسرے پر ترجیح دی تاکہ ایک دوسرے کو اپنے کام میں لے سکیں۔

اور اگر اس سے مقصود یہ ہے کہ باوجود امتیاز مراتب حقوق میں یکسانی ہو تو یہ عین حکم اسلام ہے۔ حقوق کو چھوڑ دو اسلام کی شریعت میں تو رعایا اور غلام کا لفظ بھی بولنا مستحسن نہیں۔ سب انسان عباد اللہ یعنی صرف اللہ کے غلام ہیں۔

مساوات مالی

فقرا اور اہل ثروت کے باہمی تصفیہ کیلئے اشتراکیت نے جو اصول قرار دیئے ہیں ان میں سب سے زیادہ ناقابل عمل اصول یہی ہے۔ تاریخی حیثیت سے اس اصول کی غلطی اسطرح ثابت ہوتی ہے کہ سولن کے عہد سے لیکر جو اس اصول کی تاریخ پیدائش ہے اب تک دنیا اس پر عمل نہ کر سکی۔ سوشیالسٹ کہتے ہیں کہ دولت کی اصل محنت ہے۔ اسلیئے تمام افراد کو محنت کرنی چاہیئے

اور اسکا منافع مساوی طور سے تقسیم کردینا چاہیئے لیکن یہ ایک صریح غلطی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ دولت کا زیادہ تر مدار محنت ہی پر ہے لیکن تمام افراد کی محنت یکساں نہیں ہوتی۔ جب تک تمام افراد محنت، مقدار محنت، مہارات علم، قوت، صحت تدبیر، اور عقل میں مساوی نہ ہوجائیں۔ انکی محنتوں کا معاوضہ بھی مساوی نہیں ہوسکتا۔ ایک شخص اپنی قوت دماغی سے ایک شئے ایجاد کرتا ہے، اسکی درستی اور تکمیل میں سالہاسال کے شدائد برداشت کرتا ہے اور ایک مزدور صرف اسکی نقل اتار سکتا ہے۔ کیا دونونکی محنتوں کا ایک ہی معاوضہ دیا جائے گا؟ ایک شخص ۲۴ گھنٹوں میں ۲۰ گھنٹے محنت کرسکتا ہے، دوسرا صرف ۱۰ گھنٹے، تیسرا ۵ گھنٹے، چوتھا ۲ گھنٹے۔ کیا یہ انصاف ہوگا کہ ان تمام مختلف الدرجات اشخاص کی محنت کی ایک ہی قیمت ہو۔ ایک ماہر فن دستکاری ایک شئے نہایت عمدگی سے تیار کرتا ہے۔ اسکا رفیق وہی چیز نہایت بھدی اور بد وضع بناتا ہے۔ کیا دونونکا ایک نرخ ہوگا؟ ایک ماہر علوم جو کسی کالج کا پروفیسر ہو کیا اسکی تنخواہ ایک نیم عالم کے برابر ہوگی جو کسی معمولی اسکول کا ٹیچر ہو؟ ایک لائق بیرسٹر اور ایک معمولی وکیل کا معاوضہ ایک ہوگا؟ ایک جنرل اور ایک سپاہی کی قیمت ایک ہوگی؟۔ ایک دانشمند وزیر اور ایک محرر کا معاوضہ مساوی ہوگا؟ کون کہہ سکتا ہے کہ ان سب کی محنتوں اور قابلیتونکی ایک قیمت ہوگی۔ اور جب ایک قیمت نہ ہوگی تو دولت اور قیمت محنت کے اختلاف مراتب کا مٹانا فطرت اور قدرت کی مخالفت ہے۔

دوسری بات قابل غور یہ ہے کہ تمدن افراد میں باہمی احتیاج پیدا کرتا ہے اگر دولت و تمول میں لوگ مختلف الدرجہ نہوں تو ایک بیمار کو نوکر، ایک کمزور کو باربردار، ایک تاجر کو محرر، ایک گورنمنٹ کو سپاہی۔ ایک نا واقف فن طعام کو باورچی (وقس علیٰ ذٰلک) کیونکر ہاتھ آسکتا ہے؟ قرآن مجید نے انہی دو اصولوں کو مدنظر رکھ کر اختلاف مدارج مالی کی طرف اشارہ کیا ہے:۔

واللہ فضل بعضکم علی بعض فی الرزق۔ فما الذین فضلوا برادی رزقھم علی ما ملکت ایمانھم فھو فیہ سواء (نحل)	خدا نے رزق میں ایک کو دوسرے پر برتری دی ہے تو جن کو برتری دی گئی ہے وہ اپنا رزق لوٹا کر ان لوگونکو کبھی نہیں دینگے جن کے وہ مالک ہیں تاکہ وہ سب برابر ہوجائیں۔

دوسری آیت میں بھی اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے:۔

نحن قسمنا بینھم معیشتھم فی الحیوٰۃ ورفعنا بعضھم فوق بعض درجات لیتخذ بعضھم بعضا سخریا (زخرف)	ہم نے دنیاوی زندگی میں ان کے درمیان انکی معیشت تقسیم کر دی اور ایک کو کئی درجہ دوسرے پر بلند کیا تاکہ ایک دوسرے کو اپنے کام میں مدد کے لیئے لے سکیں۔

اس بیان سے ظاہر ہے کہ سوشیلزم میں مساوات مالی کا اصول نہایت خطرناک غلطی پر مبنی ہے۔ لیکن جو نتیجہ اس اصول کے ذریعہ سے اشترا کیین

حاصل کرنا چاہتے ہیں، اسلام نے اُن کا دوسرا مفید ذریعہ بتا دیا ہے جسکا بیان آگے آئے گا۔ اس تمام تفصیل کا ماحصل یہ ہے کہ فقرا اور اہل احتیاج کی امداد کے لیے اصلاح معاشرت کی جو مفید و حقیقی تجاویز تھیں اسلام نے اُن سے دریغ نہیں کیا ہے اور جو کچھ افراط و تفریط تھا اُس سے صاف منع کر دیا ہے۔

اصلاحِ اقتصادی یا مالی

اسلام نے اقتصادی امور میں جو اصلاحیں کی ہیں۔ امرا اور اہل ثروت کو جس معتدل حالت پر رکھا ہے فقرا اور اہل افلاس کی امداد و اعانت کی جو صورتیں پیدا کی ہیں اُن کو پڑھ کر یہ فیصلہ کرنا نہایت آسان ہو گا کہ دنیا میں اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے تمدن کی تمام مشکلوں کو اس نکتہ سنجی کے ساتھ حل کر دیا ہے کہ جدید تمدن بھی باوجود اپنی انتہائی وسعت کے نوع انسان کے لیے کوئی جدید اور مفید تجویز پیش نہ کر سکا۔

مضمون کے گذشتہ نمبر میں ہم اُن اقتصادی مشکلات کا بیان کر چکے ہیں جن میں آج کل یورپ مبتلا ہے۔ اور جن سے مسیحی مذہب انکو نجات دلانے سے بالکل عاجز ہے۔ لیکن مسلمانوں کے ہزار سالہ تمدن میں صرف اُن کا ایک مذہب تھا جو ہر راہ میں اُنکے لیے مشعل ہدایت تھا۔

عقلائے یورپ نے مصائب اقتصادی سے رہائی پانے کیلئے سب سے ضروری تجویزیں یہ پیش کی ہیں۔

(۱) اہل حاجت کی امداد کے لیئے لوگوں کی آمدنی پر ٹیکس لگایا جائے اور اُن کے لیئے فنڈ مقرر کیا جائے۔

(۲) سود سے بچنے کے لیئے قرض دینے والی انجمنیں قائم کی جائیں۔

(۳) گورنمنٹ کا فرض ہے کہ فقرا اور اہل حاجت کی خبرگیری کرے بازار کا نرخ مقرر کرے۔

یہ تمام تجویزیں جن کو یورپ ایک مدت کے تجربہ کے بعد سمجھا ہے لیکن جن پر اب تک عمل نہ کر سکا۔ اسلام انکو اپنے ابتدائے پیدائش ہی میں سمجھ چکا تھا اور ایک مدت دراز سے وہ ان پر عامل ہے۔

اسلام میں مال کا رُتبہ

سب سے پہلا مرحلہ یہ ہے کہ دولت و مال کا کیا رتبہ ہے؟ اسلام کے سوا اکثر مذاہب نے اس نکتہ کے سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ عیسائیت کا حکم ہے کہ اہل دولت آسمان کی بادشاہت میں داخل نہیں ہو سکتے۔ یہودیت نے ایک حد تک دولت کی قدر کی ہے۔ مگر اُن کی دولت کے ثمرات و فوائد صرف فقرائے بنی اسرائیل تک محدود ہیں۔ بودھ مذہب پیشوایان مذہب تک کو گداگر اور سائل بننے کی اجازت دیتا ہے۔ لیکن اسلام نے دولت کو معیشت انسانی کا ستون قرار دیا ہے۔

ولا تؤتوا السفهاء اموالکم التی	تم اپنا وہ مال بے وقوفوں کو نہ دے دو جس کو
جعل اللہ لکم قیاما (نساء)	خدا نے تمہاری معیشت کا قوام بنایا ہے۔

قرآن مجید نے مال کو جو پایہ بخشا ہے اسکا اندازہ اس سے ہوگا کہ اس نے مال کو پچیس جگہ "فضل" کہا ہے۔ ۲۱ مقام پر لفظ "خیر" کے ساتھ تعبیر کیا ہے بارہ مرتبہ "حسنہ" اور "رحمت" کے لفظ سے یاد کیا ہے۔[1] اسلام کے فرائض خمسہ میں سے دو فرض کے ادا کرنے کا شرف اہل ثروت کو عطا ہوا ہے۔

مال عام قوم کا حق ہے

مساوات مالی کی بحث میں ہم یہ ثابت کر چکے ہیں کہ تمام قوم یا تمام ملک میں مال و دولت کی مساوات عقلاً اور عملاً محال ہے۔ لیکن اس سے چارہ نہیں ہو سکتا کہ ملک و قوم کی تمام دولت اگرچہ ملکیت کی حیثیت سے افراد کے تصرف میں ہو۔ لیکن اسکی بقا اور ترقی کے لیئے یہ ضروری ہے کہ وہ تمام دولت قوم اور ملک کی مجموعی دولت قرار دی جائے تاکہ ہر فرد کو لحاظ رہے کہ دوسرے فرد کی دولت برباد و تلف نہ ہو جائے۔ اور قوم و ملک کی مجموعی دولت رو بہ زوال نہ ہو۔ اگر کوئی شخص خود اپنی دولت آپ ہی ضائع کر رہا ہو تو بھی قوم و ملک کو اسکی اصلاح و بقا کے لیئے دخل دینا جائز ہو۔ قرآن مجید نے اس نکتہ کو ملحوظ رکھا ہے۔

ولا تؤتوا السفهاء اموالکم	بیوقوفوں کو اپنا مال نہ دے دو۔ (نساء)

اس آیت میں بیوقوف سے مراد نابالغ یا ناسمجھ یتیم لڑکے ہیں اور ان کے سرپرستوں کی طرف خطاب کیا گیا ہے۔ یہ مال خود یتیموں کا ہے جو امانۃً

---

[1] حجج القرآن امام ابوالفضائل رازی ص ۸۸

اُن کے سرپرستوں کے پاس جمع ہے۔ خود سرپرستوں کا نہیں ہے۔ اس بنا پر چاہیے تھا کہ آیت یوں ہوتی "بیوقوفوں کو اُن کی [illegible] نہ دیدو" لیکن یتیموں کی شخصی دولت عام سرپرستوں کی دولت اسلئے قرار دی گئی تاکہ شخصی دولت کو قوم و ملک کا حق قرار دیا جائے۔ اس سے زیادہ صاف یہ آیت ہے:۔

یا ایہا الذین اٰمنوا لا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل۔ (نساء)	ایمان والو! تم لوگ اپنی دولت آپس میں ناجائز طریقہ سے نہ حاصل کرو۔

یہ ظاہر ہے کہ لوگ ناجائز طریقہ سے دوسرے ہی کی دولت حاصل کرتے ہیں خود اپنی دولت کیسے حاصل کرینگے پس اس سے اشارہ اسی بات کی طرف ہے کہ گو وہ مال شخص غیر کے تصرف میں ہے لیکن درحقیقت وہ کل قوم کا حق ہے اسلیے اُسکی حفاظت و بقا کی کوشش عام قوم و ملک کا فرض ہے۔

ذرائع معاش

مذہب اسلام نے اپنے تمام پیروؤں کو کسب معاش کی تعلیم دی ہے۔ اُسکا عام حکم ہے۔

لیس للانسان الا ما سعیٰ	انسان جو کچھ کوشش کرتا ہے وہی اُس کے لیے ہے۔

بیہقی کی روایت ہے:۔

طلب کسب الحلال فریضۃ	پاک کمائی کا حاصل کرنا فرض

بعد الفریضۃ	ہے بعد فرائض دینی کے۔

تمام ذرائع معاش میں سے اسلام نے زراعت حرفت۔ اور تجارت کو پسند کیا ہے لیکن تجارت کو سب سے زیادہ رتبہ دیا ہے۔ مفسرین کی رائے ہے کہ قرآن مجید میں جہاں جہاں ابتغائے فضل (یعنی خدا کے فضل کی تلاش) کا لفظ آیا ہے وہاں تجارت ہی مقصود ہے۔ نماز جمعہ کے بعد حکم ہے۔

فاذا قضیت الصلوۃ فانتشروا فی الارض وابتغوا من فضل اللہ (جمعہ)	جب نماز ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ۔ اور خدا کا فضل ڈھونڈو۔ (یعنی تجارت میں مشغول ہو)

صحابہ رضؓ کی تعریف میں ہے:۔

تراھم رکعا سجدا یبتغون فضلا من اللہ ورضوانا (محمد)	تم ان کو رکوع اور سجدہ کرتے ہوئے خدا کا فضل اور رضا ڈھونڈتے ہوئے دیکھو گے (یعنی تجارت)

دوسری جگہ صحابہ کے تجارتی سفر کی مدح میں کہا گیا ہے:۔

وآخرون یضربون فی الارض یبتغون من فضل اللہ	اور دوسرے لوگ ہیں جو خدا کا فضل ڈھونڈتے ہوئے (تجارت کرتے ہوئے) ملک میں سفر کرتے ہیں۔

حج میں تجارت کرنا اسلام سے پہلے لوگ برا سمجھتے تھے اسلام نے ان الفاظ میں اسکی اجازت دی۔

لیشھدوا منافع لھم (حج)	(حج کو آئیں) تاکہ وہ اپنے منافع وفوائد

تجارت کو دیکھیں۔

تحصیل معاش کے لیئے تجارت کرنے کا اس آیت میں حکم دیا گیا۔

يا ايها الذين امنوا لا تاكلوا اموالكم بينكم بالباطل الا ان تكون تجارة عن تراض منكم رضاء	ایمان والو! تم لوگ اپنا مال آپس میں ناجائز طریقہ سے نہ کھاؤ لیکن یہ کہ تجارت ہو۔ آپس کی رضامندی سے۔

حاکم نے کنی میں روایت کی ہے کہ حضرت عمر نے فرمایا۔

يا معشر قريش لا يغلبنكم هذا واصحابه على التجارة فانها نصف المال	اے قریش! تجارت میں یہ لوگ تم پر بڑھ نہ جائیں۔ کیونکہ تجارت نصف دولت ہے۔

(کنز العمال ج ٢ ص ٢١٥)

احادیث میں صنعت اور دستکاری کے بھی فضائل آئے ہیں۔

عن المقدام بن معدیکرب عن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال ما كسب الرجل كسبا اطيب من يده (ابن ماجہ ابواب التجارۃ)	مقدام بن معدیکرب نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ انسان کوئی کمائی اپنے ہاتھ کی کمائی سے بہتر نہیں پیدا کرسکتا ہے۔

ایک شخص نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ! (صلے اللہ علیہ وسلم) بہتر کمائی کیا ہے؟ آپ نے فرمایا۔

عمل الرجل بیدہ وکل بیع مبرور (طبرانی)	انسان کے ہاتھ کا کام اور ہر ایماندارانہ تجارت۔

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بکری چراتے تھے۔ حضرت زکریا نجار تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق بزاز تھے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لائے تو آپ نے زراعت کے متعلق قریش کو خطاب کرکے فرمایا:۔

یا معشر قریش انکم باقل الارض مطرا فاحرثوا فان الحرث مبارک۔	اے گروہ قریش! تم ایسی زمین پر ہو جہاں بارش کم ہوتی ہے۔ تو زراعت کرو۔ زراعت میں برکت دی گئی ہے

(کنز العمال بحوالہ ابن جریر ج ۲ ص ۲۱۹)

رومن کیتھولک تاریخ کی چند من گھڑت کہانیاں

بنگال سنتے ہیں کہ مسلمانونکا صوبہ ہے مگر وہانکی تعلیم گاہوں سے وقتاً فوقتاً مسلمان اور اسلام اور تاریخ اسلام کے متعلق ایسی ہنگامہ خیز اطلاعیں آتی ہیں کہ ہم کو یہ سوچنا پڑتا ہے کہ کیا واقعی بنگال میں مسلمانونکی کوئی قوت ہے بھی یا نہیں!

ابھی اکبر کی دین الٰہی والی کتاب کا ہنگامہ فرو نہیں ہوا تھا کہ معلوم ہوا کہ کلکتہ کے ایک مشنری کالج (سینٹ زویر کالج) کے ہائی اسکول سیکشن میں ایک کتاب "کیتھولک چرچ ہسٹری" طالب علموں کو پڑھائی جاتی ہے۔ جس میں ایک باب اسلام کے سخت خلاف ہے۔ کتاب مذکور کے اس باب کا خلاصہ میں نے پڑھا۔ تعجب ہوا کہ یہ ایک ایسی کتاب ہے جو مذہبی رواداری ہی کے خلاف نہیں بلکہ علم اور واقفیت کے بھی خلاف ہے۔ عیسائیوں نے ہمیشہ مسلمانونکو یہ طعن دیا ہے کہ انھوں نے تلوار کے زور سے اپنے مذہب کو پھیلایا ہے۔ یہ واقعہ صحیح ہو یا غلط، مگر بہرحال انھوں نے جھوٹ اور فریب سے اپنے مذہب کو کبھی نہ پھیلایا جیسا کہ اس زمانہ کی مشنری کی تبلیغی کوششوں میں نظر آتا ہے اس کتاب کے اس باب کا ماحصل بھی یہی ہے کہ مسلمانوں نے اسلام کو

بزورِ شمشیر پھیلایا ہے۔ ممکن ہے بعض صورتوں میں یہ واقعہ صحیح ہو۔ جس طرح جرمنی کے باب میں یہ واقعہ صحیح ہے کہ وہاں عیسائیت تلوار کی نوک سے پھیلائی گئی ہے۔

اس باب میں پیغمبر اسلام علیہ السلام اور خلفاؑ کے بھی مختصر واقعات ہیں۔ دنیا اس تحقیق کو سن کر حیران رہ جائے گی کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ ماجدہ یہودیہ تھیں۔ حضرت آمنہ بنت وہب جو قریش کی سیدہ تھیں انکو یہودی نسل یا مذہب سے بتانا ایک ایسا جھوٹ ہے جسکی مثال مشکل سے مل سکے گی۔

اس کتاب کا یہ بیان کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عمر کے تیسویں سال میں نبوت کا دعویٰ کیا مشنری جہالت کا آئینہ ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ حضور کی نبوت اسکے دس برس بعد کا واقعہ ہے۔ جب عمر شریف چالیس سال کی تھی اور شباب کا عہد اپنے اختتام کو پہنچ چکا تھا۔

ولادت کا سال سنہ ۵۸۰ء[۱] بتا کر ہجرت کا سال سنہ ۶۲۲ء بتانا بھی تاریخ کا خون کرنا ہے۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ ہجرت کا واقعہ آپ کی عمر کے بیالیسویں برس پیش آیا حالانکہ آپ کی عمر اس واقعہ کے وقت باتفاق عام ترپن سال کی تھی کیونکہ چالیسویں سال آپ کو نبوت ملی اور اسکے بعد تیرہ سال مکہ میں رہ کر قریش کے ہر قسم کے ظلم وستم سہہ کر مدینہ کو ہجرت فرمائی۔ اور اس کتاب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ

---

[۱] ولادت کی صحیح تاریخ اپریل سنہ ۵۷۱ء اور ہجرت کی ستمبر سنہ ۶۲۲ء ہے۔ ۱۲

نبوت ملنے کے بعد جب بت پرستی کے خلاف آپ نے وعظ شروع کیا تو بت پرست قریشیوں کے غیظ و غضب کو دیکھ کر آپ فوراً اپنے ساتھیوں کے ساتھ مدینہ چل دیئے حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔

یہ بیان بھی تحقیق سے خالی ہے کہ قرآن پاک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جمع کیا گیا۔ کوئی کتاب جس کی سطریں یکجا اور آیات مرتب نہ ہوں نہ پڑھنے میں آسکتی ہے اور نہ اسکی تلاوت کی جاسکتی ہے حالانکہ ہر ایک کو معلوم ہے کہ قرآن پاک کا ہر حصہ اس وقت بھی ہر مسلمان نماز میں پڑھتا تھا اور ہر روز اسکی تلاوت کرتا تھا۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ کاغذ پر اسکی تمام آیتیں اور سورتیں یکجا ترتیب کے ساتھ بشکل کتاب حضرت ابوبکر رض کے عہد میں لکھی گئیں۔

اس کتاب کا بیان ہے کہ جب آپ سے درخواست کی جاتی تھی کہ آپ کوئی مافوق الفطرۃ نشانات اپنے دعویٰ کی تائید میں پیش کریں تو آپ جواب دیتے کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے معجزات دکھلانے کے لیئے نہیں بھیجا ہے بلکہ دعوت دینے اور لڑنے کے لیئے بھیجا ہے۔ اس بیان کی صداقت کے لیئے مصنف نے قرآن کی سورہ ۱۳۔ آیت ۱۷ کا حوالہ دیا ہے۔ میرا چیلنج ہے کہ اس معنی کی کوئی آیت قرآن پاک میں نہیں ہے۔ تیرہویں سورہ رعد ہے اور اسکی جس سترہویں آیۃ کا حوالہ دیا گیا ہے وہ شاید حسب ذیل ہے:-

ویقول الذین کفروا لولا انزل	اور کافر کہتے ہیں کہ اس پر اس کے
علیہ ایۃ من ربہ ط انما	پروردگار کی طرف سے کوئی نشانی

انت منذر ولکل قوم ھاد ہ (رعد-۱)	کیوں نہیں اتری۔ (اے محمد) آپ تو خبردار کرنے والے ہیں اور ہر قوم کے لیئے ایک رہنما ہے۔

اس آیت میں کوئی لفظ ایسا نہیں جو معجزہ نہ دکھانے کے واقعہ کو ظاہر کرے اور یہ کہے کہ آپ "لڑنے" کو بھیجے گئے ہیں۔ خیال ہوتا ہے کہ شاید قرآن پاک کے کسی ترجمہ میں منذر کا ترجمہ خبردار اور ہشیار کرنے والے کے بجائے ڈرانے والا یا ڈر سنانے والا کیا گیا ہے اور اس سے لڑنے کا مفہوم حاصل کیا گیا ہے ایسے لوگونکی اطلاع کے لیئے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ منذر عربی زبان میں وقت سے پہلے آنے والی مصیبت کو بیان کر کے اس سے بچنے کی تدبیر کے لیئے تیار کرنے والے کو کہتے ہیں جیسے ڈاکٹر کبھی مریض کو دیکھکر آئندہ خطرات سے اسکو ہشیار اور متنبہ کرے کہ اگر اپنی حالت کی درستی کے لیئے کوشش نہ کروگے تو تم کو فلاں فلاں بیماریاں لاحق ہوجائینگی۔ اس "انذار" کو جنگ اور لڑائی سے کوئی تعلق نہیں یہ تنبیہ اُس عذاب الٰہی کے مقابلہ میں ہی جو دوسری دنیا میں اسلام کے پیغام کے نہ ماننے اور اُس پر عمل نہ کرنے سے پیش آنے والا ہی۔ قرآن کی بہت سی آیتوں میں یہ لفظ آیا ہے۔ اور انہی معنوں میں آیا ہے جیسے سورۂ زمر میں ہی۔ فرشتے قیامت میں کہینگے:-

الم یاتکم رسل منکم یتلون علیکم ایٰت ربکم وینذرونکم لقاء یومکم ھذا۔ (زمرع)	کیا تمھارے پاس تمھارے میں سے رسول تم کو تمھارے پروردگار کے حکم کو پڑھکر سنانے اور اس تمھارے

	دن کی ملاقات سے ڈرانے اور ہشیار کرنے نہیں آئے۔

کیا قیامت کا میدان لڑائی کا میدان ہے۔ دوسری جگہ ہے:۔

انما انت منذر من یخشاها (نازعات - ۲)	آپ اسکو ڈر سنانے والے ہیں جو قیامت سے ڈرتا ہے۔

دیکھئے اس میں ٹھیک وہی لفظ "منذر" ہے جو پہلی آیت میں ہے۔

سورۂ یٰسین میں ہے۔

وسواء علیهم ءانذرتهم ام لم تنذرهم لا یؤمنون انما تنذر من اتبع الذکر وخشی الرحمن بالغیب فبشره بمغفرة واجر کریم (یسین - ۱)	اور برابر ہے ان کیلئے ان کو ہشیار کریا نہ کرو وہ ایمان نہیں لائینگے۔ تم اسی کو ہشیار کرسکتے ہو جو نصیحت کی پیروی کرتا اور بن دیکھے رحمت والے خدا سے ڈرتا ہے تو اسکو گناہوں کی معافی اور نیک مزدوری کی خوشخبری سنا دے۔

کیا یہ "انذار" اعلان جنگ ہے اور کیا اسی کو اعلان جنگ ہے جو نصیحت کو مانتا اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے یہ کیسا حماقت کا خیال ہے۔

قرآن کہتا ہے:۔

وان من امة الا خلا فیها نذیر (فاطر - ۳)	اور (دنیا کی) کوئی قوم ایسی نہیں جس میں ایک ڈر سنانے والا نہیں آیا۔

کیا ہر قوم میں آنے والا اور ہشیار کرنے والا پیغمبر ہے۔ جو قوموں کو انکے

اعمال بد کی پاداش سے ہشیار اور باخبر کر کے ان کے دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف پیدا کرتا ہے۔ یا وہ جنگ کا الٹی میٹم دینے والا ہوتا ہے۔ ایک اور آیت ہے:

انما انت منذر من یخشاها (نازعات - ۲)	اے پیغمبر تم تو اسکو جو قیامت سے ڈرتا ہو ہوشیار کرنے والے ہو۔

یہاں صاف تصریح ہے کہ عربی میں لفظ انذار کا مفہوم ہشیار و باخبر کرنا اور عمل بد کی پاداش سے متنبہ کرنا ہے۔ نہ کہ لڑائی اور جنگ جوئی۔

اب یہ کہنا ہے کہ اس آیت میں بے شبہہ عجائب و غرائب اور خوارق عادت کے مانگنے والے کو خوارق اور معجزات کے بجائے اسلام کی تعلیم و ہدایت کی صداقت میں غور و فکر کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ اور عجائب پرستی کے عامیانہ جذبے کے بجائے عقل و خرد کو کام میں لانے کی طرف متوجہ کیا گیا ہے مگر اس سے اسکا انکار نہیں نکلتا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ معجزات دکھانے سے انکار کیا ہے۔ قرآن خود معجزہ ہے۔ اور اس میں متعدد معجزوں کا بیان مذکور ہے جن میں ایک شق القمر کا معجزہ بھی ہے جو سورہ قمر میں ہے۔ اسی طرح بدر اور خندق کے معجزوں اور روم کی فتح کی پیشین گوئی کا ذکر بھی ہے۔

اس آیت میں معجزوں کے دکھانے سے جو پہلو تہی ظاہر کی گئی ہے اسکے وہی معنی ہیں جو حضرت مسیح علیہ السلام کے ان فقروں کے ہیں جن میں معجزوں کے دکھانے سے انھوں نے انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ اس قوم کو یونس کے معجزہ کے سوا اب کوئی اور معجزہ نہیں دکھایا جائے گا (تفصیل منظور ہو تو میری کتاب سیرۃ النبی کی تیسری جلد میں اسکو پڑھیں)

اتفاق[۱] سے انجیل کا ایک نسخہ اس وقت مل گیا ہے اس سے یہ دو درس بالفعل نقل کر دیئے جاتے ہیں:۔

"اے استاد ہم تجھ سے ایک نشان دیکھنا چاہتے ہیں اس نے جواب دیکر ان سے کہا۔ اس زمانہ کے برے اور زناکار لوگ نشان چاہتے ہیں۔ مگر یوناہ نبی کے نشان کے سوا کوئی اور نشان انکو نہ دیا جائے گا"

(متی ۱۲-۳۹)

مرقس میں ہے:۔

"پھر فریسی نکل کر اس سے بحث کرنے لگے۔ اور آزمانے کیلئے اس سے کوئی آسمانی نشان طلب کیا۔ اس نے اپنی روح میں آہ کھینچکر کہا اس زمانہ کے لوگ کیوں نشان طلب کرتے ہیں؟ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ اس زمانہ کے لوگوں کو کوئی نشان دیا نہ جائے گا اور وہ ان کو چھوڑ کر پھر کشتی میں بیٹھ گیا"

(۸-۱۱)

اس انجیل میں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزوں سے بھری ہوئی ہے آزمائشی اور فرمائشی معجزوں کے جواب میں انکار کا ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ انبیا علیہم السلام سے تائیدی معجزے گو بکثرت ہوتے ہیں مگر متحدی بہ معجزہ کے دکھانے سے وہ انکار کرتے ہیں کہ قانون الٰہی کے مطابق ایسے معجزوں کے ظہور کے بعد نافرمان امت کی ہلاکت یقینی ہے۔ اسلئے وقت مقرر سے پہلے یہ فرمائش پوری نہیں کی

---

[۱] یہ مضمون بحالت سفر لکھا گیا ہے۔

جا سکتی۔ ٹال دی جاتی ہے۔ کیا عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس انکار کی توجیہ اس سے بہتر کر سکتے ہیں۔

کہا گیا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مذہب میں آخرت کو صرف مادی شکل میں پیش کیا گیا ہے اور اسکے روحانی تخیل سے خالی ہے۔ یہ بھی معترض کی بے خبری ہے۔ اول تو یہ عرض ہے کہ انجیل میں کیا قیامت کے بعد جنت میں اپنے ساتھیوں کے پہلو میں افشردہ انگور خواہ وہ شربت ہو یا شراب پینے کا ذکر نہیں (متی ۲۶-۲۹) اور کیا "دوزخ کی آگ کا منظر" انجیل میں جابجا نہیں دکھایا گیا ہے (لوقا۔ ۱۲-۵ و ۱۶-۲۳- متی ۲۳-۳۳) تفصیل منظور ہو تو میری کتاب سیرۃ نبوی کی چوتھی جلد میں دوزخ اور جنت کا بیان پڑھیں۔ اس میں بائبل کے اکثر حوالے لکھے ہیں جن کو روشن خیال عیسائی چھپاتے ہیں۔ جہنم کے عذاب کا ذکر (متی ۲۳-۳۳) میں ہے۔

فریسی یہودی جو قیامت کو مانتے تھے وہ جنت و دوزخ کو سراسر مادی، اور عیسائی انکو سراسر روحانی فرشتوں کی سی زندگی بتاتے ہیں۔ اسلام میں جنت و دوزخ کے تصور میں مادی و روحانی دونوں منظروں کی جامعیت ہے۔ بہشت باغ و بہار بھی ہوگی۔ اور اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی۔ اور دیدار کے روح پرور جمال کا نظارہ گاہ بھی جیسا کہ قرآن کہتا ہے۔

ورضوان من اللہ اکبر (توبہ - ۹)	اور اللہ کی خوشنودی آخرت کی سب نعمتوں سے بڑھ کر ہے۔

(تفصیل میری مذکورہ بالا کتاب کی چوتھی جلد میں ہے)

زیر اعتراض باب کا آخری حصہ اس بیان میں ہے کہ اسلام کی اشاعت صرف تلوار کے زور سے ہوئی ہے یہ بالکل ٹھیک ہے۔ انہی معنوں میں جن معنوں میں آج بھی عیسائی یورپ اپنی عیسائی تہذیب کی اشاعت، توپ و تفنگ اور ہوائی جہازوں اور ٹینکوں کے ذریعہ سے کر رہا ہے جس کے زیر سایہ عیسائی سامان عیش و مسرت اور مشنری صلح پسندونکا غول ملکوں میں داخل ہوتا ہے اور ان پڑھے جنگلیوں کو بے خبری کی حالت میں عیسائی بناتا ہے۔ افریقہ کے نگرو اگر عیسائیت کے بجائے اسلام کو قبول کرتے ہیں تو اس سے ہمارے عیسائی دوستوں کو فکر مند ہونے کی کیا بات ہے۔

اسلام کی تلوار ایبی سینیا میں کبھی نہیں چلی۔ پھر وہاں مسلمانونکی تعداد کہاں سے آئی۔ جزائر ملایا و سیام میں کبھی اسلام نے کوئی لشکر نہیں بھیجا پھر یہ کروڑوں مسلمان ان جزیروں میں کہاں سے آباد ہو گئے۔ فلپائن اور مڈگاسکر وغیرہ جزیروں میں اسلام کس کشور کشا جلاد کے خوف کا نتیجہ ہے۔ چین میں مسلمانوں کی حکومت کبھی نہیں ہوئی۔ پھر وہاں کے کروڑوں مسلمان کس تلوار کے زور سے مسلمان بنائے گئے۔ ہندوستان میں مسلمانونکی تعداد ان کی حکومت کے ختم ہونے کے بعد بھی تین چار کروڑ سے زیادہ نہ تھی جیسا کہ پہلی انگریزی مردم شماری میں درج ہے مگر سو برس کے عرصہ میں انکا بے تلوار کے دس کروڑ کے قریب ہو جانا کس مادی ہیبت کا نتیجہ ہے۔ پھر آج یورپ کے مختلف ملکوں اور گوشوں میں اسلام کی نموداری جب کہ اسکی ہر تلوار زنگ آلود ہو چکی ہے

کس اعجاز کا کرشمہ ہے۔ افریقہ کے ریگستان کے ہر ٹکڑے میں آج عیسائیت تلوار کے زور سے قائم ہے۔ تاہم روحانی مفتوحوں کی بڑی تعداد عیسائیت کے بجائے اسلام کے آغوش میں آتی ہے کیونکہ اسلام افریقہ کو ایمان کی تازگی کے ساتھ حکومت کی آزادی بھی بخشتا ہے۔ لیکن عیسائیت تثلیث کی بت پرستی کے ساتھ یورپ کا غلام بناتی ہے۔

رومن کیتھولک چرچ کی تاریخ میں یہ بھی لکھنا تھا کہ رومن کیتھولک چرچ انسانوں کو دیویوں کا معتقد بنایا کرتا تھا۔ اسلام نے آکر انسانوں کو صرف ایک خدا کا معتقد بنایا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے یہودیوں نے حضرت مریم صدیقہ پر جو اخلاقی تہمت اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر جو الزامات لگائے تھے اسلام ہی ہے جس نے ان معصوموں کی عصمت کی گواہی دیکر کروڑوں بندگان خدا کے دلوں میں انکی سچائی اور صداقت کا سکہ بٹھایا اور عیسائیوں ان کو انسانوں کے بجائے جو دیوتا کی شکل عطا کی تھی اس کو مٹا کر مقدس انسانوں اور محبوب بندگان الٰہی کی صورت میں جلوہ گر کیا۔

مصنف کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے تیغ زن سپاہیوں سے بڑی شکایت ہے۔ لیکن کیا کارلائل کی زبان میں اس سے پوچھ سکتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تیغ زن سپاہیوں کو تن تنہا کس تلوار کے زور سے مسلمان بنایا۔ ایسے تیغ زن سپاہیوں اور بہادروں کو جن میں سے کسی نے ایران کا تخت الٹ دیا۔ کسی نے قیصر سے مصر و شام اور شمالی افریقہ کا سارا علاقہ چھین لیا۔ اور کسی نے خراسان و ترکستان کی سرزمینوں کو روند ڈالا۔

مشنریوں نے اسلام کے خلاف جو یہ خیال پھیلا رکھا ہے کہ وہ کوئی نیا مذہب نہیں بلکہ وہ صرف عیسوی اور یہودی مذہب کا مجموعہ ہے کوئی نیا اعتراض نہیں یہ تو پیغمبر اسلام علیہ السلام کے عہد میں بھی کفار نے کہا تھا۔

لیکن یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ بجائے خود اسلام کا دعوٰی بھی یہی ہے کہ یہ کوئی نئی چیز نہیں بلکہ آدم علیہ السلام سے لیکر حضرت عیسٰی علیہ السلام تک جو کچھ انبیا علیہم السلام سے کہا گیا تھا اور جس کو انکے پیرووں نے بھلا دیا تھا اسلام کے ذریعہ سے وہی پیغام پھر دنیا میں بھیجا گیا جس طرح حضرت عیسٰی علیہ السلام نے اپنے معترضوں سے یہ کہا تھا کہ میں تورات کے قانون کو مٹانے کے لیئے نہیں بلکہ اسکو پورا کرنے کے لیئے آیا ہوں اور جب تک دنیا قائم ہے تورات کا ایک نقطہ نہیں بدل سکتا۔ اسی طرح قرآن کا دعوٰی ہے کہ وہ تورات اور انجیل کا مصدق ہے۔

مصدقا لما بین یدیہ (بقرہ ۱۲) | اگلی کتابوں کو سچا بتلانے والا۔

اسلام کا عقیدہ یہ ہے کہ دین الٰہی ایک ہی ہے جو آدم علیہ السلام سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک یکساں پیغمبروں کے ذریعہ بھیجا جاتا رہا اور قرآن پاک میں جو کچھ ہے وہی اگلی کتابوں میں بھی تھا چنانچہ وہ اپنی نسبت آپ گواہی دیتا ہے۔ تورات اور انجیل کے ذکر کے بعد ہے۔

وانزلنا الیک الکتاب بالحق مصدقا لما بین یدیہ من الکتاب ومھیمنا علیہ (مائدہ - ۷)	اور ہم نے تیری طرف قرآن اتارا حق کے ساتھ اپنے سے پہلے کی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے اور ان کتابوں پر مہیمن ہے۔

لفظ "مہیمن" کا ترجمہ محافظ، مشتمل اور جامع بھی کیا گیا ہے۔

سورۂ شعراء میں ہے:-

وانہ لفی زبر الاولین (شعراء-۱۱)	اور یہ مضمون (جو قرآن میں ہے) اگلوں کی کتابوں میں (بھی) ہے۔

ایک اور سورہ میں ہے:-

ان ھذا لفی الصحف الاولیٰ صحف ابراھیم و موسیٰ۔ (اعلیٰ-۲)	یہ مضمون اگلے صحیفوں میں ہے۔ اور ابراہیم اور موسیٰ کی کتابوں میں۔

سورۂ شوریٰ میں ہے:-

شرع لکم من الدین ما وصّٰی بہ نوحا والذی اوحینا الیک وما وصّینا بہ ابراھیم وموسیٰ وعیسیٰ (شوریٰ-۲)	اللہ نے تمہارے لیئے وہی دین مقرر کیا جس کا اس نے نوح کو حکم دیا تھا اور جس کو ہم نے تمہارے پاس وحی کیا اور جس کا ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو حکم دیا تھا۔

اب جس بات کا قرآن خود دعویٰ کر رہا ہو اور جو اس کی متفقہ اور متحدہ صداقت کی دلیل ہے اس کو اعتراض کے موقع پر پیش کرنا کہاں تک صحیح ہے۔ اسلام کا عقیدہ یہی ہے کہ تمام انبیا ایک ہی دعوت ایک ہی تعلیم اور ایک ہی شریعت لیکر آئے مگر انکے متبعوں نے اسکو کھو دیا۔ اور بگاڑ دیا۔ اب یہی چیز قرآن کے قالب میں آخری بار آئی ہے اور اب اسکی حفاظت کی ذمہ داری

ذ داللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر لی ہے۔ وانا لہ لحافظون

اب جہاں تک عقائد حقہ، تعلیمات صحیحہ اور انبیا کے صحیح واقعات و قصص کا تعلق ہے، قرآن پاک اور تورات اور انجیل کی یکسانی بالکل کھلی بات ہے، لیکن جہاں ان کتابونکی تحریفات اور انسانی آمیزشوں کا تعلق ہے قرآن ان سب سے الگ اور ان سب سے ممتاز ہے۔ تثلیث کا عقیدہ اور ان عقاید کے ذکر سے جن کو پالوس نے دین عیسوی میں شامل کیا ہے۔ قرآن پاک بری ہے۔ اسی طرح انبیا علیہم السلام کے قصوں کے اُن عناصر کی جو توراۃ میں بری طرح آج مذکور ہیں قرآن نے علانیہ تردید کی ہے اور انبیا علیہم السلام کی عصمت کو دنیا میں دوبارہ ظاہر کیا ہے اگر قرآن پاک موجودہ انجیل اور موجودہ توراۃ کا مجموعہ ہوتا تو یہ امتیاز کیوں نظر آتا۔

مقصود یہ ہے کہ خدا، انبیا، قیامت، جزا و سزا اور قصص انبیا کی حد تک قرآن اور دیگر آسمانی کتابونکا اتحاد قرآن پاک کی صداقت کی دلیل ہے نہ کہ بطلان کی کہ یہ سب چشمے ایک ہی ربانی سرچشمے سے نکلے ہیں۔

اور اگر مقصود یہ ہے کہ اگلی کتابونکی کوئی بات پچھلی کتاب میں دہرائی نہ جانے تو اس نقص سے عیسائیونکی یہ موجودہ انجیل بھی خالی نہیں وہ بھی یہودی کتب و اسفار کے اقوال کی تکرار سے معمور ہے۔ حضرت عیسیٰ کا آخری فقرہ ایلی ایلی لما سبقتنی (مرقس ۱۵-۳۴ متی ۲۷-۴۶) زبور ۲۲-۱ میں مذکور ہے۔ اور حضرت داؤد کی دعا کا ٹکڑا ہے۔ خدا کے باپ اور حضرت عیسیٰ کے بیٹے ہونے کا دعویٰ بھی زبور ۱-۷ کی

نقل ہے جس میں حضرت داؤد نے خدا کو مجازاً باپ اور اپنے کو بیٹا کہا ہے۔ انجیل کی بہت سی خوبصورت تمثیلیں بھی عہد قدیم کے صحیفوں میں ملتی ہیں۔ اور ان کے علاوہ مصری اور یونانی تھیالوجی بلکہ بدھ مت کے فقرے بھی موجودہ انجیل کے نسخوں میں مذکور ہیں۔ مصر کے ایک فاضل نے

التطبیق بین الدیانۃ الوثنیۃ والدیانۃ المسیحیۃ

میں ان سب کو پوری تفصیل سے جمع کر دیا ہے۔

نئی صورت حال کی ایک پرانی دستاویز

”بیس برس کا زمانہ گذر گیا۔ ۱۹۲۷ء میں یوپی کی مجلس قانون ساز میں ڈاکٹر شفاعت احمد خاں کی تحریک سے ایک کمیٹی بنائی گئی تھی جس کا نام ”مسلم میرج سب کمیٹی“ تھا اور جس کا مقصد مسلمانوں کے نکاح وطلاق کے معاملات پر غور اور نکاح وطلاق کو درج رجسٹر کرنے کیلئے ایک قانون کا بنانا تھا۔ اس کمیٹی کے صدر سر شاہ سلیمان مرحوم تھے اور اسکے ممبروں میں ڈاکٹر شفاعت احمد خاں اور مجلس قانون ساز کے چند مسلمان ممبر اور بعض رؤسا تھے۔ مسئلہ چونکہ مذہبی نوعیت کا تھا اسلئے اس میں چند علما ممبر بنائے گئے تھے جن میں مولانا کفایت اللہ صاحب دہلوی اور مولانا نعیم الدین صاحب مرادآبادی اور مولانا قطب الدین صاحب فرنگی محلی وغیرہ اور یہ خاکسار شریک تھا کمیٹی نے لکھنؤ میں اپنے متعدد اجلاس کیئے اور بہت سے علما اور معززین کی شہادتیں لی گئیں اور آخر اسکی رپورٹ تیار کی گئی اور وہ مجلس قانون ساز میں پیش کی گئی۔

اس رپورٹ کا جو حشر ہوا اسکا نتیجہ حافظ شیرازی کی زبان غیب نے ان لفظوں میں سنایا ع ایں دفتر بے پایاں غرق مئے ناب اولیٰ۔

بہرحال کمیٹی کے سارے ممبرونکا اتفاق کسی ایک نقطہ پر نہ ہو سکا اسلئے کمیٹی کے ان ممبروں نے جو اسکی ضرورت کے قائل تھے اپنی الگ رپورٹ تیار کی تھی جسکی تحریر و تیاری کی خدمت خاکسار کے سپرد ہوئی۔ اور اس پر مولانا کفایت اللہ صاحب۔ جناب مولانا قطب الدین صاحب اور خاکسار نے دستخط کیئے۔ اس رپورٹ کی نقل مدت سے میرے پاس پڑی ہوئی تھی، اپیل کے شذرات کو دیکھ کر خیال آیا کہ کیوں نہ اس ساز کو پھر چھیڑا جائے کہ ملک میں اس وقت جس نئے ہندوستان کے خاکہ کی تیاری ہے اس میں مسلمانوں کی اس اہم ضرورت کو پورا کرنے کا مناسب وقت آپہنچا ہے۔ ان اوراق میں جو خیالات ظاہر کیئے گئے ہیں اور مسلمانونکی اس اجتماعی ضرورت کو جس طرح پورا کرنے کا خیال پیش کیا گیا ہے اس پر تخیل و تصور کے لحاظ سے نہیں بلکہ اس لحاظ سے نظر ڈالنا چاہیئے کہ اضطرار و احتیاج کی حالت میں ممکن سے ممکن عملی صورت کیا ہو سکتی ہے۔

یہ نقشہ آج سے بیس سال پہلے کا ہے۔ اس وقت حالات میں بہت کچھ تغیر ہے۔ خیالات میں بھی تبدیلیاں ہو گئی ہیں اور بہت سی ناممکن باتیں ممکن معلوم ہو رہی ہیں۔ اس صورت میں یہ نقشہ بدل کر اور زیادہ مکمل شکل میں سوچا جا سکتا ہے اور اس کے نقائص کو دور کیا جا سکتا ہے۔"

"سید سلیمان ندوی"

اندراج نکاح وطلاق

اور

تقرر قضاۃ

نکاح و طلاق کو سرکاری طور پر درج رجسٹر کرنے کا مسئلہ درحقیقت بڑی اہمیت رکھتا ہے لیکن صرف اندراج کی بحث ہی اہم نہیں ہے بلکہ نکاح و طلاق کے متعلق بہت سی انتظامی باتیں اس سے بھی زیادہ اہم ہیں جن کے بغیر مسلمان سخت دشواریوں اور مذہبی مضرتوں میں مبتلا ہیں خصوصاً لڑکیوں اور ان کے والدین اور اولیاء کے لیئے بہت زیادہ مصیبت ہے۔ بہر حال اس وقت ہمارے سامنے نکاح و طلاق کے اندراج کا مسئلہ ہے اور ہم اپنی بحث کو اسی مسئلہ سے شروع کرتے ہیں۔

سب سے اول اس کی تصریح کر دینی ضروری ہے کہ شریعت اسلامیہ کے اصول و احکام کی بنا پر نکاح و طلاق کی صحت کے لیئے کتابت اور اندراج رجسٹر کی ضرورت نہیں۔

مذہبی طور پر زبانی ایجاب و قبول (بشرائط مقررہ و معتبرہ) صحت نکاح کے لیئے اور زبانی الفاظ طلاق (بشرائط مقررہ و معتبرہ) وقوع طلاق کے لیئے کافی ہیں۔

کوئی نکاح صرف اس وجہ سے کہ وہ لکھا نہیں گیا یا رجسٹر سرکاری میں درج نہیں ہوا۔ اور کوئی طلاق صرف اس وجہ سے کہ وہ لکھی نہیں گئی یا سرکاری رجسٹر میں درج نہیں ہوئی، ناجائز اور باطل یا قابل انکار نہیں قرار دی جا سکتی۔

اور کوئی ایسا قانون جو نکاح و طلاق کی اس حیثیت پر اثر انداز ہو قبول نہیں کیا جا سکتا کیونکہ وہ اسلامی حکم کے خلاف ہوگا۔

ہاں نکاح و طلاق کے اندراج کو صحت نکاح و طلاق کیلئے غیر ضروری تسلیم کرتے ہوئے یہ مسئلہ زیر بحث آسکتا ہے کہ آیا اندراج جائز و مفید ہے یا نہیں۔ پس ابتدائی طور پر اس مسئلہ کے دو پہلو ہیں:۔

ایک یہ کہ اس قسم کا اندراج مفید اور نافع ہے اور اسکو رواج دینا مناسب ہے اور جسقدر لوگ اس پر عمل کریں اتنا ہی فائدہ ہے۔ اس کا نام "اختیاری اندراج" ہے۔

دوسرا یہ کہ چونکہ اس اندراج میں بہت سی مصلحتیں ہیں، بڑی حد تک مقدمات سے نجات ملتی ہے نکاح کے ثبوت اور دین مہر کی تعیین میں سہولت ہوتی ہے اسلئے اسکو لازمی طور پر جاری کر دیا جائے اسکا نام "جبری اندراج" ہے۔

جہاں تک پہلی صورت کا تعلق ہے شریعت اسلامیہ کو نہ صرف یہ کہ اس پر اعتراض نہیں بلکہ اسکے نزدیک وہ پسندیدہ اور مستحسن بھی ہے عملی پہلو کے لحاظ سے اسلامی سلطنتوں اور ہندوستانی مسلم ریاستوں میں اس پر کم و بیش عمل درآمد بھی رہا ہے اور اب بھی موجود ہے۔

قرآن پاک کی آیات ذیل سے بھی اس اندراج کے بہتر اور مستحسن ہونے پر استدلال کیا گیا ہے۔

يا ايها الذين امنوا اذا
تداينتم بدين الى اجل مسمى
فاكتبوه وليكتب بينكم
كاتب بالعدل ولا ياب كاتب
ان يكتب كما علمه الله
فليكتب وليملل الذى عليه
الحق وليتق الله ربه ولا
يبخس منه شيئا فان كان
الذى عليه الحق سفيها
او ضعيفا او لا يستطيع ان
يمل هو فليملل وليه بالعدل
واستشهدوا شهيدين
من رجالكم فان لم يكونا
رجلين فرجل وامراتن
ممن ترضون من الشهداء
ان تضل احدهما فتذكر
احدهما الاخرى ط ولا

اے ایمان والو! جب تم کوئی
ادھار کا معاملہ کرو جسکا ادا کرنا
وقت مقررہ پر ہو تو اسکو لکھ
لیا کرو۔ اور چاہیئے کہ ایک لکھنے
والا انصاف کے ساتھ لکھے اور
لکھنے والا لکھنے سے جیسا کہ اللہ نے
اسکو سکھایا انکار نہ کرے اور جس پر حق
آتا ہو یعنی جسکو دینا ہو وہ لکھوائے
اور وہ اپنے پروردگار اللہ سے
ڈرے اور حق میں سے کچھ کم نہ کرے
اور اگر جس کو دینا ہو وہ ناسمجھ یا
ضعیف ہو یا لکھوا نہ سکتا ہو تو اسکا ولی
اس کی طرف سے اسکو انصاف سے
لکھوائے اور اپنے مردوں میں سے دو
گواہ بنالو۔ اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک
اور دو عورتیں۔ یہ گواہ ان گواہوں میں
سے جن کو تم پسند کرو کہ ایک عورت

یاب الشهداء اذا مادعوا ولاتسئموا ان تکتبوه صغیرا او کبیرا الی اجله ذلکم اقسط عند الله و اقوم للشهادة وادنی الاترتابوا

(البقرہ - ۳۹)

بھولے تو دوسری اسکو یاد دلائے۔ اور گواہوں کو جب بلایا جائے۔ تو وہ انکار نہ کریں۔ اور اس معاملہ کے تاوقت مقرر لکھ لینے میں خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا تم سستی نہ کرو یہ خدا کے نزدیک انصاف سے زیادہ قریب اور شہادت کیلئے زیادہ درست اور تمھارے شک میں نہ پڑنے کے لیے زیادہ مناسب صورت ہے

ان آیات میں ہر اس مالی معاملے کے اندراج وتحریر کی ہدایت کی گئی۔ جو ادھار اور موجل ہو یعنی جسکا ادا کرنا آئندہ کسی وقت پر محول ہو جس میں دین مہر موجل بھی داخل ہے چنانچہ احکام القرآن امام ابوبکر رازی حنفی المتوفی ۳۷۰ھ میں ان آیات کی تفسیر میں ہے۔

وعلی هذا کل دین ثابت موجل فهو مراد بالآیة سواء کان من ابدال المنافع او الاعیان نحو الاجرة الموجلة فی عقود الاجارات والمهر اذا کان موجلا وکذلک الخلع

اور اس بنا پر ہر ثابت اور موجل دین اس آیت میں مراد ہے۔ عام اس سے کہ وہ اشیاء کے منافع کا دین ہو یا خود اشیاء کی ذات کا مثلاً وہ موجل زر معاوضہ جو اجاروں کے معاملوں میں یا مہر میں ہو جبکہ مہر موجل ہو اور اسی طرح خلع کا معاملہ (ج ۱ ص ۴۸۳ قسطنطنیہ)

قاضی ابوبکر ابن العربی مالکی اندلسی المتوفی سنہ ۵۴۳ھ اپنی کتاب احکام القرآن میں حنفیہ کا مسلک لکھتے ہیں :-

قال اصحاب ابی حنیفۃ عموم	اصحاب ابو حنیفہ کہتے ہیں کہ اس آیت
قولہ تعالیٰ اذا تداینتم بدین	کے عموم میں مہر موجل بھی داخل ہے
الی اجل مسمی یدخل تحتہ	(یعنی اسکو لکھنا چاہیئے)
المھر الی اجل (جلد ۱ ص۱۰۲ مصر)	

احادیث میں نکاح و طلاق و خلع وغیرہ کی تحریر و کتابت کا کوئی واقعہ مذکور نہیں ہے اسکی اصلی وجہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں مہر فی الفور ادا کر دیا جاتا تھا تاخیر نہیں کی جاتی تھی یعنی مہر معجل کا دستور اور رواج زیادہ تھا مہر موجل کا اتنا نہ تھا۔ نیز ان کی اخلاقی حالت قابل وثوق تھی۔ اسلئے اس عہد میں تحریر و کتابت کی حاجت نہیں پڑی لیکن جیسے جیسے زمانہ بدلتا گیا اور حالات متغیر ہوتے گئے ان امور میں تحریر و کتابت کا طریقہ بھی مزید ثبوت کے طور پر رواج پذیر ہوا۔ چنانچہ مشہور محدث امام نسائی المتوفی سنہ ۳۰۳ھ نے اپنی سنن میں تابعیوں سے اُن عبارتوں کے نمونے نقل کیئے ہیں جو شرکت و تجارت اور مالی معاملات میں لکھی جانی چاہئیں۔ اسی ضمن میں تفریق و خلع نامہ کی کتابت کی یہ عبارت نقل کی ہے جس کا سرنامہ یا عنوان یہ ہے تفرق الزوجین عن مزاوجتہما یعنی زن و شو کا اپنی زوجیت سے علیحدہ ہونا۔ اس کے بعد اس خلع نامہ کے لکھنے کا پورا خاکہ نقل کیا ہے۔ (کتاب المزارعۃ والوثائق ص۶۱۵ سنن نسائی مطبوعہ نظامی) اس تحریر کی

ابتدائی سطریں یہ ہیں:-

ھذا کتاب کتبتہ فلانۃ بنت فلان بن فلان فی صحۃ منھا وجواز امر لفلان بن فلان بن فلان انی کنت زوجۃ لک

یہ وثیقہ ہے جس کو فلاں عورت فلاں بن فلاں کی لڑکی نے بحالت صحت اور ہوش وحواس فلاں بن فلاں کو لکھ کر دیا کہ میں تمہاری بیوی تھی۔

فقہ کی کتابوں میں بھی اس قسم کی عبارتوں کے نمونے دیئے گئے ہیں جن میں قاضی کسی متنازع فیہ واقعۂ نکاح یا طلاق یا خلع میں تحریری سند زوجین کو یا ان میں سے ایک کو لکھ کر دیا کرتا تھا۔ چنانچہ فتاویٰ عالمگیری کی چھٹی جلد میں کتاب المحاضر والسجلات کے تحت نکاح وطلاق وخلع کی تحریر واندراج کی عبارتوں کے وہ نمونے نقل کیے ہیں جن کو قاضی سند کے طور پر لکھ کر دیتا تھا۔ پھر اسی کتاب کی اسی جلد کے باب کتاب الشروط فصل دوم میں نکاح اور فصل سوم میں طلاق کے اندراج وتحریر کے نمونے دیئے گئے ہیں کہ باپ جب اپنی بالغ لڑکی کا نکاح اپنی ولایت سے کرے تو یہ عبارت لکھی جائے اور جب لڑکی نابالغ ہو تو یہ عبارت لکھی جائے۔ باپ کے علاوہ دوسرے اولیا یہ عبارت لکھوائیں۔ غلام کی طرف سے یہ اور لونڈی کی طرف سے یوں لکھا جائے۔

اسی طرح طلاق کے مختلف اقسام کے الگ الگ وثائق کے نمونے

دیئے گئے ہیں۔ خلع کی صورت میں لکھا ہے کہ امام ابو حنیفہ اور انکے پیرو اماموں میں اسکی صورت تحریر کے بعض الفاظ میں اختلاف ہے :-

فان کانت المرأۃ مدخولۃ وأراد الرجل ان یکتب بذلک کتابا یکتب :- ھذا الکتاب فلان بن فلان یعنی الزوج من فلانۃ بنت فلان ھکذا کان یکتب ابو حنیفۃ واصحابہ رحمھم اللہ تعالیٰ وکان الخصاف والطحاوی والسمتی وھلال وابو زید الشروطی رحمھم اللہ تعالیٰ یزیدون فی ذلک زیادۃ فیکتبون ھذا الکتاب لفلان یعنی الزوج کتبت لہ فلانۃ بنت فلان .....

جب عورت سے ہم بستری ہو چکی ہو اور مرد لکھنا چاہے تو یوں لکھے :- یہ فلاں بن فلاں یعنی شوہر فلاں عورت لڑکی فلاں کی۔ اسی طرح ابو حنیفہ اور ان کے شاگرد لکھا کرتے تھے۔ اور خصاف اور طحاوی اور سمتی اور ہلال اور ابو زید شروطی اس میں کچھ اور بڑھا لیتے تھے۔ وہ اس طرح لکھتے تھے۔ یہ فلاں یعنی شوہر کے لیئے وہ تحریر ہے جو فلاں عورت بنت فلاں نے اسکے لئے لکھی۔

اسی طرح اسی کتاب کی اسی حیل کی فصل ۱۳ میں فی الوکالۃ کے زیر عنوان وثیقہ نویسی کا وہ طریقہ درج ہے جو ایک وکیل بالنکاح

لکھا کرتا ہے :۔

وکلت المسماۃ فلانۃ بنت فلان بن فلان فلانا اقامتہ مقام نفسہا فی تزویجہا من فلان بن فلان علی صداق کذا درھما وکالۃ صحیحۃ وان فلانا قبل ھذہ الوکالۃ قبولا صحیحا ذلک بتاریخ کذا ثم یکتب	مسماۃ فلاں عورت بنت فلاں بن فلاں نے اپنی طرف سے فلاں شخص کو اپنا وکیل بنایا۔ صحیح وکیل بنایا اور اس کو اپنا قائم مقام کیا کہ وہ اس کا نکاح فلاں ابن فلاں سے اتنے درہم کے دین مہر پر کرے۔ اور وکیل مذکور فلاں نے اس وکالت کو صحیح طور سے قبول کیا۔ اور یہ فلاں تاریخ کو ہوا۔ پھر یہ لکھے۔
بسم اللہ الرحمن الرحیم ھذا ما تزوج فلان فلانۃ بتزویج وکیلہا فلان ایاہ بالمہر المذکور فی صدر الکتاب وھو کذا نکاحا صحیحا جائزا بمحضر جماعۃ من الشہود العدول المرضیین	بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ یہ تحریر ہے کہ فلاں مرد فلاں عورت سے اس عورت کے وکیل فلاں شخص کی معرفت اس مہر پہ نکاح کیا جو شروع تحریر مذکور ہے صحیح اور جائز نکاح پسندیدہ اور عادل گواہوں کی ایک جماعت کی موجودگی میں۔

اس سے آگے بڑھ کر یہ ہے کہ بعض فقہا نے کتابت نکاح کو شہادت کی توثیق کی غرض سے مستحب اور مستحسن قرار دیا ہے۔ شامی جلد ثانی کتاب النکاح میں ہے۔

واما الكتابة ففي عتق المحيط
يستحب ان يكتب المعتق
كتابا ويشهد عليه صيانة
عن التجاحد كما في الخزانة
بخلاف سائر التجارات للحرج
لانها مما يكثر وقوعها
وينبغي ان يكون النكاح
كالعتق لانه لاحرج فيه

لیکن کتابت تو محیط کے باب العتق میں ہے کہ مستحب یہ ہے کہ آزاد کرنے والا ایک تحریر لکھ دے۔ اور اس پر گواہ بنا دے تاکہ انکار کرنے والے کے انکار سے اسکو محفوظ کر دیا جائے جیسا کہ کتاب الخزانہ میں ہے۔ برخلاف عام خرید وفروخت کے کہ اس میں کتابت سے معاملات میں تنگی ہوگی۔ کیونکہ یہ معاملے ہر وقت واقع ہوتے رہتے ہیں اور مناسب یہ ہے کہ عتق کی طرح نکاح بھی ہو۔ کیونکہ اسکے تحریر کرنے میں بھی تنگی نہیں۔

ان تمام تصریحات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نکاح وطلاق کا کسی کتاب میں درج کرانا احکام مذہبی کے خلاف نہیں بلکہ مستحب اور مستحسن ہے اور نکاح وطلاق کے مزید ثبوت کا باعث اور مسلمانوں کو بہت سے نزاعات اور مقدمات کی تباہی وبربادی سے بچانے کا سبب ہوگا۔ باایں ہمہ یہ ظاہر ہے کہ عدم اندراج سے نکاح وطلاق کے بذریعہ زبانی شہادتوں کے ثبوت کے عام شرعی قاعدہ میں کوئی مداخلت نہ ہوگی۔ اور نہ ہو سکتی ہے۔

ہم لوگوں میں سے جن کو طلاق و نکاح کے معاملات میں بحیثیت مفتی یا وکیل کے سابقہ پڑا کرتا ہے ان کو پہلے سے یہ معلوم تھا لیکن اب کمیٹی کے عام ممبروں پر بھی شہادتوں سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ مسلمانوں کے معاملات طلاق و نکاح کا کوئی نظام نہ ہونے سے انکو صدہا مشکلات اور دقتوں کا سامنا ہے اور اس سے مسلمانوں کو بھی تکلیفیں پہنچ رہی ہیں۔ ان مشکلات اور دقتوں کی مختلف نوعیتیں ہیں اور ان سب پر غور کرنا اور انکا علاج سوچنا ہمارا فرض ہے۔

۱۔ چونکہ نکاح خواں قاضی کے لیئے علمی صفات کی کوئی قید نہیں ہے اسلیئے ہر کس و ناکس اس فرض کو ادا کر دیتا ہے اور جہالت کی وجہ سے ایسے نکاح کر دیئے جاتے ہیں جو شرعاً جائز نہیں جسکا نتیجہ مسلمانوں کی عزت و آبرو کے علاوہ ان کے خاندانی نسل اور ترکہ و وراثت پر پڑتا ہے۔ رضاعت کے پیچیدہ اصول سے وہ واقف نہیں ہوتے۔ رشتوں میں حلال و حرام کا فرق نہیں کر سکتے۔ عدت میں نکاح کر دینے کے مجرم ہوتے ہیں۔ طلاق کی بھی مختلف صورتوں کے نہ سمجھنے کے باعث کبھی ظاہری مطلقہ اور حقیقتہً غیر مطلقہ کا نکاح دوسرے سے کر دیتے ہیں۔ اولیاء کے باہمی فرق مراتب اور انکے اختیارات کے عدم واقفیت کے باعث بہت سی غلطیاں کرتے ہیں اور وہ حلال کو حرام اور حرام کو حلال کر بیٹھتے ہیں بالآخر وہ مقدمات کی صورت میں متعلقہ خاندانوں اور عدالت دونوں کے لیئے مصیبت کا باعث ہو جاتے ہیں۔

۲- چونکہ شریعت اسلامی میں نکاح و طلاق کے تئیں انعقاد اور وقوع کیلئے شہادتوں کا درج تحریر ہونا ضروری نہیں ہے اور لوگ عموماً بے پرواہی کے ساتھ گواہوں کا انتخاب کرتے ہیں اور پھر یہ بھی دستور ہے کہ تبرک کیلئے عموماً بڑے بوڑھے اور بزرگ اس خدمت کے لئے منتخب ہوتے ہیں۔ اور عموماً ان معاملات میں جھگڑے نکاح کی ایک مدت کے بعد بلکہ فریقین میں سے ایک کی وفات کے بعد پیش آتے ہیں۔ اس وقت یا تو گواہ مر چکے ہیں یا ہوش و حواس اور حافظہ کھو بیٹھے ہیں۔ اسلئے ایک مدت کے بعد نکاح کے ثبوت میں سخت دقتیں پیش آتی ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ دین مہر کے تحریری نہ ہونے کے باعث تعین مہر کی دشواریاں پیش آتی ہیں۔ اور صوبہ کے بعض حصوں میں عدالتوں کو اپنے قانون کے ماتحت دین مہر کی رقم میں اپنے قیاسات سے کام لے کر مداخلت کرنی پڑتی ہے اور کبھی یہ ہوتا ہے کہ دوسرے تحریری قرضوں کے مقابلہ میں یہ غیر تحریری قرضہ ناقابل ثبوت ہوکر ساقط کر دیا جاتا ہے۔

۳- شریعت اسلامیہ میں متعدد صورتیں ایسی ہیں جن میں عورتوں کو مردوں سے علیحدگی اور تفریق کی یا نکاح کے فسخ کرانے کی اجازت دی گئی ہے لیکن ان تمام صورتوں کے لئے یہ ضروری قرار دیا گیا ہے کہ وہ مسلمان قاضی وقت کی قضا اور فیصلہ سے ہوں۔ جس کے ہاتھ میں تنفیذی طاقت اور قوت ہو۔ مثلاً نابالغ لڑکی جس کا نکاح باپ کے اور دادا کے سوا اور کسی نے کر دیا ہو وہ بلوغ کے بعد اپنے اس نکاح کو ناپسند کر کے رد کر سکتی ہے

مگر اس کے لیئے مسلمان قاضی کے حکم و فیصلہ کی ضرورت ہے۔ اسی طرح اگر کسی عورت کا شوہر کم از کم چار برس سے مفقود الخبر ہے تو وہ دوسرا نکاح کر سکتی ہے مگر اس کے لیئے بھی قاضی مسلم کی اجازت شرط ہے۔ ایسے ہی اگر کوئی عورت خلع کرانا چاہتی ہے تو وہ بھی مسلمان قاضی ہی کی محتاج ہے نیز اگر کوئی شوہر اپنی بیوی کو نان و نفقہ نہیں دیتا تو وہ بعض صورتوں میں شوہر سے الگ ہو سکتی ہے۔ مگر قاضی مسلم کے فیصلہ کے بغیر نہیں غرض عورت کی طرف سے ہر علیحدگی اور تفریق کے لیئے ایسے مسلمان قاضی کی ضرورت ہے جو تنفیذی طاقت اور قضا کا اختیار رکھتا ہو چونکہ گورنمنٹ نے جب سے قاضیوں کے نظام کو برطرف کر کے موجودہ عدالتوں کا نظام قائم کیا ان معاملات کو زیر غور نہیں رکھا۔ اسیلئے اسکو غالبًا مسلمانوں کی ان مشکلات کا اندازہ نہیں ہوا حالانکہ مسلمان عورتوں کو حد درجہ تکلیفیں اور دقتیں در پیش ہیں۔ گواہوں میں سے اکثر اصحاب نے جن کو ان معاملات سے تعلق ہے ان دقتوں کا ذکر کیا ہے۔ اور بعض قابل شرم اور نہایت بے رحمانہ اور بعض نہایت سنگ دلانہ واقعات کو انھوں نے بیان کیا۔ جو موجودہ کمیٹی کے اختیار سے باہر ہونے کے سبب تحریر میں نہ آسکے۔ تاہم حالت ایسی دردناک ہے کہ کسی ملک کی گورنمنٹ اسکو نظر انداز نہیں کر سکتی۔

مولانا عنایت اللہ صاحب فرنگی محلی کے جواب میں یہ مذکور ہے کہ صرف ایک فرنگی محل میں ماہوار دس پندرہ فتوی اس قسم کے پیش آتے ہیں جن میں با اختیار مسلمان قاضی کی ضرورت پیش آتی ہے۔ ہمارے صوبہ میں

فرنگی محل کے علاوہ ندوۃ العلماء لکھنؤ اور نیز بدایوں۔ بریلی۔ دیوبند۔ سہارنپور کانپور۔ جونپور۔ اعظم گڈھ وغیرہ میں بھی دارالافتاء ہیں اگر ان میں سے ہر جگہ کی تعداد یکجا کرلی جائے تو یہ کسقدر زیادہ ہوجائیگی۔

نیز ایک دوسرے گواہ مولانا ابوبکر محمد شیث صاحب فاروقی ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی کے جوابات ملاحظہ کیجئے جن میں وہ بیان کرتے ہیں کہ اُن کے علم میں اس قسم کے بکثرت معاملات ہر سال پیش آتے رہتے ہیں اور مسلمانوں کے ہاتھوں میں انکا کوئی علاج نہیں ہے۔ اسی طرح دوسرے گواہوں کے بیانات ہماری تصدیق کرینگے۔

موجودہ زیر تجویز قانون سے پہلی اور دوسری مشکلیں بہت حد تک دور ہوجائینگی لیکن تیسری مشکل کے حل میں موجودہ صورت میں کوئی مدد نہیں مل سکتی اور اسکے متعلق باوجود شدت احساس کے ہم اسلئے کوئی تفصیل نہیں کرسکتے کہ اسکا علاج موجودہ کمیٹی کی وسعت اور اختیار سے خارج ہے لیکن چونکہ خوش قسمتی سے گورنمنٹ نے مسلمانوں کی ان پریشانیوں اور مصیبتوں کو محسوس کرکے جو نکاح وطلاق کے اندراجات نہ ہونے سے پیش آتی ہیں اُن کے ازالہ کی جانب توجہ کی ہے اور اسکے جوانب و اسباب پر غور کرنے کے لئے یہ کمیٹی مقرر کی ہے۔ اسلئے کمیٹی کو حق ہے کہ عدم اندراج کی مضرتوں کے ساتھ ساتھ ان مضرتوں اور مصیبتوں کو بھی روشنی میں لے آئے جو عدم اندراج کی مصیبتوں سے بدرجہا زیادہ سخت اور تباہ کن ہیں۔ اور گورنمنٹ سے درخواست کرے کہ جس طرح اس نے ان دقتوں کے ازالہ

کی جانب توجہ فرمائی ہے اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ انکو اپنی مسلمان رعایا کی اس پریشانی اور مصیبت کو رفع کرنے کی سعی کرنی چاہیئے جو بااختیار مسلم قاضی کے نہ ہونے کی وجہ سے رات دن پیش آرہی ہے۔ اور جس نے مسلمان لڑکیوں کی زندگی تلخ کردی ہے۔

ہماری رائے میں اگر گورنمنٹ مسلمان مظلوم لڑکیوں کی اس ناقابل برداشت مصیبت کو رفع کرنے کے لیے حسب ذیل صورتوں میں سے کوئی صورت اختیار کرے تو مسلمانوں کی بہت بڑی مشکل حل ہو جائیگی۔

۱۔ مثلاً اگر یہ کہا جائے کہ ان تمام قاضیوں کو ایک مرکزی نظام میں لاکر پورے صوبہ میں مسلمانوں کے نکاح وطلاق کے لیے ایک علیحدہ محکمہ قضا قائم کردیا جائے جس کو ان معاملات میں حق فیصلہ ہو تو یہ ساری مشکلات دور ہو جائینگی اور تمام چیزیں مرتب صورت میں ہو جائینگی۔ عدالتیں بھی بہت سے مقدمات سے بچ جائینگی۔ رجسٹری آفس بھی نئی ذمہ داریوں سے محفوظ رہے گا۔

۲۔ اگر بالفعل یہ ممکن نہ ہو تو اس مشکل کے حل کی آسان صورت یہ ہیکہ قاضیوں کو ان معاملات کے متعلق وہ اختیارات دیئے جائیں۔ جو آنریری منصفوں کو حاصل ہیں تاکہ وہ اپنے اختیارات سے اس مشکل کو دور کرسکیں۔

یہ یاد رہے کہ موجودہ عدالتیں اس مشکل کو اسلیئے حل نہیں کرسکتی ہیں کہ ان مسائل میں شرع اسلامی کی رو سے غیر مسلم حاکم کا فیصلہ جائز نہ ہوگا اور نیز ایسے مسلمان حاکموں سے انکے فیصلے کرائے جاسکتے ہیں جو قانون شرع سے واقف نہ ہوں تیسری صورت یہ ممکن ہے کہ

۳- ہر ضلع میں کسی ایک مسلمان حاکم کو جس نے ان مسائل کا خاص امتحان پاس کیا ہو ایسا اختیار دیا جائے جس کے سبب سے وہ ان مشکلات کا حل کر سکے۔

مسلمانوں کے ان معاملات کے لیئے خود ہندوستان میں اسلامی حکومتوں کے زمانہ میں خاص محکمہ تھا جس کا افسر اعلیٰ صدر جہاں (قاضی القضاۃ) کہلاتا تھا اوسی کا اثر ہے کہ آج بھی ہندوستان کی اسلامی ریاستوں میں یہ عہدہ کسی نہ کسی صورت میں قائم ہے۔ بلکہ اس ملک کی ہندو ریاستوں تک نے بھی اپنی مسلمان رعایا کے لیئے اس قسم کے قاضی اور مفتی مقرر کر رکھے ہیں پھر تعجب ہے کہ ہندوستان کی حکومت نے کیوں اس بارہ میں اپنا فرض محسوس نہیں کیا۔

مسلمان سلطنتوں میں آج بھی یہ عہدے قائم ہیں بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ امریکہ نے فلپائن میں، فرانس نے شمالی افریقہ کی نوآبادیوں میں اور روس نے اپنی سلطنت میں مسلمانوں کے لیئے اس نظم کو قائم رکھا ہے کہ بغیر اسکے انکی معاشرتی زندگی قائم رہنی مشکل ہے۔ اسلیئے ہمارے صوبہ کو جو اسلامی آبادی کا علمی اور تعلیمی مرکز ہے اسکی طرف پیشقدمی مناسب ہے۔

اسی سلسلہ میں سوال کی دوسری شق بھی سامنے آجاتی ہے اور وہ یہ کہ کیا نکاح و طلاق کا جبری طور سے درج رجسٹر کرانے کا حکم از روئے شرع اسلام جائز ہو سکتا ہے۔

اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو صرف چند عقائد، عبادات اور اخلاقی احکام ہی کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ وہ خود ایک منتظم قانون اور شریعت ہے جو شخص مسلمان ہوتا ہے اس کے لیئے صرف چند عقائد اور اخلاقی احکام کا

تسلیم کرنا اور چند رسوم واعمال کا بجا لانا ہی کافی نہیں ہے بلکہ ضروری ہے کہ اوسکی زندگی اور زندگی کا ہر معاملہ اس کے قانون اور شریعت کے مطابق ہو۔ اسلامی فقہ، پوری قوم، ملک بلکہ سلطنت کے تمام پیش آنے والے معاملات پر محیط ہے اور ایسے اصول بنا دیئے گئے ہیں جن کی مدد سے نئے پیش آنے والے واقعات کا بھی جواب دیا جا سکتا ہے۔

اس بنا پر ایک مسلمان کے لیئے ناممکن ہے کہ وہ مسلمان رہ کر اپنی مقدرت اور استطاعت کے باوجود اسلامی قانون کو چھوڑ کر اپنے اوپر کوئی دوسرا قانون لازم کرے اور خود اپنی رضامندی سے اس کو قبول کرے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی تمام سلطنتوں نے اپنی مسلمانان رعایا کی اس مذہبی معذرت کو قبول کیا ہے اور اُن کیلیئے ان کے مذہبی قانون کو برقرار رکھا ہے اور ہر جگہ اُن کے مذہبی قوانین کے اجراء کے لیئے ایک خاص اسلامی صیغہ اپنے ماتحت قائم کر رکھا ہے۔ ہندوستان میں بھی ابتدائی انگریزی عملداری میں تقریباً اسی طرح عمل درآمد تھا۔ چنانچہ اس زمانہ میں انگریز حکام کو اسلامی قانون کو بتلانے کیلیئے متعدد مذہبی مشیر ہوتے تھے اور اسی ضرورت کے لیئے فارسی زبان میں فقہ اسلامی پر انگریزی قانون کے رنگ میں متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں۔ جو اب تک موجود ہیں اور اسی عمل درآمد کا ایک بگڑا ہوا نقشہ ہے جو بنگال وغیرہ میں نکاح خوان قاضیونکی صورت میں باقی ہے۔ اس وقت بھی ہندو ریاستوں میں اسی اصول کی بنا پر مسلمانوں کے لیئے مسلمان قاضی مقرر ہوتے ہیں جو مسلمانونکے مذہبی

معاملات کا تصفیہ کرتے ہیں۔

الغرض صورت حال یہ ہے کہ غیر اسلامی ملکوں میں اور خصوصًا ایسے ملک میں جہاں پہلے ان کی حکومت رہی ہو اور پھر اتفاق زمانہ سے دوسری غیر اسلامی سلطنت وہاں قائم ہو گئی ہو جو ایسی مہربان ہو کہ مسلمانوں کے مذہبی مراسم ادا کرنے میں خلل انداز نہ ہو اور ان کے مذہبی قوانین میں مداخلت نہ کرے تو بھی اس ملک کے مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ اس سلطنت سے اس بات کی درخواست کریں کہ وہ اپنی طرف سے ایک مسلمان والی مقرر کرے اور وہ مسلمان والی اپنی طرف سے مسلمانوں کے معاملات کو طے کرنے کے لیۓ اور انکے نظام مذہبی کو برقرار رکھنے کے لیۓ قضاۃ مقرر کرے۔ ان قضاۃ کا فیصلہ اور حکم نافذ ہو گا۔ اور قابل تسلیم و اطاعت ہو گا۔ اگر یہ درخواست قبول نہ ہو سکے تو مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ باہمی رضامندی اور اتفاق سے کسی ایک شخص کو منتخب کر کے اپنا قاضی بنا لیں اور اسکے احکام اور فیصلوں کو تسلیم کریں۔

یہ تو اس معاملہ میں فقہ کی اصلی صورت ہے جسکا تعلق صرف نکاح و طلاق سے نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کے تمام نزاعی اور قانونی معاملات سے ہے لیکن چونکہ تمام قانونی معاملات میں سے نکاح و طلاق اور ان کے متعلقات کی حیثیت اسلام کی نظر میں صرف ایک قانونی معاملہ کی نہیں ہے بلکہ مذہبی معاملہ کی بھی ہے۔ ان کا ایک رخ قانونی معاملہ کا ہے تو دوسرا رخ مذہبی عبادات کا ہے۔ یہ ایسے مسائل ہیں جن کا تعلق مسلمانوں کی عزت آبرو

زن و شو کے صحیح اور غیر صحیح ہونے، اولاد کے جائز اور ناجائز ہونے ترکہ اور وراثت کے استحقاق و عدم استحقاق وغیرہ سے ہے اسلئے ضرورت ہے کہ ان معاملات کو شریعت اسلامی کے مطابق طے ہونے کی پوری کوشش کی جائے۔

ہندوستان کی گورنمنٹ نے اس ملک میں مسلمانوں کے لیے ان معاملات میں انہی کا مذہبی قانون تسلیم کیا ہے جس کا نام محمڈن لا ہے لیکن سب سے بڑی دقت جو ان معاملات میں مسلمانوں کو پیش ہے وہ یہ ہے کہ عدالتوں اور اُن کے حاکموں کا مسلمان ہونا ضروری نہیں ہے۔ ایسی صورت میں خواہ کسی قدر محمڈن لا کے مطابق وہ فیصلہ ہو اسلام کی نظر میں وہ اس وقت تک نافذ العمل نہیں ہو سکتا جب تک وہ کسی مسلمان حاکم و قاضی کی عدالت سے فیصل نہ ہو۔ انگریزی عدالتوں کے بعض ایسے عام اصول متعلق شہادت وغیرہ ہیں جو اسلامی قانون سے مطابق نہیں ہیں جنکی وجہ سے یہ نکاح و طلاق کے نیم مذہبی اور نیم قانونی معاملات صحیح اسلامی قانون کے مطابق فیصل نہیں ہونے پاتے۔

آج کل محتاط اور مذہبی مسلمان گورنمنٹ کی عدالتوں کے قوانین سے مجبور ہو کر یہ صورت اختیار کرتے ہیں کہ کسی معزز شخص یا مستند عالم کو ثالث مان کر اسکے فیصلہ کو تسلیم کرتے ہیں مگر چونکہ انکے فیصلے قانونی حق تنفیذ نہیں رکھتے اسلئے شوہروں پر اور دوسرے متعلقہ اشخاص پر ان کی پابندی ضروری نہیں رہتی۔

اس صورت حال کا سب سے بدترین مظہر غریب مسلمان عورتوں کی
حالت ہے جو ظالم سفاک بے درد شوہروں سے کسی حالت میں نجات
نہیں پا سکتیں حالانکہ شریعت اسلامیہ نے اُن کے تمام حالات کا لحاظ
رکھا ہے۔ اور خیار خلع فسخ اور تفریق کی متعدد صورتیں ایسی رکھی ہیں جنکے
ذریعہ سے وہ ایسے شوہروں سے نجات پا سکتی ہیں۔ ہر وہ لڑکی جس کا
نکاح نابالغی میں اس کے باپ یا دادا کے سوا کسی اور ولی نے کسی سے پڑھا
دیا ہو بالغ ہونے کے بعد وہ اختیار کامل رکھتی ہے کہ وہ اپنے اس نکاح کو
فسخ کر دے۔ مگر ان تمام صورتوں میں جماعتی نظام کو قائم رکھنے کیلیے اسلامی
شریعت نے قاضی کی منظوری اور فیصلہ کو ضروری قرار دیا ہے۔ لیکن
ہندوستان میں مسلمانوں کی جو کیفیت ہے اسکی بنا پر ان تمام صورتوں کے
دروازے مسلمان والدین اور لڑکیوں اور عورتوں کے لیے بند ہیں اس سے
قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کے مسلمان کسقدر معاشرتی تکلیف
اور مصیبت کے شکنجے میں گرفتار ہیں اور موجودہ صورت میں اس سے
نجات پانے کی انکے پاس کوئی تدبیر نہیں ہے۔

خوش قسمتی سے اس وقت ایک ایسی صورت حال ہمارے سامنے ہے
جس سے ایک طرف مسلمانوں کی ان مشکلات کا حل ہو جاتا ہے اور دوسری
طرف اس خاص مسئلہ یعنی نکاح و طلاق کے لازمی طور سے درج تحریر کر لینے
اور اسی قسم کے دوسرے احکام متعلقہ کے صادر کرنے کے لیے جن سے
مسلمانوں کے فائدہ اور منفعت اور اسلامی مصالح کی رعایت مدنظر ہو

ایک صحیح شکل پیدا ہو جاتی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ حکومت مسلمانوں کیلئے ایک مرکزی محکمۂ قضاء اور اضلاع اور تحصیلوں میں اس کی شاخوں کا قیام منظور کرے۔

تحریر نکاح و طلاق کے جبری قرار دینے میں فقہی حیثیت سے دو اعتراضات ہیں ایک یہ کہ یہ درج و تحریر شرعاً صرف مستحب یا پسندیدہ ہے، فرض و واجب نہیں کسی شرعی اختیار کے بغیر کسی تبرع اور استحباب کو واجب میں نہیں بدلا جا سکتا۔ یہ شرعی اختیار صرف امام مسلمین کو پہنچتا ہے کہ وہ مسلمانوں کی مصلحتوں کی بنا پر اپنے زمانہ میں کسی قانون کو جو اصل میں غیر واجب ہو، واجب قرار دے دے۔ اسکی مثالیں احکام اسلامی میں موجود ہیں جنکی تفصیل کا موقع نہیں۔ ان ملکوں میں جہاں امام نہیں یعنی غیر مسلم حکومت ہے وہاں کے مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ سب متحد ہو کر اپنے اوپر کسی ایک والی یعنی قائم مقام امام کا انتخاب کرلیں۔ ایسی غیر مسلم حکومت اگر صرف خراج وصول کر کے مسلمانوں کو اپنے معاملات میں خود مختار قرار دے دیتی ہو یا یہ کہ وہ اندرونی معاملات میں مداخلت کرنا چاہتی ہے تو پہلی صورت میں مسلمانوں پر از خود ایسے والی کا انتخاب اور تقرر آسان ہوا اور دوسری صورت میں مسلمانوں پر یہ کوشش فرض ہے کہ وہ اس غیر مسلم حکومت سے مطالبہ کریں کہ وہ اپنی طرف سے ایک مسلمان والی ان پر مقرر کرے اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو مسلمانوں پر یہ ضروری ہے کہ وہ متحد ہو کر اپنی رضامندی سے قاضی کا انتخاب کریں۔ جو ان کے معاملات کا فیصلہ کرے، اور احکام

اسلامی کا اجراء کرے۔

غرض غیر مسلم حکومت میں مسلمانوں کے لیئے اُن کی وسعت اور استطاعت کے مطابق اپنے معاملات کے نظم ونسق وترتیب اجراء کیلیئے حسب ذیل تین شکلیں ہیں۔

۱۔ اگر ممکن ہو تو مسلمان خود اپنی طرف سے متفق ومتحد ہوکر ایک والی کا انتخاب کریں اور وہ قاضیوں کا تقرر کریگا۔

۲۔ یہ نہ ہوسکے تو اس غیر مسلم حکومت سے مطالبہ کیا جائے کہ وہی اُن پر ایک مسلمان والی مقرر کردے یہ مسلمان والی پھر قاضیوں کا تقرر کرے۔

۳۔ یہ بھی نہ ہو تو مسلمان اپنی باہمی رضامندی سے قاضی ہی کا انتخاب کریں۔ یہ تینوں شکلیں فقہ کی کتابوں میں مذکور ہیں۔

(۱) اذا لم یکن سلطان ولا من یجوز التقلد منه کما هو فی بعض بلاد المسلمین غلب علیهم الکفار کقرطبة فی بلاد المغرب الآن وبلنسیة وبلاد الحبشة واقروا المسلمین عندهم علی مال یوخذ منهم یجب علیهم ان یتفقوا علی واحد منهم

اگر کسی ملک میں مسلمان حاکم نہ ہو اور نہ اُس شخص کا وجود ہے جو قاضی کا تقرر کرسکے جیسا کہ مسلمانوں کے بعض ان ملکوں کا حال ہے جن پر غیر مسلم اب قابض ہوگئے ہیں جیسے ملک مغرب میں آج کل قرطبہ اور بلنسیہ اور حبشہ کہ انھوں نے مسلمانوں کو اپنے یہاں رہنے کی اجازت خراج ومحصول ادا کرنے پر

يجعلونه واليا فيولي قاضيا او يكون هو الذي يقضي بينهم وكذا ينصبوا لهم اماما يصلي بهم الجمعة.

(فتح القدير)

سے دی ہے ایسے ملکوں کے مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ اپنے میں سے کسی ایک شخص پر متفق ہو کر اسکو اپنا والی بنالیں اور وہ والی کسی کو قاضی بنائے۔ یا وہی والی قضا کا کام بھی کرے۔ اور ایسا ہی ضروری ہے کہ وہ امام مقرر کر لیں جو انکو جمعہ کی نماز پڑھائے۔

(۲) بلاد عليها ولاة كفار يجوز للمسلمين اقامة الجمع ويصير القاضي قاضيا بتراضي المسلمين ويجب عليهم ان يلتمسوا واليا مسلماً

(عالمگیری ردالمحتار عن المبسوط)

(۲) ایسے ملک میں جن پر غیر مسلم حاکم ہیں مسلمانوں کو جمعہ قائم کرنا درست ہے اور ایسے ملک میں مسلمانوں کی رضامندی سے قاضی، قاضی ہو جائیگا۔ اور اس ملک کے مسلمانوں پر واجب ہوگا کہ وہ حکومت سے کسی مسلمان والی کے تقرر کا مطالبہ کریں۔

(۳) كل مصر فيه وال مسلم من جهة الكفار يجوز منه اقامة الجمع والاعياد واخذ الخراج وتقليد القضاء وتزويج الايامى لاستيلاء المسلم

۳۔ ہر وہ ملک جس میں غیر مسلموں کی طرف سے کوئی مسلمان والی مقرر ہو اس والی کی طرف سے جمعہ اور عیدین کی نماز کا قیام درست ہے۔ اور اسی طرح خراج لینا اور قاضیوں کا

عليهم .... واما في بلاد عليها ولاة كفار فيجوز للمسلمين اقامة الجمع والاعياد ويصير القاضي قاضيا بتراضي المسلمين ويجب عليهم طلب وال مسلم

(رد المحتار)

کا مقرر کرنا۔ اور بیواؤں کا نکاح اس کی اجازت سے اسلئے درست ہے کہ اُس نے مسلمانوں کو ان پر حاکم بنایا ہے .... لیکن اُن ملکوں میں جن پر غیر مسلم والی مقرر ہیں۔ مسلمانوں کے لئے جمعہ اور عیدین کی نمازیں درست ہیں۔ اور قاضی مسلمانوں کی رضامندی سے قاضی ہو جائے گا۔ اور وہاں کے مسلمانوں پر واجب ہے کہ حکومت سے کسی مسلمان والی کا مطالبہ کریں

ہندوستان میں مسلمانوں کے معاملات کے نظم و نسق و ترتیب اور احکام کے اجراء اور قضا کے لیے تینوں مذکورۂ بالا شکلوں میں سے ایک شکل اختیار کرنی پڑے گی۔ ہندوستان میں مختلف مذہبوں اور قوموں کی ایسی مخلوط آبادی ہے جس کا لحاظ کرکے یہاں کی غیر مسلم حکومت کو خاص مسلمانوں کے لیے ایک مستقل مسلمان والی کے تقرر کو منظور کرنا تقریبًا ناممکن ہے۔ اس بنا پر اگر کوئی صورت ممکن ہے تو وہ یہ ہے کہ مسلمان اپنی رضامندی سے ایک قاضی کا انتخاب کریں اور اس قاضی کو تنفیذ کی طاقت اور قوت حاصل ہونے کے لیے ضروری ہے کہ حکومت اس انتخاب کو قبول کرے اس بنا پر اگر اس صوبہ کے مسلمان ایک قاضی القضاۃ کا انتخاب کریں

اور گورنمنٹ اُس کو منظور کرے۔ اور یہ قاضی القضاۃ مسلمانوں کی رضامندی اور گورنمنٹ کی منظوری سے اضلاع اور تحصیلوں میں قاضیوں اور نائب قاضیوں کا تقرر کرے تو تمام مشکلات کا حل ہو جاتا ہے۔

اس قاضی اعلیٰ کا احکام اسلامی کے اجراء معاملات کے تصفیہ اور مصالح مسلمین کی بنا پر بعض مستحب و جائز قانونی امور کا واجب گردانا ممکن ہے۔

اس تفصیل سے واضح ہوگا کہ شریعت اسلامی کے کسی جائز اور مستحب قانونی امر کو واجب اور لازم قرار دینے کی کیا شکل ہے۔ اگر اس شکل کو اختیار کیا جائے تو اس شکل (درج نکاح کو لازمی قرار دینا) کے حل ہونے کے علاوہ مسلمانوں کے نکاح و طلاق و فسخ وغیرہ کی تمام دقتیں رفع ہو جائینگی۔

مسلمان غیر مسلم حکومتوں میں جہاں کہیں بھی آباد ہیں یا گذشتہ صدیوں میں چین، ہندوستان، روم جہاں کہیں بھی اسلامی قبضہ سے پہلے آباد تھے اسی نظام کے ماتحت وہ ان غیر مسلم حکومتوں میں آباد تھے۔ اور تاریخ اور سفرناموں میں اسکی پوری تفصیل موجود ہے۔ ہندوستان پر اسلامی قبضے سے پہلے سواحل ہند میں راجاؤں کے ماتحت جو مسلمان رہتے تھے۔ ان کے اس نظام کے مسلمان افسر اعلیٰ کا نام "ہنرمند" ہوتا تھا جسکو راجہ مسلمانوں کی مرضی سے ان پر مقرر کرتا تھا اور آج بھی فلسطین، شام، تونس، الجیریا حتی کہ روس اور فلپائن میں بھی یہی صورت ہے بلکہ خود ہندوستان کی اسلامی حتی کہ ہندو ریاستوں میں بھی اس پر عمل ہے۔

قاضیوں کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کے تمام امور و معاملات میں

احکام اور فیصلے جاری کریں بلکہ حکومت وقت جس قدر اور جتنے اختیارات اور حقوق اور جن معاملات تک ان کے اختیارات کو محدود کرنا چاہے کر سکتی ہے چنانچہ کتب فقہ میں یہ جزئیہ مذکور ہے۔

ومنها (ای من احکام القضاة) صحة تعليقه واضافته وتقييده بزمان ومكان (بحر الرائق)	اور قاضیوں کے احکام میں سے ایک یہ ہے کہ والی اپنے قاضی کے زمانہ اور مکان کی تعیین کر دے۔ (یعنی یہ کہ اس کے قضا کے حدود کہاں تک ہونگے اور کب تک ہونگے)
ولو استثنى حوادث فلان لا يقضى فيها ولو قضى لا ينفذ (بحر الرائق)	اسی طرح یہ بھی درست ہے کہ بعض قسم کے معاملات کو مستثنیٰ کر دے، اگر قاضی ان مقدمات کا فیصلہ کریگا جن میں اس کو قاضی نہیں بنایا گیا۔ تو وہ فیصلہ نافذ نہیں ہوگا۔
اذا قلد السلطان رجلا قضاء بلدة كذا لا يصير قاضيا فى سواد تلك البلدة ما لم يقلد قضاء البلدة ونواحيها (عالمگیری)	اگر امام کسی شخص کو کسی خاص شہر کا قاضی بنائے تو وہ شخص اس شہر کے اطراف کا قاضی نہ ہوگا جب تک امام تصریح نہ کر دے کہ وہ اس شہر اور اسکے اطراف کا بھی قاضی ہے۔
واذا قلد السلطان الامارة	اگر امام امیر کی امارت یا قضاء کو لفظ

والقضاء بالشرط واضافها الی وقت فی المستقبل ...... فذلک جائز واذا قلد السلطان رجلا قضاء یوم یجوز ویتاقت واذا قیده بالمکان یجوز ویتقید بذلک المکان وکذا یجوز استثناء سماع بعض الحکومات

(عالمگیری)

شرطوں سے محدود کردے اور اس کو کسی آئندہ زمانہ کی طرف نسبت کردے تو یہ جائز ہے اور اسی طرح یہ بھی جائز ہے کہ اگر سلطان کسی شخص کو کسی خاص دن کا قاضی بنا دے تو وہ اسی دن کا قاضی ہوگا اور اگر کسی مقام کی قید لگا دے تو اسی مقام کا قاضی ہوگا اور ایسا ہی اگر بعض مقدمات کی سماعت کا اختیار نہ دے تو یہ بھی جائز ہے۔

اسلیے اگر موجودہ حالت میں ان قاضیوں کے اختیارات نکاح و فسخ و طلاق اور انکے متعلقات تک محدود کر دیے جائیں تو جائز ہوگا۔ اور ان مسائل میں انکا فیصلہ صحیح ہوگا اور اسطرح ان مسائل میں مسلمانوں کی دقتوں کا خاتمہ ہوگا۔ اور حکومت اور رعایا دونوں کیلئے اس میں خیر و فلاح کی توقع کی جا سکتی ہے بخلاف اسکے اگر مسلمان قاضیوں کو اختیارات نہ دیے جائیں اور قانون کی یہی شکل ہو کہ اسکی تنفیذ تمام عمال حکومت کے ہاتھ سے ہو خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم تو ہماری قطعی رائے ہے کہ غیر مسلم کی جانب سے نہ جبری اندراج کا حکم صحیح اور قابل قبول ہو سکتا ہے اور نہ مسلمانوں کی مشکلات کا خاتمہ ہوگا۔

تاج محل اور لال قلعہ کے معمار

ہندوستان کے ارباب کمال میں خدا جانے کتنی ہستیاں ہیں جو گمنامی کے پردہ میں اس طرح چھپی ہیں کہ آج ہزار تلاش اور جستجو پر بھی انکا سراغ نہیں لگتا۔ اس ملک میں تاریخ نویسی کا رواج بہت کم تھا۔ گو مسلمانوں کے آنے کے بعد تاریخ کی کچھ کچھ روشنی یہاں پھیلنے لگی۔ پھر بھی بادشاہوں کے ایوان تاریخ سے باہر بدستور اندھیرا چھایا رہا۔ شاعروں نے البتہ اپنے تذکروں کی محفل میں شمع جلائی۔ مگر اسکی روشنی اتنی مدھم ہے کہ خود انکی صورتیں بھی اس سے پہچان میں اچھی طرح نہیں آتیں۔ روحانی بزرگوں کے مزاروں پر بھی چراغ جلائے گئے ہیں مگر ان سے بھی تبرکات اور کرامات کے سوا کچھ اور نظر نہیں آتا۔ اگر ملا بدایونی شاہ عبدالحق دہلوی۔ اور آزاد بلگرامی نہ ہوتے تو جو کچھ بھی معلوم ہے وہ ہم کو معلوم نہ ہو سکتا۔

لاہور کے جس مہندس خاندان کا حال آج ہم کو سنانا ہے افسوس ہے کہ تاریخوں میں نام کے سوا اسکے کسی رکن کا حال بھی مجھے معلوم نہیں ہوا۔ حالانکہ انکی بنائی ہوئی عمارتیں تاج آگرہ۔ لال قلعہ۔ اور جامع مسجد دہلی ہمیشہ سے مشہور روزگار ہیں مگر کتنے افسوس کی بات ہے کہ جن باکمالوں نے فن کی ندرت کا یہ

کمال دکھایا ہے کاغذ کے پرانے اوراق میں بھی انکا نام ونشان نہیں ملتا۔

شاہجہاں کی تاریخوں میں اس کے سال ششم میں روضۂ تاج محل کے بننے کا پورا حال ایک ایک چیز کی پیمائش کے ساتھ لکھا ہے۔ مگر جن نادرہ کار مہندسوں، نقاشوں اور طراحوں نے اسکا خاکہ کھینچا اور جن معماروں نے انکو بنا کر تیار کیا ان غریبوں کے نام تک بھی ان اوراق میں جگہ نہ پاسکے۔ اور آج کل کے محققین بڑی چھان بین کے بعد بھی انکا پتہ لگانے میں پوری طرح کامیاب نہ ہوسکے۔

اس خاندان کے بعض ارکان کے نام مصنف کی حیثیت سے بعض کتبخانوں کی فہرستوں میں مذکور ہیں۔ مگر ان میں بھی نام کے سوا کچھ اور نہیں۔ اور نہ ان افراد کے باہمی تعلق کا ذکر ہے بلکہ انکی حیثیت بیگانہ افراد انسانی کی ہے۔

دیوان مہندس کا نسخہ

پورے دو برس ہوئے کہ ایک کرمفرما نے بنگلور سے مجھ کو اطلاع دی کہ انکے پاس مہندس نام ایک شاعر کا فارسی دیوان ہے اور دریافت کیا کہ کیا آپ اس شاعر سے واقف ہیں میں نے لکھا کہ آپ وہ نسخہ مجھے بھیجیں تو میں اپنی رائے ظاہر کروں۔ موصوف نے بڑی مہربانی فرماکر نسخہ مذکور میرے پاس بھیج دیا۔ میں نے اس شخص کی تلاش میں اکثر تذکرے دیکھے لیکن کہیں کچھ پتہ نہ چلا مگر خوش قسمتی سے خود اس دیوان میں شاعر کی ایک مثنوی مل گئی جس میں اس نے اپنے خاندان کا حال خود لکھا ہے۔ اسکو پڑھکر میری خوشی کی کوئی حد نہ رہی کہ یہ معماروں اور

۱؎ بعض تذکروں میں مہندس کے بیٹے ریاضی کے ضمن میں مہندس کا نام مذکور ہے۔

انجینیروں کی طرف سے پہلی آواز تھی جس میں تاج اور لال قلعہ کے بنانے کا دعویٰ کیا گیا تھا۔

اس مثنوی سے نہ صرف شاعر کی بلکہ شاعر کے باپ اور بھائیوں کے حالات بھی معلوم ہوئے اور اس کے دوسرے قصائد اور اشعار سے یہ بھی قیاس میں آیا کہ اس باکمال خاندان کی گمنامی کا سبب کیا ہو سکتا ہے۔

شاعر کا نام لطف اللہ اور تخلص مہندس ہے۔ مہندس کے معنی علم ہندسہ جاننے والے یعنی انجنیئر کے ہیں اور اس کا یہ دیوان چند قصیدوں، بعض مثنویوں اور بہت سی غزلوں پر مشتمل ہے اور یہ سب فارسی میں ہیں۔

دیوان کا کوئی دوسرا نسخہ مجھے نہیں ملا۔ زیر نظر نسخہ چھوٹی تقطیع کے ۹۶ صفحوں پر حاوی ہے دیوان کے حصۂ غزل کے خاتمہ "تاریخ اتمام ۶ شہر ذی الحجہ سنہ ۴۷ بوقت شب تحریر یافت" لکھا ہے۔ اور دیوان کے خاتمہ پر اس کتاب کی خریداری کی تاریخ لکھی ہے:-

"بتاریخ بستم رمضان المبارک سنہ ۱۱۵۷ھ دیوان مہندس خرید شد بسرکار
نواب ابراہیم خان بہادر"

اور کتاب کے اندر بعض تاریخی قطعات ہیں جن میں سب سے آخری تاریخ سنہ ۱۰۶۶ھ کی ہے اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر "۶ شہر ذی الحجہ سنہ ۴۷" ہجری سنہ ہے تو وہ یقیناً سنہ ۱۱۴۷ھ ہے ورنہ میرا شبہہ اس بنا پر کہ یہاں صرف سنہ ۴۷ لکھا ہے اور سیکڑہ نہیں لکھا ہے۔ یہ ہوتا ہے کہ یہ سنہ ہجری نہیں بلکہ سنہ ہے۔ اب سنہ ۱۰۶۶ کے بعد اور سنہ ۱۱۵۷ھ کے بیچ میں ایسا بادشاہ جس کو

سینتالیسواں سال نصیب ہوا ہو۔ اورنگ زیب عالمگیر کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہوسکتا۔ سنہ ۴۷ جلوس عالمگیری سنہ ۱۱۱۵ھ کے مطابق ہے۔

اس نسخہ کے صفحۂ اول پر عمدہ جلی نستعلیق سے " این کتاب سرکار) نواب بہادر...... " لکھا ہے۔ باقی حروف کٹ گئے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس نسخہ کی تقطیع پہلے بڑی تھی۔ جلد بندی کے وقت کچھ حاشیہ کاٹ دیا گیا ہے اسکے نیچے " این کتاب سرکار نواب ابراہیم خان بہادر ہزبر جنگ بکتاب خان (بکتاب خانہ؟) داخل شدہ" اس پر ایک مہر بھی تھی جو کسی نے مٹا دی ہے۔

شاعر کا نام لطف اللہ اور تخلص مہندس سن چکے اور وہ اپنے باپ کا نام احمد معمار بتاتا ہے۔ معمار احمد کا پیشہ ہے نام کا جزو نہیں۔ اسکے ایک قطعہ میں اسکا شاہی لقب " نادر العصر" مذکور ہے۔ اس شاعر کی بعض اور تحریریں بھی ہم کو دستیاب ہوئی ہیں جن میں وہ اپنے باپ کو لزوماً " استاد احمد لاہوری" لکھا کرتا ہے۔ اب ان ٹکڑوں کے جوڑنے سے احمد کا پورا نام و لقب " نادر العصر استاد احمد لاہوری" ثابت ہوتا ہے۔

نادر العصر استاد احمد لاہوری

اس نادر العصر کے حالات کا سراغ تاریخ کی کتابوں میں نہیں ملتا۔ البتہ قلعۂ دہلی کی تعمیر کے سلسلہ میں مورخین نے کہیں کہیں اسکا نام لیا ہے۔ محمد صالح کنبوہ نے عمل صالح میں جو شاہجہاں کی معاصر تاریخ ہے۔ شاہجہان آباد کے عمارات و قلعہ کی تعمیر کے بیان میں اسکا نام ان لفظوں میں لیا ہے۔

" از شب جمعہ بست و پنجم ذی حجہ نہم اردی بہشت سال دوازدہم

از جلوس اقدس مطابق یکہزار و چہل و ہشت[1] ہجری در زمان محمود و آوان مسعود استاد احمد و حامد[2] سر آمد معماران نادرہ کار بسرکاری عزت خان صوبہ دار آنجا و صاحب اہتمام این کار مطابق طرحے بدیع و نقشے تازہ کہ بہ ہیچ وجہ نظیر آں در شش جہت دنیا بہ نظر نظارگیان نیامدہ بود۔ رنگ ریختہ" (جلد ۴ ص۲۸ کلکتہ)

مدرسہ دیوبند کے کتب خانہ میں ایک قلمی کتاب تاریخ شاہجہاں کے نام سے ہے جس کا نمبر ۳۴۱۳۴ ہے۔ اس میں چند صفحے باب قلعہ شاہجہان آباد کے عنوان سے شاہجہان آباد اور شالامار باغ کی تعمیر کے حالات میں ہیں۔ اس سلسلہ میں حسب ذیل عبارت ہے۔

"بحکم اشرف بعد از پنج ساعت از شب جمعہ بیست و نہم ذی الحجہ مطابق اردی بہشت سال دوازدہم از جلوس اقدس شاہجہانی موافق سنہ ہزار و چہل و ہشت ہجری کہ مختار دانشوران انجم و افلاک بود استاد احمد و استاد حامد کہ معماران ماہر بودند در کار عمارت سر آمد بسرکاری غیرت خان برادر زادہ عبداللہ خان فیروز جنگ کہ ناظم صوبہ دہلی و اہتمام تاسیس عمارت مذکور باو مفوض شد مطابق طرحے کہ در پیشگاہ خلافت مقرر گشتہ بود"

---

[1] اس مطبوعہ نسخہ میں جس کی تصحیح ناظم آثار قدیمہ سرکار نظام مولوی غلام یزدانی صاحب نے کی ہے سنہ لفظوں میں چہل و ہشت کے بجائے "شاد و چہل" چھپ گیا ہے جو قابل تصحیح ہے۔ [2] اسی طرح یہ بھی تعجب انگیز ہے کہ اس مطبوعہ نسخہ میں حامد کا نام حذف ہو گیا بعد قلمی نسخے دیکھے سب میں احمد کے ساتھ حامد کا نام بھی ہے۔ کتب خانہ حبیب گنج کے نسخہ ۳۲/۳۷ کی عبارت یہ ہے: "موافق سنہ ۱۰۴۸ھ در زمان محمود و آوان مسعود استاد احمد و حامد سر آمد معماران نادرہ کار ...... مطابق طرحے تازہ و نقشے بدیع" ورق ۳۶

شاہجہانی و عالمگیری عہد کے امرا کے خطوط کا ایک ناقص اور بے نام و نشان پرانا مجموعہ[1] ہے۔ اس کے ایک خط میں نواب جعفر خاں کو سرائے باغ اور قلعہ حسن ابدال کی تعمیر کے متعلق کچھ لکھا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں استاد احمد معمار کا ذکر ان لفظوں میں آیا ہے:۔

> "...... بدرگاہ سلاطین سجدہ گاہ معروض داشتہ حقیقت حسن سلوک کارروائی محمد مومن مذکور، استاد احمد معمار کہ در طرّاحی و وقوف کار عمارت و معاملہ شناسی استعداد تمام درستی بکمال دارد"

عمدۃ الملک نواب جعفر خاں مختلف مناصب جلیلہ کے بعد ۱۱ سنہ جلوس شاہجہانی مطابق ۱۰۵۰ھ میں پنجاب کا صوبہ دار، ۲۱ سنہ جلوس شاہجہانی مطابق ۱۰۵۸ میں شاہجہاں کا وزیر اور ۱۰۷۳ھ میں عالمگیر کا وزیر ہوا، اور ۱۰۸۱ھ میں وفات پائی۔ یہ خط غالباً پنجاب کی صوبہ داری یا وزارت کے عہد میں اس کو لکھا گیا ہے کیونکہ جیسا آگے معلوم ہوگا کہ اس کے دو ہی برس بعد ۱۰۵۹ھ میں احمد وفات پا چکا تھا۔

سرسید مرحوم نے اپنی قابل قدر تصنیف آثار الصنادید میں استاد احمد اور حامد کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے کہ "یہ اپنے فن میں بے نظیر اور ہندسہ و ہیئت میں ثانی اقلیدس اور رشک ارشمیدس تھے"۔

بہرحال ان حوالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ استاد احمد عہد شاہجہانی میں

---

[1] یہ مجموعہ مولوی عبداللہ صاحب چغتائی (اسلامیہ کالج لاہور) کی ملک میں ہے۔

"سر آمد معماران نادرہ کار" تھا اور اس کو عمارتوں کا نقشہ اور خاکہ بنانے اور تعمیرات کے دوسرے کاموں میں کمال دستگاہ حاصل تھی۔

تاج محل کے حالات میں بعد انگریزی آگرہ میں ایک فارسی رسالہ خدا جانے کس نے لکھا ہے۔ اسکے قلمی نسخے عموماً ملتے ہیں۔ اس میں حالات کے ساتھ ساتھ عمارات کی تصویریں بھی ہیں شروع میں ممتاز محل کی وفات کی افسانہ نما کیفیت لکھی گئی ہے اور پھر اس میں تاج محل کی تعمیر کا ایک ایک خرچ اور اس کے ایک ایک پتھر کی قیمت، اور اس کے ایک ایک کاریگر کے نام مع تعین تنخواہ لکھے ہیں جو زیادہ تر سنی سنائی حکایتوں اور فرضی اعداد پر مشتمل معلوم ہوتا ہے۔ اس رسالہ میں کاریگروں میں سب سے پہلا نام "استاد عیسیٰ نادر العصر نقشہ نویس ساکن روم لکھا ہے۔ اس کتاب کے مختلف نسخے دیکھے اور سب میں ناموں کا کچھ نہ کچھ اختلاف پایا۔ اور سب سے عجیب بات یہ ہے کہ اس میں ہندو کاریگروں تک کو ساکن روم، بلخ و قندھار و سمرقند لکھا ہے۔ جامعہ علی گڈھ۔ حیدرآباد۔ بھوپال۔ ندوہ اور دار المصنفین کے کتب خانوں کے نسخوں میں اور ان کے علاوہ اور بھی اسکے جو نسخے نظر سے گذرے ان میں بھی یہ شتر گربگی موجود ہے۔ "استاد نادر العصر" تک تو نام صحیح ہے جو احمد معمار کا شاہی لقب تھا۔ مگر اس میں "عیسیٰ نقشہ نویس ساکن روم" کا نام اضافہ ہے یا یہ کہ استاد نادر العصر اور عیسیٰ ساکن روم دو نام ہیں جو ایک میں مل گئے ہیں۔ اس کتاب تاج میں امانت خاں شیرازی کے سوا جس کا ذکر تاریخوں اور تذکروں کے علاوہ خود تاج کے کتبوں میں ہے جن کاریگروں کی فہرست دی گئی ہیں اور جو تنخواہیں لکھی گئی

ہیں وہ تمام تر محتاج ثبوت ہیں لیکن تعجب ہے کہ تاج کے مورخین حال نے ان کو بے چون و چرا تسلیم کر لیا ہے۔ بہر حال تاج کے معماروں میں جو نام اب سب سے زیادہ اہم سند رکھتا ہے وہ یہی نادر العصر استاد احمد ہے۔ جس کا نام اس مضمون میں سب سے پہلی دفعہ پیش کیا جا رہا ہے۔

لطف اللہ کے بیان سے اسکے باپ احمد کے کچھ اور حالات بھی معلوم ہوتے ہیں مثلاً یہ کہ احمد معمار آج کل کا کوئی اناڑی راج نہ تھا بلکہ وہ باقاعدہ ہندسہ (انجینیرنگ) ہیئت اور ریاضیات کا بہت بڑا عالم تھا یہ یونانی ریاضیات فلکی کی سب سے اونچی کتاب مجسطی کا ماہر تھا اور اقلیدس میں خواجہ نصیر طوسی کی مشہور کتاب تحریر اقلیدس کا عالم تھا۔ لطف اللہ ایک مثنوی میں اپنے خاندانی حالات کا ذکر ان لفظوں میں کرتا ہے۔

شاہجہاں داور گیتی ستاں | روشنی دودۂ صاحب قراں
عرش بریں قبۂ خرگاہ اوست | رشک فلک سدۂ درگاہ اوست

احمد معمار کہ در فن خویش | صد قدم از اہل ہنر بود بیش
واقف تحریر و مقالات آں | آگہ اشکال و حوالات آں
حال کواکب شدہ معلوم او | سر مجسطی شدہ مفہوم او
از طرف داور گردوں جناب | "نادر عصر" آمدہ او را خطاب
بود عمارت گر آں بادشاہ | داشت حضرت فرخندہ راہ

ان اشعار سے نادر العصر احمد معمار شاہجہانی کے فضل و کمال کا پورا اظہار ہوتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ شاہجہاں کا مشہور عمارت گر تھا۔ اب اس کے بعد وہ

اشعار آتے ہیں جن میں اس عظیم الشان حقیقت کا انکشاف ہے جو اب تک مستور و مخفی تھی۔ یعنی یہ کہ یہی وہ ممتاز ہستی ہے جس نے ممتاز محل کا روضہ اور دہلی کا لال قلعہ تعمیر کیا۔ کہتا ہے:-

آگرہ چو شد مضرب رایات شاہ | بس کہ برو بود عنایات شاہ
کرد بحکم شہ کشور کشا | روضہ ممتاز محل را بنا
باز بحکم شہ انجم سپاہ | شاہجہاں داور گیتی پناہ
قلعۂ دہلی کہ ندارد نظیر | کرد بنا احمد روشن ضمیر

ان دو کے علاوہ عہد شاہجہانی کی دوسری عمارتیں بھی اس نے بنائی تھیں چنانچہ کہتا ہے:-

این دو عمارت کہ بیاں کردہ ام | در صفتش خامہ رواں کردہ ام
یک ہنر از گنج ہنرہائے اوست | یک گہر از کان گہرہائے اوست

اس کے بعد اس کی وفات کا ذکر کیا ہے۔

چوں نبود عالم فانی مقر | کرد سوئے عالم باقی سفر

اس مثنوی کے شروع میں شاہجہاں کا ذکر زمانۂ موجود میں کیا گیا ہے۔

عرش بریں قبہ خرگاہ اوست | رشک فلک سدّہ درگاہ اوست

اس سے ظاہر ہے کہ یہ مثنوی شاہجہاں کی زندگی میں لکھی گئی ہے اور اسی کے عہد میں تاج محل اور قلعۂ دہلی کی تعمیر کا یہ دعویٰ کیا گیا ہے۔ اس سے زیادہ ثبوت اور کیا درکار ہے۔

استاد حامد } استاد احمد کے ساتھ اسکے بھائی استاد حامد کا نام بھی ذکر کے

قابل ہے۔ یہ بھی معماری، ہندسہ اور دیگر علوم ریاضی میں سربرآوردہ تھا اور قلعہ کی تعمیر میں احمد کا شریک تھا۔ سرسید مرحوم اپنی قابل قدر کتاب آثار الصنادید میں قلعۂ شاہجہانی کے بیان میں لکھتے ہیں کہ:۔

> "اچھی سے اچھی ساعت دیکھ کر استاد حامد اور استاد احمد معماروں کے کہ اپنے فن میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے اور رشتہ ہیئت میں ثانی اقلیدس اور رشک ارزمیدس تھے اس قلعہ کی بنیاد رکھی" (طبع اول ص ۳ باب دوم)

طبع دوم میں یہی عبارت ان لفظوں میں ہے۔

> "استاد حامد اور استاد احمد جو اپنے فن میں یکتا تھے۔ اس قلعہ کو بنواتے تھے" (طبع دوم نامی پریس ص ۲۸)

دہلی کے بڑے بوڑھوں کی زبانی یہ روایت مجھ تک پہنچی ہے کہ جامع مسجد دہلی بھی اسی استاد حامد نے جس کا مشہور نام "استا حامد" ہے بنائی ہے اور اس کے بنانے میں اس کا دوسرا شریک "استا ہیرا" تھا۔

استاد حامد کا نام قلعہ دہلی کے بعد جو ۱۰۵۸ھ میں بنا، مانڈو کے ایک ہاتھی کے کتبے میں جس کی تاریخ ۱۰۷۰ھ ہے جیسا کہ آگے آئے گا لکھا ہوا ملتا ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اس زمانہ تک زندہ تھا۔ دہلی کے ایک قدیم معزز خاندان کے ایک واقف کار (سید مرتضیٰ علی صاحب ہیڈ کلرک دفتر کمانڈر انچیف دہلی) کی زبانی مجھے معلوم ہوا ہے کہ یہ استاد حامد اور استاد احمد دونوں بھائی تھے۔ استاد حامد کے نام سے "کوچہ استا[1]حامد" دہلی میں اب تک دریبہ اور جامع مسجد کے درمیان

---

[1] حال کے بغیر استاحامد

موجود ہے۔ اور انکی اولاد دہلی میں سکونت پذیر ہے۔ اور لاہور والے کہلاتے ہیں اور آج کل وہ سادہ کاری کا کام کرتے ہیں۔ الغرض یہی وہ دو کاریگر ہیں جنہوں نے قلعۂ معلّٰی اور اس کے حیرت انگیز عمارات دیوانِ عام و دیوانِ خاص غسلخانہ اور دوسرے محلات شاہی بنائے، اس تعمیر میں ایک تیسرا نام احمد کے بیٹے لطف اللہ کا شامل ہے جس کا ذکر آگے آئے گا۔

استاد احمد کی تاریخ وفات } اس دیوان کے آخر میں استاد احمد معمار کی وفات کی دو تاریخیں بھی درج ہیں۔

(۱)

در زمانِ سعید شاہجہاں | شاہ عالم پناہ جم مقدار
نادر العصر رفت گفت خرد | شد بفردوس احمد معمار

(۲)

آں نادرِ عصر زینت دہر | چوں رفت بسوئے ملک سرمد
تاریخ وفات او خرد گفت | محمود العاقبت شد احمد

ان دونوں قطعوں کے ہر چوتھے مصرعے سے ۱۰۵۹ھ کے اعداد نکلتے ہیں روضہ کی تعمیر ۱۰۵۰ھ میں یعنی احمد کی وفات سے نو برس پیشتر ختم ہو چکی تھی۔ اور دہلی کا قلعہ ۱۰۴۸ھ سے شروع ہو کر احمد کی وفات سے ایک سال پہلے ۱۰۵۸ھ میں تکمیل پایا تھا۔ ممکن ہے کہ استاد احمد روضہ کو ختم کرکے قلعہ کی تعمیر میں شامل ہوا ہو۔ یا روضہ کا اصلی تعمیری کام ختم کرکے شروع ہی سے قلعہ کی تعمیر میں مصروف ہوا ہو۔

استاد احمد نے ان تعمیری یادگاروں کے علاوہ اپنی تین جسمانی یادگاریں بھی

چھوڑیں اور انکو بھی تعمیر و ہندسہ و ریاضیات کی بہترین تعلیم دی۔ اور غالبًا اسکے پیش نظر یہ چیز تھی کہ ریاضیات کی اعلیٰ درجہ کی جو کتابیں اب تک صرف عربی زبان میں ہیں انکو فارسی میں منتقل کیا جائے۔ تاکہ وہ علوم فارسی دانوں کی دسترس میں آسکیں چنانچہ سنہ ۱۰۵۰ھ میں یعنی جس سال روضہ تمام ہوا ہے اور قلعہ دہلی کی تعمیر جاری تھی اس نے اپنے منجھلے بیٹے لطف اللہ کو عبدالرحمٰن صوفی کی صور الکواکب کے ترجمہ کا حکم دیا۔

احمد معمار کی تین اولادیں

لطف اللہ کی جس مثنوی کے کچھ ابتدائی اشعار اوپر نقل کیے گئے ہیں اس میں احمد معمار کی وفات کے ذکر کے بعد اسکے تین باکمال فرزندوں کے نام لیے گئے ہیں۔

بس سہ پسر ماند ز مرد سترگ — زاں سہ عطاء اللہ رشیدی بزرگ

دیوان کے اس نسخہ میں رشیدی کی جگہ کاتب نے "رشید" لکھا ہے مگر اسکی تصنیفات میں اسکے نام کے ساتھ "رشیدی" لکھا ملتا ہے اور جیسا کہ ظاہر ہے کہ اسی لفظ کو اسی طرح پڑھنے سے شعر صحیح ہو سکتا ہے۔ پھر عطاء اللہ کی تعریف میں کہتا ہے:-

نادر عصر خود و مشہور شہر | عالم و علامہ و دانائے دہر
مرد ہنر پرور و استاد فن | فاضل و دانشور و حبر زمن
مخزن علم آمدہ تالیف او | گنج ہنرہاست تصانیف او
نثر وی از آب رواں پاک تر | نظم خوشش غیرت سلک گہر

اس آخری شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ عطاء اللہ شاعر بھی تھا اور غالبًا

اس کے نام کے بعد "رشیدی" اسکا تخلص ہے۔ اس کے بعد شاعر یہ بیان کرتا ہے کہ اس نے تمام تر اپنے اسی بڑے بھائی سے تعلیم پائی ہے :۔

منکہ سخن پرور و دانش ورم | بندۂ آں جبر سخن پرورم
منکہ ربودم ز جہاں گوئے علم | از جہتش یافتہ ام بوئے علم
منکہ شدم آگہ سرِ نہاں | از دم او یافتہ ام قوتِ جاں

اس کے بعد لطف اللہ اپنے کو احمد معمار کا منجھلا بیٹا بتاتا ہے اور اپنی تعریف آپ کرتا ہے :۔

ثانی آں ہر سہ برادر منم | مہندسہ یک فن بود از صد فنم
گرچہ مہندس لقبم از شہ است | نام من ول شدہ لطف اللہ است

لطف اللہ اپنا نام اور مہندس شاہی خطاب بتاتا ہے اور یہی اسکا تخلص بھی ہے۔ اسکے بعد اپنے سب سے چھوٹے بھائی نور اللہ کا نام لیتا ہے۔

ثالث آں ہر سہ برادر بسال | آمدہ نور اللہ صاحب کمال

پھر کہتا ہے کہ ہم تینوں بھائی معمار اور انجنیئر ہیں :۔

ما ہمہ معمار و عمارت گریم | ما ہمہ استاد و سخن پروریم

اس کے بعد اپنے چھوٹے بھائی نور اللہ کی نظم ونثر کی تعریف کرتا ہے اور تعمیری مہارات فن کی بنا پر معمار کا موروثی لقب اسی کے لیئے مخصوص کرتا ہے۔

لیک بود قصر کلامش عجیب | زاں شدہ معمار مرا در لقب
گرچہ کم است سالش از سال من | بیش بود حالش از حال من
نثرش از نظم گہربار تر | نظم ز نثر آمدہ ہموار تر

دیدہ ز نور سخنش پر ضیا | طبع ز لطف سخنش پر صفا
گنج ہنر آمدہ در مشت او | ہفت قلم رائدہ سہ انگشت او
گرچہ منم بے سخن استاد فن | آں یکے ایں یک بود استاد من

اسی آخری شعر کا شاید یہ مطلب ہے کہ میں سب سے چھوٹے بھائی کا استاد ہوں اور بڑا بھائی میرا استاد ہے۔ اس مثنوی کا خاتمہ اس شعر پر ہوتا ہے۔

گرچہ مرا ہست مہندس لقب | شہرۂ آں ہر سہ برادر طلب

اس سے ثابت ہوا کہ ہندسہ اور عمارت گری کے فن میں یہ تینوں بھائی مہارت رکھتے تھے۔

الغرض احمد معمار کے ان تین باکمال بیٹوں کے نام بہ ترتیب یہ ہیں:۔

۱۔ عطاء اللہ رشیدی نادر العصر۔
۲۔ لطف اللہ مہندس
۳۔ نور اللہ معمار۔

ابھی حال میں (جولائی سنہ ۱۹۳۵ء میں) لطف اللہ کی ایک اور تصنیف "سحر حلال" کا پتہ چلا۔ یہ مختصر رسالہ مدرسہ محمدی مدراس کے کتب خانہ میں ہے جس کا نمبر ۲۶۸۶ ہے۔ اس کا دوسرا نسخہ بمبئی یونیورسٹی کے کتبخانہ میں ہے۔

اس رسالہ میں بھی لطف اللہ نے اپنے باپ اور اسکے تینوں بیٹوں کا حسب ذیل عبارت میں جو بصورت معمہ ہے تذکرہ کیا ہے۔

"احمد معمار والد ملوک دادار، ولد دار داول عطاء اللہ سلمہ اللہ
سالک مسالک علم...... عالم و عامل و علامہ عصر...... رسالہا

در علم اعداد مسطور کردہ .... و ولد دوم او سپہر سر ملوک
درگاہ کردگار و اسم ملوک حاصل دو کلمہ آمد۔ کلمہ دوم اللہ...... و کلمۂ اول
لام و طا در معادل عدد عطا...... و ولد سوم در مسالک علم روحانی
.... و اسم او ہم دو کلمہ دارد۔ کلمۂ دوم اللہ........
و کلمۂ اول معادل مطا در.........."

احمد معمار کے بڑے بیٹے کا نام عطاء اللہ تو صاف ہی ہے۔ منجھلے بیٹے کے جو مصنف کتاب ہے نام کا دوسرا جزو اللہ اور پہلا جزو لام اور طا اور ایک ایسا حرف ہے جس کا عدد لفظ "عطا" کے برابر ہے یعنی ۸۰ جو حرف ف کا عدد ہے یہ سب مل کر "لطف اللہ" ہوتا ہے۔

چھوٹے لڑکے کے نام کا بھی دوسرا جزو "اللہ" اور پہلا جزو "مطا" کا مساوی العدد اور ہے۔ مطا کا عدد ۵۰ ہے جو حرف ن کا معادل ہے۔ حرف (ن) کو واؤ اور ر سے ملانے سے پورا نام نور اللہ نکلتا ہے۔

ان تینوں باکمالوں کے نام مختلف عمارتوں کے کتبوں کے گوشوں میں لکھے ہوئے ملتے ہیں لیکن اگر دیوان مہندس کا یہ نسخہ ہاتھ نہ آتا تو اس خاندان کے ان مختلف افراد کے باہمی تعلق کا واقعہ دنیا سے پوشیدہ رہتا۔

نور اللہ معمار } یہ استاد احمد کا سب سے چھوٹا لڑکا اور لطف اللہ مہندس کا سب سے چھوٹا بھائی ہے۔ اس کی کوئی تصنیف اب تک نہیں ملی ہے مگر مہندس کے بیان سے ثابت ہے کہ وہ بھی معماری کے فن میں امتیاز رکھتا تھا۔ کہتا ہے۔

لیک بود قصر کلاش عجیب   زاں شدہ معمار مرا در لقب

سب بھائیوں میں سے معمار کا موروثی لقب اسی کو حاصل تھا۔ اسکے علاوہ وہ اپنے وقت کا بہت بڑا خطاط تھا اسی لیے مہندس نے اسکی نسبت کہا ہے:۔

گنج ہنر آمدہ در مشت او   ہفت قلم رانده سرانگشت او

یعنی وہ خط کے ساتوں قلموں میں ماہر تھا۔ مہندس کے بیان کی شہادت آج بھی دنیا میں موجود ہے۔ دلّی کی شاہجہانی جامع مسجد میں بیرونی محراب کی اوپر کی دیوار میں مسجد کے بنائے جانے کی جو تاریخ طویل فارسی نثر عبارت میں بخط نسخ تحریر ہے وہ اسی باکمال کی انگلیوں کا معجزہ ہے چنانچہ کتبہ کے آخر میں بسمت شمال ایک گوشہ میں کتبہ نور اللہ احمد لکھا ہوا ہے۔

عطاء اللہ رشیدی } عطاء اللہ رشیدی احمد معمار کا سب سے بڑا لڑکا اور لطف اللہ مہندس یعنی احمد کے منجھلے بیٹے کا استاد ہے۔ مہندس کے اشعار سے ثابت ہے کہ وہ بہت سی کتابوں کا مصنف بھی تھا۔ کہتا ہے۔

مخزن علم آمده تالیف او   گنج ہنرہاست تصانیف او

سحر حلال میں بھی اسکے متعلق حسب ذیل الفاظ ہیں:۔

"سالک مسالک علم عالم و عامل و علامۂ عصر رسالہا در علم اعداد مسطور کردہ"

اس کی ان متعدد تصنیفات میں سے ہم کو تین کا علم ہے اور یہ تینوں علم اعداد یعنی حساب ہی میں ہیں۔ ان میں سے ایک کا نام بیج گنت اور دوسرے کا نام خلاصۂ راز ہے۔ بیج گنت سنسکرت کا لفظ "ویجا گنیتا" ہے۔ جس کے معنی

علم جبر و مقابلہ کے ہیں۔ یہ سنسکرت میں بھاسکر چاریہ کی تصنیف ہے۔ عطاء اللہ نے فارسی میں اسکا ترجمہ کیا۔ اسکے نسخے برٹش میوزیم، میونک یونیورسٹی اور ندوۃ العلما لکھنؤ کی لائبریریوں اور کتبخانۂ سعیدیہ حیدرآباد میں ہیں۔ اس میں مصنف اپنا نام "عطاء اللہ رشیدی بن احمد نادر" بتاتا ہے۔ رسالہ کا آغاز اس شعر سے ہے:-

اوّل ز ستایش الٰہی گوییم پس نعت رسول اوکماہی گوییم

یہ شعر میرے خیال میں فیضی کے جواب میں ہے۔ فیضی نے سنسکرت کی حساب کی مشہور کتاب لیلاوتی کا جو ترجمہ اکبر کے زمانہ میں کیا ہے اسکے آغاز میں یہ شعر لکھا ہے جو سراسر خوشامد ہے۔

اول ز ثنائے بادشاہی گوییم وانگہ ز ستائش الٰہی گوییم

رشیدی گویا اسکے جواب میں کہتا ہے:-

اوّل ز ستائش الٰہی گوییم پس نعت رسول اوکماہی گوییم

ندوۃ العلما لکھنؤ اور کتب خانہ سعیدیہ حیدرآباد کے نسخے میری نظر سے گذرے ہیں۔ دیباچہ میں ہے:-

"اما بعد می گوید بندہ محتاج بخداوند قادر عطاء اللہ رشیدی ابن احمد نادر کہ بہ توفیق الٰہی در سنہ اربع و اربعین ۱۰۴۴ھ) والف ہجری مطابق ہشتم سال جلوس حضرت صاحبقرانی برادرنگ سلطنت و جہانبانی کتاب جبر و مقابلہ ہندسی موسوم بہ بیج گنت تصنیف بھاسکر اچارج صاحب لیلاوتی را کہ در علم حساب کشافی است بحقائق رائقہ و مفتاحے است

> بدقائق فائقہ محتویست بر فوائد بلند و مطالب ارجمند کہ در لیلاوتی مذکور نیست و در ہیچ نسخہ فارسی و عربی مسطور نہ، از زبان ہندی بفارسی آوردم و دیباچہ کتاب را بکتابہ دعائے دولت حضرت خاقانی، وارث ملک سلیمانی، مرتقی مدارج عز و جلال .... ابوالمظفر شہاب الدین محمد صاحب قران ثانی، شاہجہان نامی بادشاہ غازی ...."

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب جو لیلاوتی کے مصنف بھاسکر اچاریہ کی دوسری کتاب کا ترجمہ ہے شاہجہاں کے آٹھویں سال جلوس ۱۰۴۴ھ میں مکمل ہوئی ہے۔ سعیدیہ کا نسخہ محمد شاہ کے زمانہ میں ۱۱۴۵ھ میں منقول ہوا ہے۔ ندوہ کے نسخہ کا نمبر کتبخانہ میں نمبر ۵۶ ریاضی ہے۔

برٹش میوزیم اور میونک یونیورسٹی کی لائبریریوں کی فہرستوں میں اس نسخہ کا مختصر حال درج ہے۔ کتبخانہ آصفیہ حیدرآباد دکن میں بدرالحساب کے نام سے بیج گنت کا ایک اور ترجمہ موجود ہے۔ جو ۱۰۷۵ھ میں برہان پور میں کیا گیا ہے۔

عطاء اللہ رشیدی کی دوسری کتاب خلاصہ راز کا نسخہ برٹش میوزیم کے کتبخانہ میں ہے۔ اس میں اس نے اپنا نام یہ لکھا ہے "عطاء اللہ بن استاد احمد معمار" اسکا آغاز اس شعر سے ہے:-

شکر بیحد بواحد ازلی   حمد بےحد بفرد لم یزلی

رسالہ کا موضوع حساب، مساحت اور جبر و مقابلہ ہے۔ زبان فارسی نثر ہے اور رسالہ کی تقسیم دس بابوں پر ہے۔ رسالہ کے دیباچہ میں شاہجہاں بادشاہ اور شاہزادہ دارا شکوہ کی ستائش ہے اور رسالہ شاہزادہ کے نام سے معنون ہے

داراشکوہ سنہ ۱۰۶۷ھ میں قتل ہوا ہے۔ اس سے یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ رسالہ اس سے پہلے تالیف پا چکا تھا۔

اس کی تیسری کتاب ”خزینۃ الاعداد“ ہے جو علم حساب، الجبرا اور عملی اقلیدس میں ہے۔ مقدمہ میں اس نے بیان کیا ہے کہ اس نے یہ کتاب مبتدیوں اور سرکاری مالی دفتروں کے ملازموں، تاجروں اور مذہبی عالموں کے لیے لکھی ہے۔ اس رسالہ کا آغاز ان لفظوں سے ہوا ہے:۔

الحمد للہ الذی جعل الشمس ضیاء والقمر نورا وقدرہ منازل....

مولف این رسالہ و مترجم این مقالہ المفتقر الی رحمۃ اللہ الفقیر الحقیر عطاء اللہ“

رسالہ میں ایک مقدمہ، دو مفتاح، دس باب، ایک کشکول اور ایک خاتمہ ہے۔ کتاب کا نام (خزینۃ) تاریخی ہے جس سے ۱۰۶۷ھ نکلتا ہے جیسا کہ اس شعر سے معلوم ہوتا ہے:۔

ز تاریخ اتمامش آگہ شوی
چوں نامشے آری تو اندر حساب

یہ نادر نسخہ بمبئی یونیورسٹی کے کتب خانہ میں ہے جس کا نمبر ۷۰۱ ہے[1]

---

[1] فہرست کتب عربی، فارسی اور اردو کتب خانہ جامعہ بمبئی مرتبہ شیخ عبدالقادر۔ فاضل مرتب نے عطاء اللہ بن احمد کو اس رسالہ کا مصنف ظاہر کرنے کے باوجود اس کا سال تصنیف ”خزینۃ الاعداد“ کے دونوں جزوں کے اعداد کو گن کر سنہ ۱۱۷۸ھ ظاہر کیا ہے۔ جو ظاہر ہے کہ صحیح نہیں کیونکہ یہ تاریخ مصنف کی زندگی کے بہت بعد ہے۔ لیکن اگر نام کے دونوں جزوں کے اعداد لیے جائیں اور سنہ ۱۱۷۸ھ صحیح ہو تو پھر یہ کسی دوسرے عطاء اللہ کا رسالہ سمجھا جائے گا۔

عطاء اللہ رشیدی جیسا کہ اس کے بھائی لطف اللہ نے اپنی مثنوی میں لکھا ہے شاعر بھی تھا اور رشیدی تخلص کرتا تھا۔ مگر اسکا کوئی شعر ہم تک نہیں پہنچا ہے بجز اسکے کہ لطف اللہ کے ہاتھ کی ایک کتاب صور صافی کا جو اصل نسخہ مسلم یونیورسٹی لائبریری میں ہے اسکے آخر میں ایک صفحہ پر عطاء اللہ کے قلم کی ایک مشق ہے جس میں آفتاب اور سہا کے تناسب سے کچھ فقرے لکھے ہیں اور آخر میں یہ شعر درج ہے۔

عطاء اللہ کہ گر نامش نہی ہیچ   ز غیرت ہیچ افتد در خم و پیچ

عطاء اللہ کے یہ تو علمی کارنامے ہیں لیکن اسکا ایک عملی کارنامہ بھی دنیا میں موجود ہے اور وہ شہنشاہ عالمگیر اورنگ زیب کی محبوب بیوی ملکہ رابعہ دورانی کا مقبرہ ہے جو اورنگ آباد دکن میں واقع ہے۔ یہ مقبرہ تمامتر روضہ تاج محل کی نقل ہے۔ خیال ہوتا ہے کہ چونکہ اسکے باپ احمد معمار نے تاج کا روضہ بنایا تھا اس لیے قرین قیاس سمجھا گیا کہ اسکا خلف الرشید اس نقش اول کا بہترین نقش ثانی تیار کر سکتا ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ آگرہ میں جو سامان تعمیر شاہجہاں کے عہد میں مہیا ہو سکتا تھا وہ اورنگ آباد دکن میں عالمگیر کے عہد میں میسر نہیں آ سکتا تھا۔ پتھر اور اسٹیٹ کے فرق کے علاوہ جو نزاکت لطافت اور تناسب روضہ کی خصوصیات ہیں انکی نقل اتاری نہ جا سکی۔

رابعہ دورانی کے مقبرہ کے صدر دروازہ پر پیتل کا پتر چڑھا ہوا ہے۔ اس پہ ایک طرف یہ عبارت لکھی ہے:۔

"این روضہ منورہ در معماری عطاء اللہ بعمل
ہیبت رائے طیار شدہ ۱۰۷۱"

(۲)

لطف اللہ مہندس احمد معمار کے دوسرے بیٹے لطف اللہ مہندس کی اس وقت متعدد یادگاریں دنیا میں باقی ہیں اور کہنا چاہیئے کہ یہی وہ سپوت ہے جس کے ذریعہ اس کے باپ کا نام دنیا کو معلوم ہو سکا۔ سندیلوی نے اپنے تذکرۂ مخزن الغرائب میں جو ۱۲۱۸ھ کی تصنیف ہے مہندس کے بیٹے امام الدین ریاضی کے تحت میں مہندس کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے:۔

"مولوی لطف اللہ مہندس بودہ است، ایشاں ہم بگفتن اشعا میل تام داشتند و مہندس تخلص می کردند، در علم ریاضی مثل ایں ہر دو پدر و پسر دریلا د ہند نبودند" (نسخہ قلمی دار المصنفین ص۱۵۳)

اور سفینۂ خوشگو میں ہے:۔

خلف ملا لطف اللہ مہندس تخلص لاہوریست کہ قلعہ ارک دار الخلافۃ شاہجہان آباد بتجویز و صوابدید او بنا یافتہ"

یہی فقرہ حسین قلی خاں کے نشتر عشق میں ہے اسکی سات تصنیفات کے نام ہم کو معلوم ہو سکے ہیں جن کے نسخے اس وقت ہندوستان اور یورپ کے کتب خانوں میں موجود ہیں لیکن ان تصانیف کے علاوہ اسکی عجیب و غریب یادگار اسکا ایک آہنی کتبہ ہے جو سلاطین مالوہ کے پایہ تخت مانڈو میں وہاں کے مشہور بادشاہ ہوشنگ غوری (۸۰۸ھ ۸۳۸ھ) کے مقبرہ کے دروازے کے داہنے ہاتھ پر لگا ہوا ہے یہ ۷ انچ لمبا اور ۴½ انچ چوڑا کتبہ ہے جس میں بخط خفی

حسب ذیل عبارت چار سطروں میں منقوش ہے :۔

۱۔ بتاریخ نہم ربیع الثانی سنہ ہزار و ہفتاد ہجری
۲۔ فقیر حقیر لطف اللہ مہندس ابن استاد احمد معمار شاہجہانی ۔
۳۔ و خواجہ جادو رائے و استاد شیورام و استاد حامد۔
۴۔ بجہت زیارت آمدہ بود۔

اثریات ہند کے ماہر جناب ظفر حسن صاحب بی اے (محکمۂ آثار قدیمہ ہند) نے مانڈو کے کتبات پر انگریزی میں جو مقالہ لکھا ہے اس میں یہ کتبہ سترھویں پلیٹ پر چھاپ دیا ہے اور وہ اس وقت میرے سامنے ہے۔

غالباً ان معمار سیاحوں کے لیے اس کتبہ کے یہاں لگانے کا محرک یہ امر ہوا ہے کہ یہاں اکبر بادشاہ نے اپنے سفر و گذر کی تاریخیں ثبت کرائی ہیں۔ انہیں کو دیکھ کر ان معماروں نے بھی اپنا یادگاری کتبہ لگا دیا ہے۔

اس کتبہ سے متعدد باتوں پر روشنی پڑتی ہے :۔

۱۔ اس عہد کے استادان تعمیر دوسری عمارتوں کو بھی فن کی حیثیت سے دیکھنے کے لیے جایا کرتے تھے۔

۲۔ ہندو مسلمان باکمالوں میں فن کی یکجہتی کا رشتہ خاصہ مستحکم اور مضبوط تھا۔

۳۔ ہندو شاہی معماروں کے ناموں کے ساتھ خواجہ اور استاد کا بولنا کیسا عام تھا خواجہ جادو رائے اور استاد شیورام کیسے کیسے عزت کے الفاظ تھے۔

۴۔ لطف اللہ مہندس گو شاعر و مصنف تھا تاہم اس میں اسکے موروثی فن تعمیر کا ذوق اتنا تھا کہ وہ دوسرے معماروں کے ساتھ کسی عمارت کے دیکھنے

کے لیے سفر کی زحمت گوارا کر سکتا تھا۔

لطف اللہ کی جن سات کتابوں کے نام ہم کو ملے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ صور صوفی۔

۲۔ رسالۂ خواص اعداد۔

۳۔ شرح خلاصۃ الحساب۔

۴۔ منتخب الحساب۔

۵۔ تذکرۂ آسمان سخن۔

۶۔ دیوان مہندس۔

۷۔ سحر حلال۔

پہلی کتاب ہیئت میں اور بعد کے تین رسالے علم حساب میں ہیں اور دوسری کو چھوڑ کر وہ عربی میں ہے بقیہ چھ کی زبان فارسی ہے۔ جن میں سے تین اول الذکر اور آخری نثر میں ہیں اور چوتھی اور پانچویں دو کتابیں نظم میں۔ اب ذیل میں ہم ہر ایک تصنیف پر مختصر تبصرہ کرتے ہیں۔

۱۔ صور صوفی مشہور مسلمان ہیئت داں عبد الرحمن الصوفی المتوفی سنہ ۳۷۶ھ نے ستاروں کے اشکال و صور پر جو بلند پایہ تصنیف صور الکواکب کے نام سے لکھی تھی لطف اللہ نے ۱۰۵۰ھ میں اپنے باپ احمد معمار کے حکم سے اسکا فارسی میں ترجمہ کیا۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ اسکی عمر کا پہلا کام ہے کہ اس کا دیباچہ کسی بادشاہ کے نام کے بجائے خود اسکے باپ کے نام نامی سے مزین ہے۔ اور اس میں یہ نوجوان مصنف یہ ظاہر کرتا ہے کہ اسکی محنت کا بہترین صلہ یہی کہ

اس کا باپ اسکے کام کو دیکھکر خوش ہو۔ اس کتاب کا اصل مسودہ جو خود لطف اللہ کے ہاتھ کا لکھا ہے مسلم یونیورسٹی لائبریری (نمبر ۳۱ فارسی علوم) میں موجود ہے۔ دیباچہ کی عبارت یہ ہے:-

"درخشندہ ترین کواکبی کہ از مشرق طبع بر فلک ظہور آمد حمد سبحانی و
شکر مخترعی .... اما بعد چنین گوید محتاج الی اللہ القادر
الغفار لطف اللہ بن احمد النادر المعمار، مد اللہ ظلہ علی رؤس الاولاد
بحرمۃ النبی و آلہ الامجاد کہ چون اشارۂ آنحضرت بسوئے این فقیر حقیر
شد کہ کتاب عمدۃ الاسلام قدوۃ الانام مولانا عبد الرحمن بن صوفی
افاض اللہ علیہ شآبیب الغفران و اسکنہ فرادیس الجنان کہ در معرفت
نجوم ثابتہ کتابیست متعدد رسالہ ایست کافیہ بجہت عموم فائدہ کلام
و سہولت فہم مرام بعبارت فارسی سادہ ترجمہ کردہ آید تا بر ترغیب
خاطر فارسی خوانان حقیقت طلب باعث تر شود کمر اطاعت بر میان
جان بستہ دست را بنوشتن نگارین کرد۔ امید کہ بایں سعیہ مرضیہ من
در عقبی ماجور و ترجمۂ من در دنیا مقبول باشد۔ و طالبان این فن ازین
ترجمہ مستفید شوند چنانکہ از اصل ایں۔ و اگر خطائے باشد اصلاح
فرمایند الحمد للہ و المنۃ کہ در فرصتے اندک ہمگی بوجہ احسن و شائستہ میسر شد
در سنت یکہزار و پنجاہ ہجری اتمام پذیرفت۔ اما احسن و شائستہ تر وقتی کہ
از نظر مبارک والد بزرگوار من بگذرد و بعین عنایت و چشم کرمت
نگاہ کنند و قبول فرمایند"

خاتمہ کی عبارت:۔

"ہزار در ہزار حمد ایزد دادار کہ ترجمہ کتاب صور صوفی حسب الحکم
قبلۂ صورت و معنی کعبۂ ظاہر و باطن، خداوند حقیقت و مجاز، الیوم
المسمی باحمد المخاطب بنادر العصر سلمہ اللہ تعالیٰ من بلیات الزمان و
آفات الدہر باآخر رسید و اتمام پذیرفت"

"بقلم شکستہ رقم لطف اللہ کہ مؤلف این رسالہ و مترجم این مقالہ است
کتاب باتمام رسید۔ الحمد للہ علی نعمائہ والصلوٰۃ علی انبیائہ
لاسیما علی محمد و آلہ و اصحابہ اجمعین واغفر لی و
لوالدی بحرمتہم یا ارحم الراحمین۔"

کتاب کے آخری صفحہ پر آفتاب اور سہا کی مناسبت سے کچھ فقرے مشق کیئے گئے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خاندانی یادگار کے طور پر اس گھر کے ارکان نے محفوظ رکھا تھا۔ یہ مشق میرے خیال میں اسکے بھائی عطاء اللہ کے قلم سے ہے کہ آخر میں ایک شعر میں جو اوپر عطاء اللہ کے حال میں نقل کیا جا چکا ہے، اسکا نام لکھا ہے۔

۲۔ **رسالہ خواص اعداد** } یہ فارسی میں علم حساب پر سات صفحوں کا رسالہ ہے اور چار مقالوں پر منقسم ہے۔ اس میں اعداد کے خواص اور قیمتوں پر بحث کی گئی ہے۔ اسکا ایک نسخہ برٹش میوزیم کے کتبخانہ میں ایک مجموعہ کے اندر ہے جس میں دو رسالے لطف اللہ کے ہیں۔ اور تیسرا عطاء اللہ کی وہی خلاصۂ راز ہے جسکا ذکر اوپر آ چکا (ع ۲۴۳/۳ ۱۶۴)۔ اس کا آغاز

یہ ہے:-

"الحمد للہ .... می گوید فقیر لطف اللہ متخلص بہ مہندس"

اسکا دوسرا نسخہ کتبخانۂ سعیدیہ حیدرآباد دکن میں نظر سے گذرا ہے۔ نسخہ جدید الخط ہے سنہ ۱۲۷۵ھ میں نقل ہوا ہے۔ آغاز یہ ہے:-

"الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ علی رسولہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین۔ امابعد میگوید فقیر لطف اللہ متخلص بہ مہندس ابن استاد احمد لاہوری کہ این رسالہ ایست مختصر در علم ارسماطیقی (ارثماطیقی) یعنی [illegible] بدان اسعدک اللہ فی الدارین۔

اس رسالہ کا کوئی خاص نام نہیں معلوم ہوتا کیونکہ [illegible] میں اس کا نام رسالہ ارسماطیقی مندرج ہے اور اسی نام سے یہ رسالہ خاندان دیوان مدراس کے کتبخانہ میں بخط مولوی محمد غوث شرف الملک موجود ہے۔

۳۔ **شرح خلاصۃ الحساب** } علم حساب میں بہاء الدین محمد بن حسین آملی المتوفی ۱۰۳۱ھ کی مشہور عربی تصنیف خلاصۃ الحساب کی کی مشرح شرح ہے۔ اسکی شرحیں متعدد علماء نے لکھی ہیں جن میں خود اسکے معاصر عصمت اللہ سہارنپوری کی عربی شرح جو ۱۰۸۰ھ میں لکھی گئی ہے بہت مفصل ہے اور چھپ بھی چکی ہے۔ اور جسکا نام انوار خلاصۃ الحساب ہے۔ دوسری یہ لطف اللہ مہندس کی ہے۔ اسکا ایک نسخہ انڈیا آفس کے کتب خانہ میں ہے (نمبر [illegible] مخطوطات عربی) اس میں مصنف کا نام لطف اللہ المتخلص بالمہندس بن الاستاذ احمد المعمار لکھا ہے اور اس کا آغاز ان لفظوں سے ہے۔

الحمد للّٰہ الواحد الفرد الصمد۔ یہ نسخہ ایک خاص حیثیت سے ممتاز ہے جسکا ذکر آگے آئے گا۔ اس کتاب کا دوسرا نسخہ ہندوستان میں رامپور کے کتبخانہ میں ہے (نمبر ۴۵ ریاضی) اس نسخہ کے صفحات کی تعداد ایک سو بیس ہے۔

۴۔ منتخب } یہ بہاء الدین آملی کی مذکورہ بالا تصنیف خلاصۃ الحساب کا فارسی ترجمہ اور خلاصہ ہے۔ انگلستان اور ہندوستان میں اسکے متعدد نسخے ہیں۔ دو نسخے انڈیا آفس کے کتبخانہ میں ہیں تیسرا[1] برٹش میوزیم لائبریری میں، چوتھا کتبخانہ آصفیہ حیدرآباد دکن میں۔ پانچواں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں چھٹا جامعہ ملیہ دہلی میں۔ اور ساتواں کتبخانہ دیوان مدراس میں بخط سید ابوالقاسم مکتوبہ سنہ ۱۲۱۸ھ ہے۔ اس رسالہ کا منتخب نام تاریخی ہے۔ اس سے سنہ ۱۲۱۸ کی تاریخ نکلتی ہے۔ مقدمہ میں لکھا ہے کہ یہ کتاب خاندان وزارت کے رکن رکین میر محمد سعید بن میر محمد یحییٰ کی فرمائش سے لکھی گئی ہے۔

اسکا آغاز اور دیباچہ حسب ذیل ہے:۔

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ
محمد وآلہ واصحابہ اجمعین۔ اما بعد می گوید فقیر لطف اللّٰہ
مہندس ابن استاد احمد معمار لاہوری غفر اللّٰہ لہ ولوالدیہ واحسن الیہما
والیہ کہ کتاب حساب را کہ تصنیف است از محقق وتحریر مدقق شیخ

---

[1] برٹش میوزیم کے نسخہ کا نمبر ۱۶۷۴۴ اور انڈیا آفس کے نسخہ کا نمبر ۲۲۵۳ اور نمبر ۲۲۵۴ اور آصفیہ باب ریاضیات فارسی کا نمبر ۱۱ ہے۔

بہاء محمد بن حسین عاملی (آملی) رحمۃ اللہ علیہ مشتمل بر قواعد شریفہ و فوائد لطیفہ باشارات خلاصۂ دودمان سیادت منتخب خاندان وزارت میر محمد سعید بن میر محمد یحییٰ ادام اللہ اقبالہ و ضاعف اجلالہ ترجمہ کردم کہ چوں آں نسخہ خلاصہ نام داشت ایں نسخہ را منتخب نہادم ...... نام تاریخ تالیف ایں رسالہ است و ایں رسالہ بنا بر ترتیب کتاب مرتب است بر مقدمہ و ابواب۔

آخر میں ایک حسابی مسئلہ کا حل نظم میں ہے جس کا خاتمہ ان دو شعروں پر ہے ؎

مسئلہ ہشتم فقیر لطف اللہ　　بمہندس شہیر در افواہ
خاکپائے ہنروران کبار　　پور استاد احمد معمار

انڈیا آفس لائبریری کا نسخہ نمبری ۲۲۵۴/۵ ۲۳ شعبان سنہ ۱۱۴۵ھ کا لکھا ہوا ہے اور رشید آبادی نسخہ کی تاریخ سنہ ۱۲۴۲ھ ہے اور کتبخانہ میں اسکا نمبر ۲۱۱ ریاضیات فارسی ہے مسلم یونیورسٹی کا نسخہ سبحان اللہ خاں لائبریری کا ہے۔ اسکا نمبر ۵۱۱/۳ ہے اور وہاں اسکا نام ترجمۂ خلاصۃ الحساب ہے اور کتابت کا سال سنہ ۱۸۳۹ء ہے۔ جامعہ ملیہ کے نسخہ کا نمبر ۱۹ سلسلہ مخطوطات ہے اور تاریخ سے خالی ہے۔

۵۔ آسمان سخن } دولت شاہ سمرقندی کا فارسی شعرا کا تذکرہ جو سنہ ۸۹۲ھ میں تالیف پایا ہے۔ باایں ہمہ اغلاط دلچسپ ضرور ہے اور اسی لئے اہل سخن کی محفلوں میں اسکا تذکرہ رہا کیا ہے۔ یہ کتاب فارسی نثر میں ہے اور سات طبقوں پر منقسم ہے۔ اکبر کے زمانہ میں فائضی کرانی نام ایک شاعر نے اسکو نظم کر ڈالا اور سات طبقوں کے بجائے اسکو دس طبقوں میں مکمل کیا۔ لطف اللہ مہندس نے فائضی کے نسخہ میں دو اور طبقوں کا اضافہ کرکے اسکو ۱۲ طبقوں میں پورا کر دیا

اور بارہ برجونکی مناسبت سے اسکا نام "آسمان سخن" رکھا۔

یہ تمام واقعات لطف اللہ مہندس نے کتاب کے دیباچہ میں ذکر کیے ہیں۔ اسکا نسخہ شاہ اودھ کے کتبخانہ میں تھا۔ ڈاکٹر اسپرنگر نے اس کتب خانہ کی فہرست میں صفحہ ۱۱۶ پر اس کتاب کا ذکر کیا ہے۔ اب کہیں اور کتبخانہ میں اس کا نشان نہیں ملتا۔ معلوم نہیں گردش چرخ نے اس آسمان سخن کو کس خاک میں ملا دیا۔ لطف اللہ مہندس کے اس اضافہ میں کل ۲۵۰ بیتیں تھیں یعنی ایک ایک بیت میں ایک ایک شاعر کا بیان تھا۔ اسکا پہلا شعر یہ تھا۔

نخست شکر خدائے کہ آسمان سخن بیافرید محیط نہ آسمان کہن

فہرست مذکور میں ڈاکٹر اسپرنگر نے اسکے بارہویں طبقہ کے ۱۳ شعر نقل کیے ہیں ان شعروں میں شاہجہانی شعرا کے نام نظم کیے گئے ہیں۔ اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ لطف اللہ نے دور اکبری کے بعد جو طبقے بڑھائے تھے ان میں سے پہلے میں جہانگیری عہد کے اور دوسرے میں شاہجہاں کے زمانہ کے سخنوروں کے نام ہونگے۔ وہ ۱۳ شعر یہ ہیں:-

وحید دہر امانی ابن مہابت خان	کہ بیگمان زبانست شہرۂ دوراں
دگر یگانہ ظفر خان تخلصش احسن	ربودہ گوئے سخن از سخنوراں زمن
دگر وحید زمن آشنا عنایت خان	بود بحسن سخن آشنا عنایت خاں
دگر وحید زمن شادمان غم پرور	بیان شادی و غم در کلام او مضمر
دگر سخنور کشمیر محسن فانی است	بقائے نام وی از دولت سخندانی
سپہر سیادت یگانہ میر عماد	کہ بود در غزل و مدح و مثنوی استاد

لبیب عصر محمد حسین آشوب است　　سخنوری کہ سخنہاش جملہ مرغوب است
دگر حیات زبان است طالبائے کلیم　　کہ شعر او ید بیضا است نزد طبع سلیم
دگر فرید جہاں قدسی محمد جان　　بعہد شاہجہاں گو ربودہ از اقران
الٰہی ہمدانی است در سخن استاد　　سخنورے است کہ داد سخنوری می داد
لبیب از مناقبی نخواند ہیچ کتاب　　ز فیض حق شدہ مفتوح بر رخش صد باب
دگر وحید زمن باقیا ترانہ او　　خوش است ہمچو غزلہائے عاشقانہ او
فصیح از منہ شفا کہ چون غزل میگفت　　چو عندلیب غزلخوان در و گہر می سفت

نویں شعر سے ظاہر ہوتا ہے کہ لطف اللہ نے یہ داد سخن عہد شاہجہانی (۱۰۶۸ھ) کے بعد دی ہے۔

۲۔ دیوان مہندس } یہ پورا دیوان چھوٹی تقطیع کے چھیانوے صفحوں میں ہے سب سے پہلے دیوان کے شروع میں دس صفحوں میں چار قصیدے ہیں پہلا نعت میں ہے دوسرا دارا شکوہ کی اور تیسرا شاید دارا شکوہ کے بیٹے سلیمان کی مدح میں ہے۔ اور چوتھا کسی معشوق کا سراپا ہے اسکے بعد ہی بسم اللہ سے غزلیں شروع ہوتی ہیں جو حروف تہجی پر مرتب ہیں یہ گیارہویں صفحے سے شروع ہو کر صفحہ ۷۸ پر تمام ہوتی ہیں۔ پھر نئی بسم اللہ سے وہ مثنوی شروع ہوتی ہے جس میں اسنے اپنے خاندان کا احوال لکھا ہے۔ پھر ایک دو مختصر مثنویاں اور چند قطعے ہیں جن میں سے دو چار قطعے تاریخی ہیں پہلے نعتیہ قصیدہ کی تشبیب کا یہ شعر نذر ہے۔

خسرو مہر چو بنشست بر اورنگ حمل　　رستم روز در اقلیم شب افگند خلل

رومی روز برافراخته رایت چو صبا
زنگی شب سپر انداخت بهنگام جدل
کیمیا ساز شده است گر از عامل روز
مس شب را بزر روز چرا کرده بدل
روز افزوده و شب کاسته ناشی که مهر
کرده آئینه ایام و لیالی صیقل
سنگ از تربیت مهر شود لعل و کنون
اخگر از تربیتش لعل شود در منقل
وقت آن است که در قافله از فیض بها
آب زمزم شود اکنون بمی ناب بدل
وقت آنست که واعظ چو نهد مجلس وعظ
صوت شیشه شود نغمهٔ واعظ بقل

اس قصیدہ کے آخر میں شاعر نے اپنا اور اپنے باپ کا نام اور اپنے مشاغل درس و تدریس کا ذکر کیا ہے

دل دانای مرا فخر بعلم است نه بفضل
جاهل است آنکه بنازد بحلی و بحلل
باش لطف الله احمد چه کنی فخر بعلم
جهل ازین علم تو بهتر که نیاید بعمل
عمر در درس بسر بردی و در آخر کار
هیچ حاصل نشد از علم جز بحث و جدل

دارا شکوہ کے مدحیہ قصیدہ میں اپنی مدح خود ان شعروں میں کرتا ہے :-

مهندسم که کنم صورت فلک تصویر
کشم بروی زمین گر خطوط پرکاری
چنان بلند نهادم اساس قصر خرد
که بر سپهر زنم طعنه گلو فشاری
چنان منیر شود شمسهٔ عمارت من
که نور مهر بود نزد نور او تاری
دمی که من بعمارت گری شوم مشغول
ملک مصالح کار آورد بسر باری
بدستیاری لطف شه بلند اقبال
بلند پایه ز من گشته قدر معماری
سپهر مرتبه دارا شکوه دریا دل
که همچو ابر کفش می کند گهرباری
بعهد دولت تو راه های کوهستان
ز فرق خویش نهاده کلاه جباری

بیک نگاہ کہ کردی بسینۂ کوہستاں   گرفتہ نیست بلندی کوہ ہمواری

ان اشعار میں جن واقعات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس کا پتہ موجودہ تاریخوں میں نہیں چلتا۔

لطف اللہ مہندس کے اکثر اشعار سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ نام و نمود کا حریص اور معماری جیسے پیشہ سے اپنے کو بلند سمجھتا ہے چنانچہ اس قصیدے میں وہ کہتا ہے۔

قسما اگرچہ عمارت گریست پیشۂ من   دگر چہ نیست ضمیرم از ایں ہنر عاری
کنوں کہ ملک دلم شد خراب عشق بتاں   ز خود بگو کہ چہ [illegible] نیست سر بمعماری

غزلوں کا عام انداز وہی ہے جو اس عہد کے دوسرے شاعروں کے کلام میں ہے۔ زبان میں کہیں کہیں سندیت ہے۔ اس کے مقطعوں میں خاص خصوصیت یہ ہے کہ وہ اس میں مہندس کی مناسبت سے کوئی بات ضرور پیدا کرتا ہے۔ مثلاً

مہندس اگرچہ آگہ بود ز پیمایش   غم عشق کرد قانون شفا را
باشد ز فلک مہندس آگاہ   با آنکہ نشستہ بر زمین است
اے مہندس ہر دو چشم مہندس بے رخت   از حضیض خاک تا اوج ثریا آتش است
زد مہندس بعلم یک عجب مشکل   ایں ہمہ افتخار بے معنی است
اے مہندس مرو کہ بود علم نظر   احتیاج مسطر و پرکار نیست
بیاں معرفت زمیں بگو مہندس   تا کے ز فلک کنی حکایت
از مہندس مپرس سر فلک   کیں معما ز ہیچ کس نگشود

ذیل کے مقطعوں میں اس مہندس کے لفظ سے کتنا لطیف استدلال کیا ہے:-

در حق من گمان خطا می بری خطاست   ہرگز شنیدہ کہ مہندس خطا کند

تا بکے شکل زمیں خواہی کشید   رو مہندس صورت افلاک کش
کہنہ شد آسماں مہندس خیز   تا بنا ہائے نو نہادہ شود

حسب ذیل غزل اس کے بہترین کلاموں میں سے ہے۔

یاراں ہلال عید برآمد نظر کنید   ماہ صیام رفت مغاں را خبر کنید
یاراں دگر بکوری مفتی و محتسب   امروز خاک میکدہ کحل بصر کنید
آں کس کہ از برآمدن مہ خبر کند   او را باحترام دہن پر شکر کنید
اکنوں رسید کوکبۂ عیش و انبساط   اے درد و غم ز مملکت دل سفر کنید
گر وہن نگار مہندس شود حجاب   دستش گرفتہ زود ز محفل بدر کنید

ذیل میں اسکے دیوان کے وہ اشعار نقل کیے جاتے ہیں جن سے اسکے کچھ حالات معلوم ہوتے ہیں۔ اسکا نام

باش لطف اللہ احمد چہ کنی فخر بعلم   جہل ازیں علم تو بہتر کہ نیاید بعمل
خواہم کہ کشم بادہ چو لطف اللہ احمد   تا چند کشم محنت دور قمری را
ہمچو لطف اللہ احمد کو ز دانش تہی دم   چوں شدم عاشق بجہل خویش کردم اعتراف

ان شعروں میں لطف اللہ اس کا اور احمد اس کے باپ کا نام ہے لاہور اسکا وطن تھا۔

کے بود آمدن قاصد فرخندہ پیام   مدتے شد کہ ز لاہور نیامد خبرے

ہندسہ و منطق و حکمت میں اسکو غلو تھا۔

بر من ہمہ آں کشف شد از فیض ازل   راز سربستہ کہ بر ہندسہ داں مشکل بود
صرف در منطق و حکمت شدہ ایں عمر عزیز   لیک آں نکتہ نخواندم کہ درو حاصل بود

معماری و ہندسی میں نامور تھا۔

لطف اللہ معمار مہندس شد و استاد
گر کار درایت نکند پس چہ کند کس

درس و تدریس کا بھی شغل تھا۔

عمر در درس بسر بردی در آخر کار
ہیچ حاصل نہ شد از درس بجز بحث و جدل

کسی شہزادہ کے نام ایک مثنوی ہے جس سے مراد غالباً دارا شکوہ ہے کہ شہزادہ بلند اقبال کے نام سے ہی مخاطب تھا اس میں وہ کہتا ہے۔

لطف شہ می کند مددگاری
ورنہ آگہ نیم ز معماری
خواندہ ام یک دو نسخہ از ہر باب
ہیئت و ہندسہ نجوم و حساب
نہ کہ تعلیم دیدہ ام ادبی
گرچہ خواندہ ام من از عربی

……

لطف شہزادہ بلند اقبال
گر شود بندہ را معاون حال
خدمت بندہ را بسر آید
گر از دست رفتہ باز آید
گر کسے از مقربان رساند
دو سہ دم بیش در زبان نشاط
این سخن از کمینہ درگاہ
برساند بسمع حضرت شاہ
اجر یابد کہ [illegible]
نزد [illegible] اجر عظیم

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ داراشکوہ کے توسط سے شاہجہاں تک پہنچنا چاہتا ہے کہیں کہیں غزلوں کے مقطعوں میں بھی ادھر اشارہ ہے۔

لطف مہندس شدہ شاہ بلند اقبال است
آنکہ گر فرمان دہد خورشید فلک بر شود

ایک مثنوی میں کسی ایسے شاہزادہ وزارت کے کسی رکن کی مدح وہ کرتا ہے

جس کو سیادت کی عزت بھی حاصل تھی۔

اختر برج حشمت و اجلال   گوہر درج دولت و اقبال
شبنم آسمان بینائی   آفتاب سپہر دانائی
منبع جود و مخزن احسان   مظہر فیض و معدن ایقان
زبدۂ دودمان مصطفوی   نخبۂ خاندان مرتضوی
امرا را شرف امارت او   وزرا را شرف وزارت او
امرا از امارتش مشہور   وزرا از وزارتش دستور
آب شرع است سیف مسلولش   دست عدلست رمح مصقولش

میرا خیال ہے کہ اس مدح کا موضوع وہی ہستی ہے جس کے نام پر شاعر نے اپنی کتاب منتخب الحساب لکھی ہے یعنی خلاصۂ دودمان سیادت منقوب خاندان وزارت میر محمد سعید بن میر محمد یحیی ادام اللہ اقبالہ وضاعف جلالہٗ

لطف اللہ اور اس کے بھائیوں کی تصانیف سے یہ ہویدا ہے کہ ان لوگوں کو شاہجہاں کے بیٹا جس سے تعلق رہا ہے وہ شہزادہ دارا شکوہ ہے چنانچہ لطف اللہ کے بھائی عطاء اللہ رشیدی نے اپنا رسالہ خلاصۂ راز شہزادہ موصوف ہی کے نام سے معنون کیا ہے۔ لطف اللہ کے اس دیوان کے اکثر اشعار سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ اسکو اسی شہزادہ کے دربار میں رسوخ و اعتبار حاصل تھا۔ نعت کے بعد جو پہلا قصیدہ اس دیوان کا ہے وہ اسی کی مدح میں ہے۔

بیاری لطف شہ بلند اقبال   بلند پایہ زمین گشت قدر معماری

سپہر مرتبہ دارا شکوہ دریا دل   کہ ہمچو ابر لطف می کند گہر باریہا

اس کی ایک غزل کا ایک مطلع ہے۔

گر بادشہ بلطف نظر بہ گدا کند   بر بادشہ نظر بعنایت خدا کند

اس کی دوسری غزل کا مطلع ہے۔

اے شاہ زمن بیا و بنگر   در دل من بیا و بنگر

ایک پوری غزل مدح میں ہے۔

اے ز جود تو کامرانی دہر   در وجود تو پاسبانی دہر
بخدائے خدایگان زماں   بتو زیبا خدایگانی دہر
دہر را مدح تو وظیفہ بود   گوش کن بر وظیفہ خوانی دہر
بتو زیباست خلعت شاہ   ز تو زیباست کامرانی دہر
باشد از لطف تو مسند شاہ   اے ز لطف تو شادمانی دہر

ان موقعوں پر لفظ لطف کا لطف اہل ذوق سے پوشیدہ نہیں۔
ایک اور مدحیہ غزل سنیے جس کے مطلع میں دادا، بیٹا اور پوتا تینوں کے نام یکجا ہیں۔

دارا شکوہ شاہجہاں باقی جہاں   بروے مبارکست سلیمانی جہاں

شاہجہاں۔ دارا شکوہ بن شاہجہاں اور سلیمان شکوہ بن دارا شکوہ بن شاہجہاں۔

پروردگار باد نگہبان تست   زانرو کہ کار تست نگہبانی جہاں
تا زآب [illegible] نشاں بر زمانہ باد   روشن ز خاکپائے تو پیشانی جہاں

اے بانی جہاں کہ جہاں در ثنائے تست   یک لحظہ گوش دار ثنا خوانی جہاں
تا کے مہندس است پریشاں چو زلف یار
اے از تو دور گشتہ پریشانی جہاں

ایک قطعہ ہے۔

دولت جاوید بخت سرمد ملک دوام   ہم عنان ہمدم و شاہ بلند اقبال باد
از کف دستش زر و گوہر برد دربارگاہ   تا ابد دریا و کاں زیر فیض الامال باد
می کند احسان او در ماندگاں را یاوری   یاور او را ایزد ذو المجد و الافضال باد

دوسرا قطعہ۔

ثنا خوان ترا شاہا چہ حاجت صبح جم گفتن   بجام بادہ حاجت نیست مست جام سردارا
چو می خواہد کہ باشد بانی قصر ثنائے تو   بکار خشت و گل گذار لطف الہ احمد را

اس قطعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ معماری کے پیشہ کو اپنے سے کم درجہ جانتا تھا۔

دارا شکوہ نے اس سے اپنا محل بنوایا ہے اسکی تاریخ نکالتا ہے۔

چو بنا کردہ قصر جاہ و جلال   ظل حق بادشاہ عالی ملک
شبہہ ایں عمارت والا   تا دنت چوں مہر و مہ حوالی ملک
گفت معمار قصر تاریخش   قصر دارا شکوہ والی ملک

اس مصرع سے تاریخ بنا ۱۰۶۱ھ نکلتی ہے اور اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ دارا شکوہ کا یہ قصر اسی شاعر معمار نے بنایا تھا۔ دارا شکوہ نے کوئی کبھی بنوائی ہے اسکی تاریخ کہی ہے۔

چو طیار شد ایں کلبۂ ظفر   بفرمان دیں پرور حق پژوہ

پئے سالِ تاریخ انجام وے   خرد گفت "مفتاح دارا شکوہ"

"مفتاح دارا شکوہ" سے ۱۰۶۶ھ نکلتے ہیں جس کے ایک سال بعد دارا شکوہ کی تاریخ کا صفحہ بدل جاتا ہے۔ دارا شکوہ کے بیٹے سلیمان شکوہ کی کدخدائی کی تاریخ یہ لکھی ہے۔

کدخدا گشت باقبال بلند   پور دارائے زماں شاہ زمیں
در زمانے کہ مرادات جہاں   بود در دست چو در دست نگیں
گفت جبریل امیں تاریخش   با سلیماں شدہ بلقیس قریں

آخری مصرع سے ۱۰۶۶ھ نکلتے ہیں۔

اوپر کے اشعار سے صاف ظاہر ہے کہ اس کا اور اسکے خاندان کا تمامتر تعلق دارا شکوہ سے تھا۔ اب تاریخ کا اس واقعہ سے دوسرا نتیجہ پیدا کرنا بہت آسان ہے یعنی یہ کہ اسکو دارا شکوہ سے جس قدر وابستگی ہوگی اسی قدر عالمگیر کے دربار سے اس کو دوری ہوگی۔ دارا شکوہ کے مدحیہ قصیدہ میں کچھ ایسے شعر بھی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں دارا شکوہ کے حریف مقابل یعنی اورنگ زیب پر طعن و تعریض ہے۔ مثلاً

ز ہیبتش نتواں یافت نیم قطرہ خوں   ہزار بار دل خصمش اگر بیفشاری
بہ خصم تیر کہ زد در دلِ معاندانہ   ربودہ رنگ قلم را سپہر زنگاری
دراں دیار کہ بخت عدو شدہ بخواب   ندیدہ دیدۂ مردم بخواب بیداری
مدام باد ہوا خواہ دولت تو بعیش   نصیب خصم تو جاوید باد خونخواری

ان اشعار میں "خصم" اور "معاندانہ" اور "عدو" سے غالباً اورنگ زیب ہی

کی طرف اشارہ ہے اس بنا پر ۱۰۶۸ھ کے انقلاب میں جب شہزادہ بلند اقبال کی جگہ اورنگ زیب عالمگیر زیب اورنگ ہوا تو اس شخص کی کس مپرسی محتاج بیان نہ ہوگی۔ نعمت اللہ کے دیوان میں ایک قطع بند غزل ہے۔

شہا گوش بر داد خواہی نداری   بحال گدایاں نگاہے نداری
رقیباں بقتلم نوشتند فتوی   دگر شہ خبر از گناہے نداری
جہاں سر بسر خیر خواہ تو باشد   دلے ہمچو من خیر خواہے نداری
بیاری صبا سوئے بلبل پیامے   مگر سوئے گلزار راہے نداری
مہندس ازاں رو نداری وقارے   کہ چوں زاہداں خانقاہے نداری

میرے خیال میں اس غزل کا خطاب اورنگ زیب ہی کی طرف ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اسکو دارا شکوہ کے عہد میں اس گلہ و شکایت کا موقع نہ تھا اور نہ زاہد و شیخ خانقاہ پر تعریض کی حاجت تھی۔

اوپر کے اشعار میں مہندس نے اپنی شعری مہارت فن کا بھی جا بجا اظہار کیا ہے۔ کہتا ہے

بلند پایہ زمیں گشت قدر معماری

ایک جگہ فخریہ کہتا ہے۔

ماہمہ معمار و عمارت گریم

ایک جگہ کہتا ہے کہ میرے بنائے ہوئے نقشے آفتاب کی طرح روشن ہوتے ہیں۔

چناں منیر شود شہہ عمارت من — کہ نور مہر کرد نزد نور او تاری
دمے کہ من بعمارت گری شوم مشغول — ملک مصالح کار آورد بسر باری

مگر با ایں ہمہ یہ نہیں معلوم کہ اس کی بنائی ہوئی عمارتیں کون ہیں۔ اوپر کے ایک تاریخی قطعہ سے دارا شکوہ کے ایک محل کے بنانے کا حال معلوم ہوتا ہے۔ تذکرۂ سفینہ خوشگو اور نشتر عشق حسین قلی خاں میں ۱۱۹۵ھ ہوئیں مہندس کے بیٹے ریاضی کے حال کے ضمن میں ہے "ملا لطف اللہ مہندس تخلص لاہوری است۔ کہ قلعہ ارک دار الخلافہ شاہجہاں آباد بتجویز و صوابدید او بنا یافتہ" (خوشگو) اس سے معلوم ہوتا ہے قلعۂ دہلی کے شاہجہانی عمارات کی تعمیر میں یہ بھی اپنے باپ اور چچا کے ساتھ شریک تھا۔ سحر حلال میں یہ اپنی نسبت لکھتا ہے:۔

"مملوک ہوادار ولد احمد معمار گوہر عمر را در کارگاہ وگل کاسد کردہ"

اس فقرہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسکی عمر کا بڑا حصہ عمارت گری میں صرف ہوا۔

سحر حلال } یہ فارسی رسالہ علم اخلاق میں ہے اور صنعت غیر منقوطہ میں لکھا گیا ہے۔ اسی لئے مصنف کا نام لطف اللہ کے بجائے "ولد احمد معمار" لکھا گیا ہے۔ اسکے شروع کی عبارت یہ ہے۔

"اللہ علا اسمہ در اول کلام حمد کردگار آورد ہم مالک ملک، علام واحد صمد سلام"۔

حمد و نعت کے نو صفحوں کے بعد دو صفحوں میں مدح داور کامگار ادام اللہ ملکہ کے عنوان سے بادشاہ عصر کی تعریف ہے ممدوح کا نام حسب ذیل صورت

معمّہ میں ہے۔

"اسم اکرم او حاصل دو کلمہ آمد۔ کلمۂ اول سر عدل (ع) و دلِ داد (الف) و دلِ علم (ل) و سر مراد (م)۔ کلمۂ دوم سر گل (گ) و دل سرو (ر) و دو سر گل و دل سرِ دہ در آمدہ۔ ملک علام و صمد سلام ہموارہ سردار او را محمود سمائے کرم و گل او را محسود دوحۂ ارم دارد"

اس صورت معمہ سے جو نام نکلتا ہے وہ عالمگیر ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ دارا شکوہ کے مدّاح نے عالمگیر کی مدح کیونکر لکھی شاید اس اخلاقی رسالہ کو عالمگیر کے نام سے پیش کر کے انکی ہمدردی اپنی طرف مائل کرنی چاہی جو معلوم نہیں کہ ہوئی یا نہیں۔

بادشاہ کی مدح کے بعد مدح رسالہ و حال محرر اصلح اللہ حالہ کے عنوان سے تین صفحوں میں اپنا اور اپنے رسالہ کا حال لکھا ہے جسکا اقتباس درج ذیل ہے۔

"مملوک ہوادار ولد احمد معمار رسالہ را کہ مادہ او محل مطمع اہل حال آمدہ حال سطور معدودہ کردہ در درگاہ سالار کامگار دام اللہ ملکہ آوردہ..... ماحول کہ در خیال سعد...... در سط العمر سالا در آمدہ معلوم ملکۂ اکرم گردد۔ سردار، مملوک ہوادار ولد احمد معمار گوہر عمر را در کار کاہ و گل کاسد کردہ... مسئول کہ ہر کس در مسالک علم...... اطلاع دارد رسالہ مملوک ہوادار اصلاح دہد۔ احمد معمار والد مملوک ہوادار سہ ولد دارد۔ اول عطاء اللہ سلمہ اللہ سالک مسالک علم و حال و راحل مراحل صعود و کمال عالم و عامل و علامۂ عصر کہ در اداء علم و عمل آمدہ حصر رسالہا

در علم اعداد مسطور کرده اعمال صلاح و کسور و ولد دوم اوسط ہر سہ
ملوک درگاه کردگار و اسم مولود کے حلال دو کلمہ آمد۔ کلمۂ دوم "اللّٰہ" علا اسمہ
کلمۂ اول لام و طا و معادل عدد عطا، و ولد سوم در مسالک علم و حال
و مراحل سعود و کمال مساہم عطاء اللہ آمد و اسم او ہم دو کلمہ دارد۔ کلمۂ دوم
"اللہ" علا اسمہ و کلمۂ اول معادل عدد عطا دوا و در راه اصلح اللہ حالہ
حصل اللہ آمالہم معلوم اہل علم گردد کہ اسم رسالہ والا سحر حلال آمد۔ ......
معلوم اہل کمال کہ سحر حلال را در ماه محرم الحرام مسطور کرده۔ سال
رسم سحر حلال ملہم اہل حال و معلم اہل کمال را سوال کردم صدا در داد کہ
سحر حلال در دو اہل حال آمد و درس لوح کمال"

اس آخری فقرہ سے رسالہ کی تصنیف کی تاریخ ۱۰۶۲ھ نکلتی ہے۔

اس تمہید کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے۔ جس میں مختلف اخلاقیات کو سر عنوان بنا کر مدح و ذم لکھا گیا ہے۔ مثلاً مدح عدل مدح سماح۔ محرم امساک۔ محرم حسد۔ محرم طول امل۔ محرم حرص و طمع محرم کسل۔ مدح کد۔ مدح دلدار و حال اہل دل۔ ہوس وصل دلدار حصول وصل دلدار۔ محرم ہوس دوام وصل۔ مدح ال۔ مدح سرود کلام اہل دل۔ اسی پر رسالہ ختم ہو گیا ہے۔

اس رسالہ کے دو نسخوں کا مجھے علم ہے۔ پہلا مدرسۂ محمدی مدراس کے کتب خانہ کا جس کا نمبر ۲۶۸۶ ہے۔ اس نسخہ کو غلام عبدالقادر المخاطب بہ قادر عظیم خاں نے ۱۲۲۱ھ میں نقل کیا ہے

جو مدراس کے ایک مشہور علمی خاندان کے رکن تھے[1]۔ یہ نسخہ ۲۹ صفحوں میں ہے۔ دوسرا نسخہ بمبئی یونیورسٹی کے کتب خانہ میں ہے۔ جس کا نمبر اس کے کیٹلاگ میں جلد ۸ اسپ ۱۰ ص ۶۸ ہے۔ اس کو ابھی ابھی ہمارے مخلص دوست پروفیسر شیخ عبدالقادر (پونہ) نے مرتب کرکے شایع کیا ہے[2]۔

(۱۳)

امام الدین الریاضی } یہ لطف اللہ مہندس کا بیٹا اور استاد احمد کا پوتا ہے۔ ریاضیات کے اس بیت علم کا یہی وہ نونہال ہے جس کے تذکرہ کی خوشبو بارہویں صدی کے اہل تذکرہ کی مشام جان تک پہنچی ہے۔ خوشگو نے اپنے سفینہ میں، حسین قلی خان عظیم آبادی نے اپنے نشتر عشق میں، کشن چند اخلاص نے اپنے ہمیشہ بہار میں اور احمد علی خان سندیلوی نے اپنے مخزن الغرائب میں ان کے حالات لکھے اور ان کے فارسی اشعار نقل کیے ہیں۔ اور اسی ضمن میں ان کے بعض بزرگوں اور عزیزوں کے احوال کی طرف بھی اشارات کیے ہیں۔

---

[1] اس خاندان کے نوجوان رکن جناب محمد غوث صاحب ایم اے (حیدرآباد دکن) کا ممنون ہوں کہ انھوں نے میرے لیے اس رسالہ کے اقتباسات اپنی نوازش سے نقل کرکے بھیجے۔

[2] اس کیٹلاگ کے فاضل مرتب نے اس رسالہ کا مصنف لطف اللہ کے چھوٹے بھائی نوراللہ کو ظاہر کیا ہے۔ یہ کیسی غلط فہمی پیش آئی ہے۔

"سفینۂ خوشگو" میں ہے:-

"مولوی امام الدین ریاضی تخلص خلف ملا لطف اللہ مہندس تخلص لاہوری است کہ قلعۂ ارک دارالخلافہ شاہجہان آباد بتجویز و صوابدید او بنا یافتہ و از عہد جد خود بدارالخلافہ سکونت دارد و در جمیع علوم رسمی یگانہ و منفرد بود، خصوص در ریاضیات تصانیف معتبر دارد و با این ہمہ قناعت و ریاضت را زیور حال و مآل خود ساختہ، بہ تدریس و افادت اشتغالی داشت درین جزو زمان از مغتنمات بودہ۔ اگرچہ بنا بر اشتغال علمی بفکر سخن کم می پرداخت لیکن سلیقہ بسیار درست داشت۔ و در جوابہائے پای کم نمی آورد۔ و در سال ہزار و صد و چہل و پنج رحلت کرد و امروز ملا ابوالخیر معروف بخیر اللہ برادر اعیانی او .... (خیر اللہ کی رصد شدی کا تذکرہ جسکا ذکر اسکے حال میں آئے گا)

پھر مولانا ریاضی کے چند فارسی اشعار کا انتخاب ہے۔

حسین قلی خان عظیم آبادی "نشتر عشق" میں لکھتے ہیں:-

"مولانا امام الدین نام، خلف مولانا لطف اللہ مہندس لاہوری است کہ قلعہ ارک شاہجہان آباد بر بنائے وی بنا شدہ مدۃ العمر خود، در شاہجہان آباد گذرانیدہ، چون وی بعلم ریاضی تفوق بر ابنائے جنس داشت و در ورع و پرہیزگاری بے مانند بود۔ لہذا تخلص خود ریاضی می کرد، گاہ گاہے فکر بہ تلاش سخن ہم می گماشت۔ ... در سنہ یک ہزار و یک صد و چہل و پنج بگل چینی ریاض جناں شتافت۔"

حسین قلی خاں نے انکی تاریخ وفات کا یہ شعر لکھا ہے

بگفتہ عاشقے باآہ دل سوز برفتہ چوں امام الدین ز دنیا
بدیع و صرف و معنی و ریاضی شد ندای ای بے ادبے سروپا

کشن چند اخلاص نے اپنے تذکرہ "ہمیشہ بہار"[1] میں انکا تذکرہ بڑے اخلاص کے ساتھ چند صفحوں میں لکھا ہے جسکی ایک ایک سطر سے اس کی عقیدتمندی اور نیازمندی کا اظہار ہوتا ہے خصوصاً انکے زہد و استغنا اور سلاطین و امرا کے درباروں سے انکی بے نیازی کی تعریف کی ہے۔ ابتدائی سطریں یہ ہیں:-

"اصل وطن ایشاں دارالسلطنت لاہور است و جدّ شریف آں دانائے اسرار کونی و الٰہی آمدہ۔ در دارالخلافہ شاہجہان آباد اقامت گرفتہ، والد شریف ایشاں مولوی لطف اللہ مہندس کہ ایشاں ہم گاہ گاہے میل بشعر می کردند و مہندس تخلص می فرمودند در علم ریاضی خیلے ید علیا داشتند۔"

پھر چند صفحوں میں انکے زہد و اتقا کے حالات لکھے ہیں اور انکے شاعرانہ کمال کے ایک دو لطیفے نقل کئے ہیں۔

احمد علی خاں سندیلوی نے تذکرہ مخزن الغرائب میں جو ۱۲۱۸ھ میں لکھی گئی ہے ذرا سے لفظی تغیر سے وہی کچھ لکھا ہے جو اخلاص نے بیان کیا ہے

---

[1] اس کا نسخہ بانکی پور لائبریری میں نظر سے گذرا۔

چنانچہ اس میں ہے:-

"مولانا امام الدین ریاضی اصل وطن ایشان بلدۂ لاہور است۔ بنابر توطن در دہلی اختیار کردہ پدرش مولوی لطف اللہ مہندس بودہ است ایشان ہم بگفتن اشعار میل تمام داشتند و مہندس تخلص می کردند و در علم ریاضی مثل ابجد سرکردہ و بیشتر در بلاد ہند بودہ اند ہر چند مولانا ریاضی بگفتن شعر توجہ نداشت روز و شب بہ تدریس مشغول بود"

تذکرۂ "صبح گلشن" میں ہے:

"ریاضی امام الدین فرزند مولانا لطف اللہ مہندس لاہوری کہ قلعۂ ارک شاہجہان آباد بصوابدید ایشان نقش بنا گرفتہ، ریاضی متوطن شاہجہان آباد گردیدہ، از ان شہر بلدۃ الفخر بیرون نہ رفتہ ماہر علوم درسیہ بودہ و در بعض علم ریاضی از معاصرین قصب السبق ربودہ، و در عبادت و ریاضت شب و روز تعدیل خود نداشتہ"

تاریخ علمائے ہند میں یہ سطریں ہیں۔

"ملا امام الدین دہلوی در اصل لاہوری است، ریاضی دان بود کہ بدہلی توطن گرفتہ شرح مختصر تشریح الافلاک مصنفہ بہاء الدین آملی در سال یازدہ صد و سہ ہجری نوشتہ کہ بنام التصریح فی شرح التشریح شہرت دارد"

(صـ ۲۶۲ - تذکرہ)

عام طور سے اسکی یہی تصنیف تصریح جو بہاء الدین آملی کے مشہور متن تشریح الافلاک کی شرح ہے لوگوں میں مشہور ہے۔ حالانکہ اس سے پہلے عصمت اللہ سہارنپوری نے سنہ ۱۰۸۹ھ میں اسکی مفصل شرح لکھی ہے جسکا نام بھی تشریح الافلاک ہے۔ اور جو چھپ بھی گئی ہے تاہم علم ہیئت میں عربی درسگاہوں کی سب سے ابتدائی اور مختصر ترین کتاب یہی ہے۔ اسی لیے بہت متداول ہے۔ مصنف نے دیباچہ میں اپنا نام اسطرح لکھا ہے۔

اما بعد فیقول العبد الضعیف امام الدین بن
لطف الله المهندس اللاهوری ثم الدهلوی (دیباچہ تصریح)

اس سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ خاندان گو دراصل لاہور کا رہنے والا تھا مگر بعد کو شاید شاہی تعمیرات کے تعلق سے دہلی آکر آباد ہو گیا تھا۔

امام الدین نے اپنی اس تالیف (تصریح) کا سنہ تالیف نہیں لکھا ہے۔ البتہ ہم کو معلوم ہے کہ لطف اللہ کم از کم سنہ ۱۰۹۵ھ تک زندہ تھا انکی تصنیف تحفہ اسی سال تالیف پائی ہے اور اس کے گیارہ برس کے بعد اسکا بیٹا "تصریح" لکھتا ہے۔ اس سے قطعی طور سے ثابت ہوتا ہے کہ باپ ہی کے عہد میں بیٹا علوم و فنون کی تکمیل کر چکا تھا یا کر رہا تھا۔ اس سے ہمکو یہ قیاس کرنے کا حق ہوتا ہے کہ غالبًا اس نے اپنے باپ ہی سے علوم ریاضی کی تعلیم حاصل کی ہوگی۔ تذکروں میں اسکی تاریخ وفات سنہ ۱۱۳۵ھ (سنہ خمس وثلاثین ومائة والف) لکھی ہے۔

"تصریح" کے دیباچہ میں ہے کہ "شرح اسکے بھائیوں اور دوستوں کی

فرمائش سے لکھی ہے۔ اس سے مراد اس کے شاگردوں کی جماعت ہے اس سے معلوم ہوگا کہ وہ خود بھی درس و تدریس کے موروثی پیشہ میں مشغول تھا چنانچہ سندیلوی نے تصریح بھی کی ہے کہ "روز و شب بتدریس مشغول بود"

رامپور کے کتبخانہ میں اسکی کتاب "تصریح" کے دو نادر نسخے ہیں جن میں سے ایک کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ تصنیف کی تاریخ سے بارہ برس کے بعد سنہ ۱۱۱۵ھ میں لکھی گئی ہے اور دوسرے کی اہمیت یہ ہے کہ وہ سنہ ۱۲۱۱ھ میں اس نسخہ سے منقول ہے جو خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔ پہلے نسخہ کا نمبر ۱۵۔ اور دوسرے کا ۱۶ (فن ہیئت) ہے۔

مصنف نے اپنی اس شرح پر حواشی بھی لکھے تھے چنانچہ رامپور کے نسخہ نمبر ۱۶ پر مصنف کے یہ حواشی موجود ہیں۔ ہمارے استاذ مولینا حفیظ اللہ صاحب سابق مدرس اعلیٰ مدرسہ عالیہ رامپور و دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ نے "تصریح" پر جو حاشیہ اپنے قیام رامپور کے زمانہ میں سنہ ۱۳۱۱ھ میں لکھا تھا اور جو مجتبائی دہلی میں چھپا ہے اس کے آخر میں محشی نے تصریح کی ہے کہ انھوں نے شارح کے ان حواشی سے جو اسکے ہاتھ کے نوشتہ نسخہ سے منقول ہیں استفادہ کیا ہے (خاتمہ حاشیہ "تصریح" مطبوعہ مجتبائی دہلی)

امام الدین نے دو اور کتابوں پر بھی حاشیے لکھے ہیں جن میں سے ایک قاضی زادہ رومی کی مشہور فلکی تصنیف شرح چغمینی پر ہے۔ نوابی اودھ کے زمانہ میں علی بخش خاں کے مطبع علوی میں مقبول الدولہ احسان الملک کپتان مرزا مہدی علی خاں بہادر ثابت جنگ قبول کے زیر اہتمام

شرح چغمینی کا جو نسخہ متعدد علما کے حواشی اور تعلیقات کے ساتھ چھپا ہے ان میں ایک امام الدین الریاضی بن لطف اللہ المہندس الدہلوی کے حاشیہ کے بھی منقولات اور حوالے ہیں۔ چنانچہ کتاب کے خاتمہ میں اس حاشیہ کا ذکر ہے۔

امام الدین کا دوسرا حاشیہ خود اسکے باپ کی کتاب "شرح خلاصۃ الحساب" پر ہے۔ یہ حاشیہ انڈیا آفس کے کتبخانہ میں ہی اسکا نمبر ۷۶۱ ہے۔

امام الدین بھی اپنے باپ کی طرح فارسی کا شاعر تھا اور ریاضی اس کا تخلص تھا۔

کشن چند اخلاص اور سندیلوی کا بیان ہے کہ گو مولانا ریاضی کو اپنے درس و تدریس سے شعر گوئی کی فرصت نہیں ملتی تھی تاہم انھوں نے طالب آملی کے ایک مطلع کا جس کا جواب نہیں ہو سکتا تھا ایسا جواب لکھا جو بڑے بڑے شعرا کی قدرت سے باہر ہے۔ طالب کا مطلع تھا

بتن بو یا کند گلہائے تصویر نہالی را   بپا بیدار سازد خفتگان نقش قالی را

اخلاص اور سندیلوی کہتے ہیں کہ اسکا جواب شاعروں سے اب تک نہیں ہو سکا تھا یہاں تک کہ میاں ناصر علی کو انکے دوستوں نے اس زمین میں کچھ کہنے کی فرمائش کی تو صاف کہا کہ "این زمین را طالبا برد چیزیکہ ماندہ است درد است" مرزا صاحب جیسے "شاعر غرا" نے جب اس غزل کا جواب لکھا تو سپر ڈال دی اور قالی اور نہالی کا مطلع نہیں لکھا بلکہ یہ مطلع کہا کہ

تکلف نیست در گفتار رند لاابالی را   چہ باشد دوست میدارم کہ عاشق شعر حالی را

لیکن مولانا ریاضی نے اسکا جواب برجستہ لکھ دیا۔

رنگ گل کرد آں گلچہرہ ظاہر پنہانی را ازیں اندیشہ گلہا داغ شد بیتابی را

مولانا کا مطلع جس نے سنا اس نے کہا۔

"ظاہرا ایں زمین در دو صد صاحب داشتہ یکے را الہام [illegible] تا حال در جواہر خانۂ فصحا و فضلا پنہاں بود کہ نصیب مولانا شد"

ان تذکروں میں انکے چند شعر نقل کئے ہیں۔

عنقا شدم نگاہ رسا گشتنی شکست در قید نام بود اگر پرفشان نشست
رفتی و در شکست گلشکر داغ در رکاب تو شہرم برنگ مجلس تصویر بیاں شد
روشن بیم و خاک نشینی عصا ماست سیماب وار گشتہ شدن اضطراب ماست
آزادہ ایم مطلب ما ترک مطلب است باز آمدن ز مطلب حاصل برگ کار ماست
ما خاک غم سپیدہ چو ماہی نہفتہ ایم گلزار عشق داغ دل پر خار ماست
دریا دل [illegible] یار ز ہم از نادیدہ ایم خشک است تمنای گل [illegible] ماست
زعشق یار چہ گویم کہ حال من چون است [illegible] انداختہ سر [illegible] است
ز داغ [illegible] کہ بہار است بیاں رسیدہ [illegible] کہ حال او چون است

سنا تو ہیں شعر میں بیگم کہ ریاضی کی جھلک دور سے نظر آجاتی ہے شعبۂ حسن شگو ہیں یہ دو شعر اور ہیں۔

پایۂ عشق بلندی ز سر دار گرفت ہر کہ دریا چو منصور سزا داریست
یوسفستان معانی است ریاضی [illegible] چاک پیراہن نظم تو عجب بازاریست

امام الدین ریاضی نے تصریح کے دیباچہ میں جو چند لفظ لکھے ہیں ان سے

اور کشن چند اخلاص کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تربیت کے دامن میں ریاضیات کے کئی مستعد شاگرد پل کر جوان ہوئے۔ اخلاص کے تذکرہ "ہمیشہ بہار" میں ہے:-

"یکے از شاگردان ایشاں بر مجسطی شرح فارسی نوشتہ خیلے مفصل"

پھر لکھا ہے۔

"عزیزے در حق بعضے از شاگردان ایشاں گفتہ ع
قوتی در ہر فنے چوں مرد کسان"

اسکے بعد لکھا ہے:-

"شاگردان ایشاں در ریاضی تصانیف رائقہ فائقہ دارند"

خیر اللہ بن لطف اللہ لطف اللہ مہندس کا یہ دوسرا لڑکا ہے۔ اسکا پورا نام ابو الخیر المخاطب خیر اللہ خان مہندس ہے۔ محمد شاہ کے عہد میں اس نے اپنا نام روشن کیا اور لفظ المخاطب سے ہویدا ہے کہ بادشاہ کے دربار تک اسکی رسائی حاصل تھی۔ اپنے باپ کی طرح یہ بھی اپنے نام کے ساتھ مہندس لکھتا ہے۔ غالباً اس نے تعلیم اپنے بڑے بھائی امام الدین سے پائی ہوگی۔ جس نے ۱۱۲۵ھ تک زندگی پائی ہے۔ تصریح کے دیباچہ میں امام الدین نے لکھا ہے کہ "اس نے اپنے دوستوں اور بھائیوں کی فرمائش سے یہ شرح لکھی ہے۔ عجب نہیں کہ ان بھائیوں میں اس کا یہ بھائی بھی ہو۔ کشن چند اخلاص کے تذکرہ "ہمیشہ بہار" میں امام الدین ریاضی کے ذیل میں ہے "یکے از شاگردان ایشاں بر مجسطی شرح فارسی نوشتہ

خیلے بتفصیل ....“ آگے معلوم ہوگا کہ یہ شاگرد خود اسکا بھائی خیر اللہ ہی اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خیر اللہ اپنے بھائی امام الدین کا شاگرد تھا۔ اسکا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ محمد شاہ کے زمانہ میں راجہ جے سنگھ نے بادشاہ کے حکم سے دہلی، جے پور، بنارس اور اُجین میں جو رصدخانے قائم کئے تھے۔ انکا بانی اور نگران کار یہی نادرۂ روزگار تھا۔ آج سے ۲۵-۲۶ برس پیشتر میں نے یہ بات قیاساً لکھی تھی لیکن بحمد اللہ کہ آج اُس کے ایک معاصر تذکرہ نویس بندرابن خوشگو المتوفی ۱۱۷۰ھ کی معاصرانہ شہادت سے یہ پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی۔ خوشگو اپنے تذکرہ سفینۂ خوشگو میں جس کا قلمی نسخہ بانکی پور لائبریری میں نظر سے گذرا امام الدین ریاضی کے حال میں لکھتا ہے۔

> ”واسروز ملا ابوالخیر معروف بخیر اللہ برادر اعیانی وی در ہیئت و ہندسہ واکثر علوم یگانۂ روزگار است۔ چنانچہ راجہ دھیراج جے سنگھ سوائے زمیندار آنبیر درین ایام خیال رصد بستن در پیش داشت قریب بیست لک روپیہ در بست سال صرف این کار نمود باتصواب ابوالخیر مذکور است وحق آنست کہ ذات او بر زمانہ منت است۔“
>
> (سفینۂ خوشگو نمبر ۲۵۔ ص ۱۲۳)

دہلی میں اس رصد خانہ کے کام کے علاوہ ریاضیات کا درس بھی دیا کرتا تھا (دیباچۂ تقریب التحریر) چنانچہ اسکے شاگردوں میں سب سے پہلا نام اُسکے بیٹے محمد علی کا ہے۔

له الندوہ سنہ میں مضمون اسلامی رصد خانے۔

اس کی ایک معنوی یادگار انڈیا آفس لائبریری لندن اور کتبخانہ نواب سالار جنگ بہادر حیدر آباد دکن میں اور دو بانکی پور کے مشرقی کتبخانہ میں ہیں۔ ان میں سے ایک علی گڈھ مسلم یونیورسیٹی لائبریری میں بھی ہے اور جس کا ذکر علامہ غلام حسین جونپوری نے جامع بہادر خانی میں کیا ہے۔

۱۔ تقریر التحریر یہ خواجہ نصیر الدین طوسی المتوفی ۶۷۲ھ کی "تحریر اقلیدس" کا فارسی ترجمہ ہے۔ محمد شاہ کے زمانہ میں ۱۱۴۲ھ میں ترجمہ جیسا کہ کتاب کے دیباچہ میں تصریح ہے اس نے ختم کیا۔ کتاب کا آغاز ان فقروں سے ہے۔

" شکر است مر خدائے را کہ از دست ابتدا بسوئے او ست انتہا
و بدست اوست اختیار ہمہ چیزہا "

نواب سالار جنگ بہادر (حیدر آباد دکن) کے کتبخانہ میں اسکا جو نسخہ ہے اس میں مترجم کا نام ابو الخیر بن لطف اللہ مہندس اور انڈیا آفس کے نسخہ (نمبر ۲۳۶) میں خیر اللہ خاں بن لطف اللہ مہندس درج ہے۔ جیسا کہ اسکی فارسی فہرست (جلد اول صفحہ ۱۲۳۴) سے معلوم ہوتا ہے پس حیدر آبادی نسخہ میں کتاب کا نام صاف "تقریر التحریر" تحریر ہے لیکن انڈیا آفس لائبریری کی فہرست میں اسکا نام "ترجمہ تحریر اقلیدس" لکھا ہے۔ حالانکہ یہ نام نہیں ہو سکتا۔ "تقریب التحریر" جس کا نام آگے آتا ہے اور جس کا نسخہ بانکی پور اور علی گڈھ کی لائبریریوں میں ہے اسکے دیباچہ میں مصنف کے فرزند نے

بھی اس کا نام "تقریر التحریر" بتایا ہے۔ جو بجائے خود اور دوسری تصنیفات
کے نام کی مشابہت سے بھی نہایت موزوں ہے۔ انڈیا آفس کے نسخہ کی
کتابت کی تاریخ ۲ رجب ۱۱۹۴ھ ہے۔ اسکے پہلے صفحہ پر ایک حاشیہ
ہے جس میں مذکور ہے کہ یہ نسخہ راجہ شتاب رام بہادر نے مسٹر رچرڈ جانسن
کے لئے لکھنؤ میں تیار کیا تھا۔ تعجب ہوگا کہ کبھی ہمارے بڑے لوگوں کا بیاضوں کا
شمار تھیں جن سے استفادہ کے انگریز شائقین علم بھی مشتاق تھے۔ حیدرآباد کے
نسخہ کو کسی شیخ احمد نے ۱۲۴۸ھ میں لکھا ہے۔

۲۔ تقریب التحریر۔ یہ خواجہ کی دوسری کتاب "تحریر مجسطی" کی فارسی
خلاصہ ترجمہ مع شرح ہے۔ مصنف کا نام اس میں ابو الخیر المعروف بہ
خیر اللہ خاں المتخلص بالمہندس ابن لطف اللہ ہے۔ کتاب کا آغاز یہ ہے:
"ثنائے کہ از اندازہ مہندس خرد بیرون است شایان صانعی
کہ خالق سبع سماوات است"
(فہرست کتب خانہ مشرقی بانکی پور جلد یازدہم ص ۴۱)

مصنف نے اسکے دیباچے میں بیان کیا ہے کہ تحریر اقلیدس کے ترجمہ کے بعد
اس نے یہ کتاب محمد شاہ (۱۱۳۱ھ ۔ ۱۱۶۱ھ) کی تخت نشینی کے اٹھار
ہویں سنہ (۱۱۴۹ھ) میں تالیف کی۔ اسکی شرح میں اکثر مولانا عبد العلی برجندی
کی شرح تحریر مجسطی سے مدد لی ہے۔ کتاب کا عام انداز یہ ہے کہ پہلے خواجہ طوسی
کے عربی متن کا ایک فقرہ ہے پھر اس کا فارسی ترجمہ۔ پھر حسب ضرورت
برجندی کی عربی شرح اور پھر خیر اللہ کی فارسی شرح ہے۔

اس کا ایک نسخہ بانکی پور کے مشرقی کتب خانہ میں ہے۔ ۲۰ شوال ۱۲۵۱ھ کتابت کا سال ہے۔ کتاب کا نمبر ۱۰۵ ریاضیات فارسی ہے اور دوسرا مسلم یونیورسٹی لائبریری (نمبر ۱ علوم فارسی) میں ہے۔ فہرست میں اس کا نام ترجمۂ مجسطی لکھا ہے۔ دونوں نسخے نظر سے گذرے ہیں۔

کتاب کا آغاز اس طرح ہے:-

یارب بیان کن بفضل شامل خود فتح بابہا؛ ای بسلطنت کامل محمود ساز انجام کتاب

قال الفاضل الکامل المحقق فالعامل الماہر المدقق استاذ الکل فی الکل جامع العلوم بالجمیل الشارح المترجم بالفارسیۃ ابو العلوم العربیۃ ابو الخیر المشتہر بخیر اللہ المخاطب بخیر اللہ خان سلمہ الرحمٰن المتخلص بالمہندس ابن لطف اللہ غفر لہم اللہ۔ الحمد للہ رب العالمین ...... اما بعد پوشیدہ نماند کہ چوں در سالف زمان تحریر اقلیدس کہ از محقق طوسی، بازیادت شرح بعض مقدمات بزبان پارسی برائے عموم فیض اتفاق افتادہ بود و بتقریب التحریر موسوم گردیدہ، خواست کہ برائے اتمام خدمت عباد اللہ ترجمہ تحریر مجسطی ہم کہ ازاں مدقق است با ایراد بعض فوائد مرقوم سازد چنانکہ بفضل الٰہی جل جلالہ و عم نوالہ مسودہ آں کتاب عظیم النفع در ثلث اخیر مدت سلطنت شاہ خلائق پناہ انجم سپاہ فردوس آرامگاہ محمد شاہ بادشاہ غازی علیہ الرحمۃ والرضوان فراغ دست دادہ بود و بتقریب التحریر مسمی شدہ بسبب عدم دریافت قدردانی ارکان در حیز تعویق

افتادہ بود بہ ترغیب بعض دوستان طالب این فن در اواسط سنہ احد جلوس (بادشاہ عالیجاہ احمد شاہ بہادر) از مسودۂ اتفاق شروع مبیضہ افتاد در سنہ یکہزار و یکصد شصت و یکم ہجری مقدسہ صلعم"

علی گڈھ کا نسخہ جابجا سے کرم خوردہ ہے اور بانکی پور کا نسخہ اچھا اور محفوظ ہے اوپر کی عبارت دونوں نسخوں کی تطبیق سے درست کی گئی ہے۔

خاتمہ کی عبارت دونوں میں یہ ہے۔

"بعد از بیان سعی در حل این کتاب و وصف خوبی ہائے آں اعتذار سہو و خطا و طلب دعائے خیر ختم بر صلوٰۃ و سلام حضرت رسالت پناہ را........ فارغ شدم از تحریر این شرح و تصحیح آں روز یکشنبہ اوائل ذی قعدہ سنہ نہصد ہشت و یک ہجریہ نبویہ..... بن لطف اللہ مہندس بن احمد"

"سنہ نہصد و ہشت و یک" سراسر تحریف ہے۔ یہ حقیقت میں ہزار و یکصد و شصت و یک" ہوگا کہ یہی سال محمد شاہ کی وفات کا ہے۔ اور اس نسخہ کے آغاز میں تصریح ہے کہ اس وقت بادشاہ ممدوح کی وفات ہو چکی تھی۔ گویا کتاب کا مسودہ محمد شاہ کی زندگی میں تیار ہو چکا تھا۔ مگر ارکان سلطنت کی ناقدر دانی سے یہ پڑا رہا۔ بالآخر شاہ مرحوم کی وفات پر ریاضی کے شائقین کے اصرار سے احمد شاہ کے پہلے سال جلوس میں اس کا یہ مبیضہ تحریر میں آیا۔

۳۳ حاشیہ بر شرح بیست باب در معرفت اسطرلاب } "بیست باب در اسطرلاب"

خواجہ نصیر طوسی کا ایک مشہور رسالہ ہے۔ اسکی شرح علامہ عبد العلی برجندی نے سنہ ۸۸۹ھ میں لکھی اس پر خیر اللہ مہندس نے یہ حاشیہ لکھا ہے۔ یہ حواشی بانکی پور لائبریری کی شرح بست باب کے نسخہ نمبر ۱۰۴۵ کے کناروں پر لکھے ہوئے موجود ہیں اس پر محشی کا نام حسب ذیل تحریر ہے۔

"خیر المہندسین ابو الخیر نجم المخاطب بخیر اللہ خان مہندس"

اس نسخہ کی کتابت کا سال ۲ جمادی الاخری سنہ ۱۱۶۵ھ ہے (فہرست کتبخانہ مذکورہ جلد ۱۱ ص ۶۲) جو مصنف کی زندگی کا زمانہ ہے۔

۴ شرح زیچ جدید محمد شاہی

راجہ جے سنگھ سوائی بانی جے پور و صوبہ دار آگرہ و مالوہ (المتوفی سنہ ۱۱۵۶ھ / ۱۷۴۳ء) نے محمد شاہ بادشاہ دہلی کے حکم سے دہلی۔ جے پور۔ اجین۔ بنارس اور متھرا میں رصد خانے قائم کیے تھے۔ اور جن کے بنانے میں علاوہ دوسرے ہندو مسلمان اور انگریز ہیئت دانوں کے یہ خیر اللہ مہندس بھی شریک تھا ان رصد خانوں کی تحقیقات خود راجہ کے نام سے زیج محمد شاہی کے عنوان سے سنہ ۱۱۴۱ھ میں تصنیف ہوئی تھی۔ خیر اللہ نے اس زیچ کی ایک شرح لکھی جس میں جا بجا اس نے تشریحات اور استدلالات میں اپنے ذاتی مشاہدوں کا ذکر کیا ہے۔ اس شرح مذکور کا حوالہ علامہ غلام حسین جونپوری نے اپنی مشہور تصنیف جامع بہادر خانی میں دیا ہے۔

"مرزا خیر اللہ مہندس در شرح زیچ محمد شاہی دعوی فرمودہ است کہ ما مدار خارج المرکز شمس بلکہ مدارات جمیع حوامل را بر شکل بیضوی یافتہ ایم"

۵۔ شرح زلالی و شرح حافظ و شرح سکندر نامہ خیر اللہ کو اپنے خاندان کے موروثی جوہر سخن وری سے بھی حصہ ملا تھا۔ اس ذوق کا یہ اثر تھا کہ اس نے دیوان زلالی اور دیوان حافظ کی شرحیں لکھیں۔ ان شرحوں کا ذکر اس کے بیٹے نے تقریب التحریر کے دیباچہ میں کیا ہے۔

اسی قسم کی اس کی ایک اور کتاب سکندر نامہ کی شرح ہے۔ یہ دو جلدوں میں تمام ہوئی ہے اور عجیب تر یہ ہے کہ پرانے زمانہ میں وہ چھپ بھی چکی ہے اس کی دوسری جلد جامعہ ملیہ دہلی کے کتبخانہ میں نظر سے گذری۔ یہ مطبع شرف المطابع دہلی میں سنہ ۱۲۹۸ھ میں طبع ہوئی تھی۔ اس پر مصنف کا نام ملقب مرزا خیر اللہ خان مہندس خیر الشارحین لکھا ہے۔

محمد علی ریاضی بن خیر اللہ مہندس خیر اللہ مہندس نے اپنی ایک جسمانی یادگار بھی چھوڑی۔ جس کا نام محمد علی ہے۔ یہ بھی اپنے خاندان کے موروثی علوم ریاضی و ہندسہ کا امانت دار تھا۔ اور اسی لیے "الریاضی" کے لقب سے مشہور ہوا۔ اس کے باپ نے اپنی کتاب "تقریب التحریر" مسودہ کی حالت میں چھوڑی تھی اور مبیضہ کا صرف دیباچہ لکھا تھا۔ وہ دوسری کتابوں کی تصنیف اور طلبہ کے درس و تدریس میں مصروف ہو گیا۔ محمد علی نے اس کتاب کو صاف کر کے اشاعت و استفادہ کے قابل بنایا چنانچہ اس کتاب پر خود محمد علی نے ایک دیباچہ بڑھایا ہے جس میں یہ واقعہ درج کیا ہے۔

"می گوید بندۂ خاکسار ذرۂ بے مقدار الراجی الی رحمۃ ربہ القوی
محمد علی الریاضی آنکہ چوں والد ایں احقر العباد بتحریر اقلیدس
شرح مبسوط معنی کہ مسمّٰی بتحریر التحریر است بزبان فارسی نوشتند
...... خواستند کہ بر تحریر کتاب مجسطی کہ مشکل ترین کتب ہیئت
است یا براہین ہندسی در دیں رصد بے نظیر است کہ دست فکر
ہر کس از ریاضی داں بدامن مطالبش نمی تواند رسید و زور خیال
ہر یکے از ہیئت داں لنگر معانیش نتواں جنبانید۔ نیز
شرح بزبان فارسی با فوائد دیگر نویسند کہ برائے ہر طالبے
بکار آید ...... در آخر سلطنت فردوس آرامگاہ محمد شاہ
مسودہ آں تمام تحریر یافتہ۔ و بسبب بعضے از موانع کہ
شغل مطالعہ کتب دیگر باشد و عدم فراغ اندیشہ امور معیشہ
آں در تعویق افتاد۔ الحال من بے بضاعت عاکفہ
زاویۂ جہالت خصوصًا در علم ریاضی کہ در آں ریاضتے
مشقتے نہ کردہ، و آشنائے مبادیا ناساختہ و از نتیجۂ ریاض ریاضی
بودند والد گرامی خواست کہ آں مسودہ را مبیضہ نویسد۔
بحسب آنچہ در خاطر فاتر ایں ناقص در آید ثبت نما......"

اس کے بعد خیر اللہ کے مبیضہ کا دیباچہ ہے جو اوپر نقل کیا جا چکا
ہے۔ اس کے بعد محمد علی کی یہ عبارت ہے۔

"مترجم می گویم کہ ایں اختلاف تاریخ بہ مبیضہ ساختن تا

نوشتن دیباچہ بود، و زیادہ ازاں سبب بعضے از مشاغل اتفاق نیفتاد چنانچہ ساختن شرح زلالی و شرح خواجہ حافظ و درس کتب ریاضی این حقیر فقیر خواست کہ تا این محنت ضایع نشود جرأت در نوشتن مبیضہ نمود و الا چہ نسبت خاک را با عالم پاک ....."

محمد علی ریاضی احمد معمار کے سلسلۂ نسل کی آخری کڑی ہے جس کا حال ہمیں معلوم ہو سکا ہے۔ اور اسی نام پر اس خاندان کے تذکرہ کا خاتمہ ہوتا ہے جس نے کم از کم سوا سو برس تک لاہور اور دہلی میں تعمیرات ہندسہ ریاضی وغیرہ کی زندہ جاوید خدمتیں انجام دیں۔

اس تفصیل کے بعد ضروری ہے کہ لطف اللہ مہندس کی اس مثنوی کو مسلسل یکجا نقل کر دیا جائے جس میں اس نے اپنے باپ اور بھائیوں کا اور خود اپنا حال لکھا ہے تاکہ اب ناظرین کو اس کی خاندانی حیثیت کے واضح ہو جانے کے بعد اسکی صداقت بیان کا پورا وثوق ہو جائے اور معلوم ہو جائے کہ تاج اور لال قلعہ کی عمارتوں کا اصل معمار اور مہندس کون تھا

شاہ جہاں داور گیتی ستاں　　روشنی دودۂ صاحب قراں
عرش بریں قبۂ خرگاہ اوست　　رشک فلک سدۂ درگاہ اوست

احمد معمار کہ در فن خویش　　بد قدم از اہل ہنر بود بیش،
واقف تحریر و مقالات آں　　آگہ اشکال و حوالات آں
حال کواکب شدہ معلوم او　　سر مجسطی شدہ مفہوم او

از طرف داور گیتی جناب نادر عصر آمده اورا خطاب
بود عمارت گر آن بادشاه داشت دران حضرت فرخنده راه
آگره چو شد مضرب رایات شاه بس که برو بود عنایات شاه
کرد بحکم شه کشور کشا روضهٔ ممتاز محل را بنا
باز بحکم شه انجم سپاه شاه جهان داور گیتی پناه
قلعهٔ دهلی که نه دارد نظیر کرد بنا احمد روشن ضمیر
این دو عمارت که بیانش دهم در صفتش خامه روان کرده ام
یک هنر از گنج هنرهای اوست یک گهر از کان گهرهای اوست
چون بشود عالم فانی مقر کرد سوی عالم باقی سفر
پس سه پسر ماند ز مرد سترگ زان سه عطاء الله رشیدی بزرگ
نادر عصر خود و مشهور شهر عالم و علامه و دانای دهر
مرد هنرپرور و استاد فن فاضل و دانشور و حبر زمن
مخزن علم آمده تالیف او گنج هنرهاست تصانیف او
نثر وی از آب روان پاکتر نظم خوشش غیرت سلک گهر
منکه سخن پرور و دانش ورم بندهٔ آن حبر سخن پرورم
منکه ربودم ز جهان گوی علم از چمنش یافته ام بوی حلم
منکه شده آگه سر نهان از دم او یافته ام قوت جان
ثانی آن هر سه برادر منم بنده یکی فن بود از صد فنم
گرچه مهندس لقبم از شه است نام من دل شده لطف الله است

ثالث آن هر سه برادر بیمثال　　آمده نور الله صاحب کمال
با همه در معمای عمارت کریم　　با همه استاد و سخن پرور کریم
لیک بود قصر کلامش عجب　　زان شده معمار مر او را لقب
گرچه کم است سال وی از سال من　　بیش بود حال وی از حال من
نثر وی از نظم گهربارتر　　نظم ز نثر آمده هموارتر
دیده ز نور سخنش پر ضیا　　طبع ز لطف سخنش پر صفا
گنج گهر آمده در مشت او　　هفت قلم رانده سر انگشت او
گرچه همه هست سخن استاد فن　　آن یکی زین یک بود استاد من

گرچه مرا هست مهندس لقب
سند من زان هر سه برادر طلب

عربوں کی بحری تصنیفات

عرب جہاز رانوں کے پاس ستاروں کی شناخت، ہواؤں کی دریافت، اور ملکوں اور جزیروں کی واقفیت، اور سواحل کے طول و عرض بلد کا علم سفینوں سے زیادہ سینوں میں محفوظ رہتا تھا اور غالباً یہ علم موروثی ہوتا تھا جو باپ سے بیٹے کو منتقل ہوتا تھا لیکن اس کے باوجود ہر جہاز ران کے پاس سمندروں کا اور ان کے ساحلی شہروں اور جزیروں کا ایک نقشہ ہوتا تھا جسکو بحر روم والے کمپاس[1] اور خلیج فارس اور بحر سند والے رہبان اور اسکو عربی میں بگاڑ کر رہمانی کہتے تھے[2]۔ اسی قسم کے راہناموں کی تالیف و تدوین سے اس فن کی کتابوں کا آغاز ہوا۔ ابن ماجد نے لیث بن کہلان کے ہاتھ کا ایک راہنامہ جس پر ۵۸۰ھ لکھا ہوا تھا، دیکھا تھا۔ حضرت علیؓ کی طرف ایک مثنوی (ارجوزہ) منسوب ہے جس میں منازل فلکی اور ستاروں کے اشکال نظم کئے گئے ہیں (ص ۱۶۳ پیرس)

---

[1] مقدمہ ابن خلدون جغرافیہ مصر۔ الفوائد ۲۷ [2] الفوائد ابہد ۳

اس قسم کے راہنماؤں کے دو اور مؤلف محمد بن شاذان اور سہل ابان تھے ان کا آغاز انا فتحنا لک فتحا مبینا کی متبرک آیت سے کیا گیا تھا لیکن نہ اس میں اشعار تھے اور نہ ہر مقام کا ستاروں کے ذریعہ سے اندازہ تھا۔ اس قسم کی صرف ایک کتاب ابن ماجد کو ملی تھی مگر اس کا اول و آخر نہ تھا۔ اور نہ اس کے معلومات صحیح[1] تھے۔ ابن ماجد نے اپنی کتاب الفوائد میں محمد بن شاذان کی تصانیف کا نام دو تین مقاموں پر لیا ہے[2] جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسکی کتابوں کو بھی اس باب میں کچھ اہمیت حاصل تھی۔ لیث بن کہلان۔ محمد بن شاذان اور سہل بن ابان کی کتاب کا ذکر ابن ماجد نے حاویۃ الاختصار کے ان شعروں میں بھی کیا ہے[3]۔

ونظمنا تالیف ابن کہلان وسہل واللیث بن ابان
ذوی النہی ومصلحین الشان زخرفت بالی لہم الجنان

اس قسم کے اشعار میں عرب ماخذوں کی تمام معلومات نظم کر دیتے تھے جن کو جہازران یاد کر لیتے تھے اور یہ سرمایہ ایک سے دوسرے کو منتقل ہوتا رہتا تھا[4]

بزرگ بن شہریار ناخدا کی تصنیف عجائب الہند جو چوتھی صدی کے وسط میں لکھی گئی ہے جہازرانوں کے صرف حکایات و مشاہدات پر مشتمل ہے البتہ مسعودی کے بیانات جو اسی زمانہ میں اس نے مروج الذہب کے مقدمہ میں مرتب کئے ہیں وہ بہت حد تک محققانہ ہیں۔ ایک جہازران احمد بن تیرویہ نے

---

[1] الفوائد ص۳ [2] الفوائد ص۱۲ و ص۳۱ [3] الفوائد ص۸۹ [4] العمدۃ المہریہ سلیمان مہری ص۱۱

جو چوتھی صدی میں غالباً تھا اس فن پر کچھ کتابیں لکھی تھیں خواشیر بن یوسف بن صلاح الارکی کی بھی کوئی کتاب تھی۔[1] یہ چوتھی صدی میں ہندوستان تک آتا تھا لیکن فن کی حیثیت سے اس پر محمد بن عمر اور اسکے بیٹے[2] ماجد بن محمد ابن عمر جو غالباً آٹھویں صدی کے اواخر اور نویں صدی کے وسط میں تھے بحر قلزم اور بحر عرب پر ایک دو رسالے اور منظومے لکھے تھے۔ ماجد بن محمد بحر قلزم کا بڑا ماہر جہاز ران تھا۔ جہازی اسکو ربان البرین کہتے تھے۔ اسکے ایک منظوم رسالہ کا نام حجازیہ ہے جس میں ہزار شعر تھے[3]۔ ماجد کے بیٹے احمد بن ماجد نے نویں صدی اور سلیمان مہری نے دسویں صدی کے وسط میں بکثرت کتابیں اور رسالے لکھے۔ ان دونوں کی کتابیں پیرس کے قومی کتبخانہ میں تھیں جنکو ۱۹۲۸ء میں عکس لے کر مع ایک فرنچ ضمیمہ کے تین جلدوں میں شایع کیا گیا ہے۔

اس فن کا سب سے پہلا مدوّن اسد البحر شہاب الدین احمد بن ماجد بن محمد بن عمر بن فضل بن دویک بن یوسف بن حسن بن حسین بن ابی مخلق سعدی بن ابی البرکات نجدی ہے۔ جہاز رانی اسکا موروثی پیشہ تھا۔ اس نے اپنی کتاب "الفوائد فی اصول علم البحر والقواعد" ۸۹۵ھ[4] میں پچاس برس کے تجربہ[5] کے بعد لکھی ہے۔ اس فن میں اسکے نظم و نثر رسائل اور تصنیفات کی تعداد ۲۵ ہے جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

---

[1] الفوائد ص۳ [2] الفوائد ص۵ [3] آخر الفوائد [4] الفوائد ص۴ [5] الفوائد

شمار	کتاب کا نام	مضامین
	الفوائد فی اصول علم البحر والقواعد	یہ کتاب بارہ فائدوں پر مشتمل ہے۔ پہلا فائدہ چاند کی منزلوں اور برجوں کی تقسیم میں۔ دوسرا جہازوں کے ضروری معلومات وصفات میں۔ تیسرا ستاروں کی مشہور شکلوں میں۔ چوتھا منازل قمر اور خانوں[۱] میں۔ پانچواں ریاضی و فلکی علوم کی ضروریات میں۔ چھٹا دیرہ میں۔ ساتواں ہواؤں میں۔ آٹھواں جہاز کے انتقالات اور سمندروں کے سواحل میں۔ نواں ستاروں سے ملکوں کی شناخت اور تین قسم کے جہاز رانوں کے بیان میں۔ دسواں مشہور جزیروں میں۔ یعنی جزیرۂ عرب۔ جزیرۂ القمر جسکا دوسرا نام مڈگاسکر ہے۔ سوماترہ۔ جاوہ غور۔ سیلون۔ زنجبار۔ بحرین۔ جزیرہ ابن جاوان اور سقوطرہ۔ گیارہواں موسموں میں۔ بارہواں بحر احمر کی شاخوں اور جزیروں میں۔ مصنف نے اس کتاب میں جا بجا قطب نما کا حوالہ دیا ہے۔
	حاویۃ الاختصار فی اصول علم البحار	یہ کتاب ارجوزہ یعنی منظوم مثنوی ہے۔ اس میں گیارہ فصلیں ہیں۔ پہلی میں ان اشارات کا ذکر ہے

---

[۱] دائرہ افقیہ کے ۳۲ حصوں میں سے ہر حصہ کو خن (خانہ) کہتے ہیں۔ العمدۃ المہریہ سلیمان مہری ص ۱۲

شمار	کتاب کا نام	مضامین
		جن کی ضرورت جہازرانوں کو ہے۔ دوسری میں منزلوں اور رخانوں کا بیان۔ تیسری مختلف قوموں کی جنتریوں میں۔ چوتھی بعض ستاروں میں پانچویں عرب۔ حجاز۔ سیام۔ افریقہ۔ خلیج بربر سومال۔ اور جزائر قمر (مڈگاسکر) کے تعین مقام میں چھٹی عجم۔ ہندوستان بنگالہ سیام۔ جزیرہ مہراج اور چین میں۔ ساتویں سوماترہ۔ مڈگاسکر یمن۔ سواحل حبشہ۔ سومال۔ مکران میں۔ آٹھویں عرب کی خشکی سے ہندوستان کی خشکی تک کے حسابات میں۔ نویں بحر ہند کے سواحل میں۔ دسویں اس بحر محیط کے بہاؤ کے بیان میں جو ہندوستان۔ چین اور افریقہ کے بیچ میں ہے۔ گیارہویں اس تقویم میں جس سے شب و روز کے اوقات کا شمار اور طوفانوں کی آمد کا حساب معلوم ہو۔
۲	[illegible] المعربیہ	خلیج بربر سے باب الہند (المندب) ملک عرب اور [illegible] افریقہ کا قیاس۔
۳	[illegible] الاسلام [illegible]	دنیا کے ہر حصہ اور خطہ سے قبلہ کی

شمار	کتاب کا نام	مضامین
۵	ارجوزہ برّ العرب ارجوزہ فی قشمۃ	تعیین کا طریقہ۔ مصنف اس علم میں تکمیل کی اولیت کا دعوی کرتا ہے۔ خلیج فارس سے ملک عرب۔
۶	الجمہ علی النجم بنات نعش	بنات النعش کے ستاروں میں۔
۷	کنز المعالہ	سمندر کے نامعلوم امور اور ستاروں اور برجوں اور ان کے ناموں میں برّ سندھ اور برّ عرب۔
۸	ارجوزہ	
۹	ارجوزہ میمیہ	
۱۰	ارجوزہ مخمسہ	
۱۱	ارجوزہ	رومی مہینوں کے شمار میں۔
۱۲	ارجوزہ ضریبۃ الضرائب	
۱۳	قصیدہ مکیہ	مکہ سے جدہ، قمرنک، کالیکٹ، دیبل، وسندھ کوکن۔ گجرات اور ہرمز تک۔
۱۴	نادرۃ الابدال	
۱۵	ذہبیہ	بعض آلات کے بیان میں۔ اور متفرق رسائل متفرق بحری و فلکی مباحث میں

سلیمان مہری دسویں صدی کے شروع میں تھا۔ اس نے پہلے رسالہ علم التواریخ کے مقدمہ میں سنہ ۹۱۷ھ کا حساب لگایا ہے۔ اور اسکی کتاب العمدۃ المہریہ سنہ ۹۱۷ھ کی تالیف ہے۔ تصانیف کی فہرست یہ ہے۔

شمار	کتاب کا نام	مضامین
١	قلادۃ الشموس فی حل التواریخ	مختلف قوموں کی جنتریوں اور سال ناموں کی تشریح
٢	تحفۃ الفحول فی تمہید الاصول	جہاز رانوں کے بعض اصطلاحات کی تشریح بحر خلیج فارس۔ بحر عرب۔ اور بحر ہند کے ایک جزیرہ اور بندر کا تعین ستاروں کی سمت اور سیدھ سے، اس کتاب میں مدراس گجرات اور سندھ کے بندرگاہوں کے ساتھ بنگالہ اور اسکے بندرگاہ چاٹگام (شاتی جام) کا نام بکثرت آتا ہے۔ ابن ماجد کے یہاں بنگالہ (بنجالہ) کے بجائے بنگ (بنج) نام آیا ہے۔
٣	العمدۃ المہریہ فی ضبط العلوم البحریہ	یہ سلیمان کی سب سے بہتر تصنیف ہے۔ کتاب سات بابوں پر منقسم ہے۔ پہلا باب جہاز رانوں کی اصطلاحات اور فلکی معلومات پر ہے۔ دوسرا ستاروں کے ناموں اور قطب شمالی، جاہ، فرقد

شمار	کتاب کا نام	مضامین
		ہیج کو دیکھ کر آنکھوں پر انگلیوں کو رکھ کر مسافت دریافت کرتے ہیں۔ تیسرا عجم۔ جزائر عجم۔ برّ عرب۔ زیلع۔ سوال، سیام۔ چین اور ماچین کی سیدھ کی دریافت ہیں۔ چوتھا جزیرہ قمر و مدگاسکر) جزیرہ زرین۔ جزیرہ سقوطری جزیرہ فال۔ جزائر دیبہ۔ جزیرہ سیلون۔ جزیرہ انڈمان۔ جزیرہ ناگ باری۔ جزائر سیام۔ جزیرہ سوماترا۔ جزیرہ جاوا۔ اور جنوبی مشرقی جزیروں کے چلنے میں۔ پانچواں عرب عجم و ہند۔ اور اور جزائر کے راستوں میں۔ چھٹا موسموں کی شناخت میں۔ ساتواں بحر فارس اور بحر عرب کے جزیروں میں اور حسب ذیل بندرگاہوں سے دوسرے بندرگاہوں تک سفر میں۔ باب المندب سے کوہ قمر اور سیبان تک سیبان سے جدہ تک سیبان " سواکن " سواکن " عدن " زیلع (اریٹیریا) " گجرات "

شمار	کتاب کا نام	مضامین
		عدن سے گجرات تک
		بربرہ " " "
		کشن " " "
		خلفات " " "
		ظفار (یمن) سے " "
		کلہاٹ " " "
		عدن " ٹیبار (ٹیبارم) "
		عدن " ہرمز "
		دیو " مشقاس "
		دیو " شحر اور عدن "
		چیام (بمبئی) اور چیول سے ساحل عرب "
		دیو سے دیپ "
		دیبل (سندھ) " دیپ "
		دیو " مسکت (مسقط) "
		کنبایت (کاٹھیاواڑ) سے عدن "
		دیبل (سندھ) " عدن "
		سندر پور " عدن "
		سندر اور باو قلا " عدن "

شمار	کتاب کا نام	مضامین
		کالیکٹ سے گردفن تک دیو سے ملاکا " دیو " بنگالہ یعنی چاٹگام " ملاکا " عدن " چاٹگام " ساحل عرب " خاتمہ۔ چند ہدایات۔
۴	المنہاج الفاخر فی علم البحر الزاخر	اس کتاب میں ایک مقدمہ، چھ باب اور خاتمہ ہیں۔ مقدمہ مصنف کے اختیار کردہ فلکی و نجومی امور کی دریافت میں۔ پہلا باب ان مشہور سمندروں کی سیدھ کے جاننے میں جو جزیروں سے آباد ہیں، دوسرا قیاسات میں، تیسرا جزیروں کی شناخت میں، چوتھا جاہ اور فرقدین کے قیاس پر مسافت دریافت کرنے میں۔ چھٹا خشکیوں کی علامتوں میں، ساتواں برج اور منازل میں آفتاب اور ماہتاب کے داخل ہونے میں۔ خاتمہ۔ بعض بندگاہوں کے سفر میں۔

سلیمان کی دو کتابیں العمدۃ المہریہ فی ضبط العلوم البحریہ

اور المنہاج الفاخر فی علم البحر الزاخر کا ایک عمدہ قلمی نسخہ ۱۰۰۶ھ کا لکھا ہوا اسلامیہ کالج پشاور کے کتبخانہ میں ہے۔ کتبخانہ کی مطبوعہ فہرست کے ص۳۱۷ میں نمبر ۱۹۳۵ پر اس نسخہ کا ذکر ہے۔ تحفۃ الفحول کا نام چلپی کی کشف الظنون میں بھی ہے[1]

ابن ماجد او سلیمان کی تصنیفات سے عربوں کے علاوہ ترک اور ہندوستانی جہاز رانوں نے بھی فائدہ اٹھایا۔ ترکی امیر البحر سیدی علی نے جو بہادر شاہ گجراتی اور ہمایوں کے زمانہ میں ترکی بیڑہ کو بحر سند میں اور گجرات کے سواحل پر پرتگالی جہازوں سے لڑنے کیلئے لایا تھا محیط کے نام سے ترکی جہاز رانی کے فن پر ایک محققانہ کتاب لکھی ہے۔ اس میں ابن ماجد اور سلیمان مہری کی تصانیف سے پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ اور اس کے مقدمہ میں ان دونوں کی پوری تعریف و توصیف کی ہے[2]

جامع مسجد بمبئی کے کتبخانہ میں اس فن پر سندھی زبان میں دو کتابیں ہیں پہلی جو کسی عربی کتاب کی شرح ہے شروع سے کچھ ناقص ہے۔ جا بجا عربی فقرے اور عنوانات ہیں مثلاً معرفۃ ابعاد الکواکب المشہورۃ عند الجمہور بعد المجاہ عن نقطۃ الکرۃ سبع وثمانون درجۃ۔ کہیں

---

[1] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں شہاب الدین (ابن ماجد) اور سلیمان المہری کے مقالات میں ان دونوں معلموں کے مختصر حالات اور انکی کتابوں پر پورا تبصرہ موجود ہے۔

[2] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام مقالہ شہاب الدین۔

کہیں فارسی بھی ہے۔ ہر عنوان معرفت کے لفظ سے شروع ہوتا ہے۔ اور سرخی سے لکھا ہوا ہے۔ ایک جگہ معلم سلیمان کا نام بھی آیا ہے۔ صحیح قول معلم سلیمان۔ اس کتاب میں جزیروں کے نام اور مقامات کے فاصلے درج ہیں۔ قرینہ سے یہ کتاب سنہ ۱۰۵۴ھ کی تالیف معلوم ہوتی ہے۔

دوسری کتاب سندھی اور فارسی میں مخلوط ہے۔ یہ مکمل اور مفصل ہے یہ نسخہ بارہویں صدی ہجری کے ایک مسلمان جہاز ران معلم عنایت بن معلم شیخ داکو کے قلم کا لکھا ہوا ہے۔ نسخہ کے آخر میں کاتبہ ممالکہ فقیر الحقیر پر تقصیر معلم عنایت بن معلم شیخ داکو در جزیرۂ بمبئی ماہ رجب۔ سنہ نہیں لکھا ہے۔ مگر اندرونی شہادت سے سنہ ۱۱۹۶ھ معلوم ہوتا ہے۔ درمیان میں کچھ روزنامچہ بھی لکھا ہوا ہے۔

اسی قسم کی ایک گجراتی یا کوکنی زبان کی کتاب کا ذکر مجھ سے سنہ ۱۹۳۰ء میں جناب یوسف کھٹکے صاحب بی۔ اے (بمبئی) نے کیا تھا۔ جو ان کی ملکیت میں تھا۔ مگر افسوس ہے کہ انکی وفات کے بعد مجھے اس کتاب کا پتہ نہیں چلا۔

یہ کل تصنیفات خلیج فارس سے لے کر ہندوستان اور چین تک کے سواحل اور جزیروں سے متعلق ہیں۔ بحر روم میں جہاز رانی کے عنوان سے سب سے مشہور کتاب بحریہ ہے جو ترکی میں لکھی گئی ہے اور جس کا مصنف مشہور ترکی امیر البحر پیری بن حاجی محمد مقتول سنہ ۹۶۲ھ ہے۔ اس نے اس میں بحر روم (بحر متوسط۔ میڈیٹیرین سی) کے

حالات اور اس کے جزیروں راستوں اور بندرگاہوں کو مع نقشوں کے منضبط کیا ہے۔ سنہ ۹۳۰ھ میں اس نے یہ کتاب لکھ کر سلطان سلیمان اول کی خدمت میں پیش کی۔ اس کے شروع میں دنیا کے نقشوں اور بحر ہند کے ملاحوں کے اصول و قواعد کا ذکر کیا ہے[1]

---

[1] کشف الظنون چلپی، نام ”بحریہ“۔

عرب اور امریکہ

عام طور سے مشہور ہے کہ امریکہ کو کولمبس نے سنہ ۱۴۹۸ء میں دریافت کیا ہے۔ یہ شہرت اس لحاظ سے تو صحیح ہے کہ عام متمدن پرانی دنیا کو اس نئی دنیا سے پوری واقفیت اسی وقت سے ہوئی اور اسی کے بعد سے دونوں میں میل جول اور ہر قسم کے علمی و تمدنی و تجارتی تعلقات قائم ہوئے یہاں تک کہ آج نئی اور پرانی دنیا ایک گھر کے دو آنگن بن گئے ہیں مگر یہ صحیح نہیں کہ کولمبس سے پہلے اس نئی دنیا میں پرانی دنیا کی کسی نووارد قوم یا اشخاص کے قدم نہیں پہونچے

یہ مسئلہ کہ امریکہ تک کبھی عرب جہازران پہنچ چکے تھے، گو ہندوستان میں نیا ہو مگر مصر کے بعض ممتاز فاضلوں نے اس پر مختلف اوقات میں بحثیں کی ہیں۔ علامہ زکی پاشا نے سسلی کے عرب جغرافیہ نویس ادریسی المتوفی سنہ ۵۶۰ھ کی نزہۃ المشتاق فی اختراق الآفاق کا ایک حوالہ پیش کیا تھا۔ جس میں بحر ظلمات میں اندلس کے چند عرب نوجوان جہازرانوں کے جہاز چلانے کا ذکر ہے مگر ابھی تک نہ تو مصر میں اور نہ ہندوستان میں اس مسئلہ کے تمام اطراف پر بحث کی گئی ہے اور نہ تمام

ممکن مواد یکجا فراہم کیا گیا ہے۔

اس سلسلہ میں حسب ذیل باتیں تنقیح کے قابل ہیں:۔

۱۔ کیا عربوں نے اور زیادہ عام لفظوں میں کیا مسلمانوں نے "ربع مسکون" کے پرانے نظریہ کی تقلید کی تھی۔

۲۔ کیا ان کو زمین کی گولائی اور اسکے تحتانی اور فوقانی حصوں کا علم تھا۔

۳۔ کیا ماوراے بحر ظلمات انھوں نے پہنچنے کی کوشش کی۔

۴۔ کیا آج کل کے نئے محققین اس نظریہ کو قبول کرسکتے ہیں۔

ذیل کی سطروں میں ان میں سے ہر ایک مسئلہ پر تلاش وفکر کے نتیجے پیش کرتا ہوں۔

ربع مسکون بطلیموس نے دو خطوں کے تقاطع سے روئے زمین کے چار برابر حصے کئے تھے۔ ایک خط قطب جنوبی سے قطب شمالی تک فرض کیا تھا اور دوسرا زمین کے بیچ سے آفتاب کے بالمقابل پہلے خط کو کاٹتا ہوا (اسکو خط استوا کہتے ہیں) وسط افریقیہ سے گذرتا ہے۔ اس طرح دو خطوں کے تقاطع سے زمین کے چار فرضی حصے ہوئے دو شمالی اور دو جنوبی اور خط استوا ان دونوں شمالی اور ان دونوں جنوبی حصوں کے بیچ سے گذرتا ہے بطلیموس کی رائے یہ ہے کہ انسانی آبادی روئے زمین کے ان چار حصوں میں سے صرف ایک شمالی حصے میں ہے اسی کو اصطلاح میں ربع مسکون کہتے ہیں یعنی چوتھائی حصہ (ربع) جو آباد ہے

(مسکون) باقی تین چوتھائی حصے زیادہ تر سمندروں میں غرق ہیں اور کچھ گرمی اور سردی کی غیر معتدل شدت کے سبب سے سکونت کے قابل نہیں۔

مسلمانوں نے شروع میں بطلیموس کے اس نظریہ کو بعینہ تسلیم کیا لیکن بہت جلد وہ اس پر شکوک اور اعتراضات وارد کرنے لگے۔ بطلیموس کے حامیوں نے اسکی رائے کی صحت پر فلسفیانہ اور طبعی دلائل گھڑ کر کھڑے کئے مگر دوسروں نے انکو توڑ دیا۔ اور ایک مدت تک یہ مناظرہ گرم رہا۔ بیرونی۔ ابن رشد۔ طوسی۔ قطب شیرازی۔ شریف جرجانی۔ برجندی، قوشجی اور چغمینی کی تصنیفات میں زمین کی ہیئت کے باب میں یہ بحثیں مذکور ہیں۔ میں یہاں مثال کے لیے نصیر طوسی المتوفی ۶۷۲ھ کے تذکرہ اور اسکی شرح توضیح التذکرہ مولفہ نظام اعرج (تالیف ۷۱۱ھ) اور اسکے حاشیہ سے کچھ عبارتیں نقل کرتا ہوں۔

وهذا التقسيم غير صحيح فاسد ايضا لانا ما رأينا لهم في هذه المقالة شبهة فضلا من حجة فعلى هذا يحتمل ان يكون في الارباع الباقية عمارات كثيرة لم يصل الينا خبرهم لما بيننا وبينهم من البحار المغرقة والجبال

یہ تقسیم صحیح نہیں، غلط ہے۔ اسلئے کہ انکے دعوی کے ثبوت میں کوئی شبہہ بھی میں نے نہیں پایا چہ جائیکہ کوئی دلیل انکے پاس ہو۔ اس بنا پر یہ بالکل ممکن ہے کہ زمین کی باقی چوتھائیوں میں بہت سی آبادیاں ہوں جن کی خبر ہم تک اس لئے نہیں پہونچی کہ ہمارے اور ان کے

الشاهقة	کے درمیان جدا کر دینے والے سمندر
(نسخۂ قلمی دار المصنفین)	اور بڑے بڑے پہاڑ ہوں۔

اسی طرح جنوبی حصہ میں آفتاب کی شدت گرمی کے سبب سے عدم آبادی کا جو پرانا نظریہ تھا اس پر بھی ضرب کاری لگائی اور کہا۔

لجواز ان یکون مسکونا و لا	اس امکان کے سبب سے کہ وہ
یصل الینا خبرهم للبحار	بھی آباد ہوں اور ہم تک ان کی خبر
العظیمة والجبال الشاهقة	اس لئے نہ پہنچی ہو کہ بڑے بڑے
الشاهقة المانعتان من ان	دریا اور پہاڑ بیچ میں حائل ہوں
یصل خبرهم	جو ان کے حالات ہم تک پہنچنے
(کتاب مذکور)	سے مانع ہوں۔

آخر میں اس نظریہ کی کہ صرف "ربع مسکون" ہی کیوں کھلا ہوا ہے اعتراض اور جواب کے بعد بظاہر کوئی سنجیدہ دلیل نہ پاکر کہا۔

وبالجملة لیس لانکشاف	حاصل یہ کہ زمین کے شمالی چوتھائی
هذا القدر المذکور من	حصہ کے صرف کھلے ہونے کا
الارض ای الربع المسکون	عنایت الٰہی کے کوئی سبب معلوم
الشمالی سبب معلوم غیر	نہیں ورنہ کوئی دلیل اس پر
العنایة الالهیة والا لما	نہیں کہ کیوں ایک ہی شمالی چوتھائی
فضل احد الربعین الشمالیین	حصہ آبادی اور رہنے کے لائق ہو
بها ای بالعمارة والسکنی	اور دوسرا نہ ہو حالانکہ اس کے

دون الأخر مع تساوی	سب حصوں کی وضع (پوزیشن)
ارتفاعهما بالقیاس الی	فلکیات کی نسبت سے برابر ہے۔
السماویات۔ (کتاب مذکور)	

شارح نے اس "عنایت الٰہی" کے فقرے کو بھی تسلیم نہیں کیا اور کہا کہ ممکن ہے کہ عنایت نے دوسرے ربع شمالی میں بھی آبادی رکھی ہو۔

لجواز ان یکون الربع	اسکا پورا امکان ہے کہ دوسرا چوتھائی
الآخر مسکونا معمورا ولم	حصہ بھی معمور اور آباد ہو۔ اور
یصل الینا خبرهم	وہاں کے رہنے والوں کا حال
(کتاب مذکور)	ہم کو معلوم نہ ہو۔

اس بحث سے اندازہ ہوگا کہ اس پرانی دنیا کے علاوہ دوسری دنیا کا نظریہ مسلمانوں نے علمی استدلال کے طریقے سے سمجھا تھا۔ اور یونانی نظریہ ربع مسکون کی کوئی طبعی اور فلسفیانہ توجیہ انکی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ نویں صدی ہجری کے وسط میں قاضی زادہ رومی نے محمود چغمینی المتوفی ۷۴۵ھ ۱۳۴۴ء کی ملخص کی شرح میں جسکو اس نے رصدخانہ سمرقند کے بانی سلطان الغ بیگ کے نام سے لکھا ہے۔ کہا ہے۔

وسائر الارباع خراب	اور باقی تین چوتھائی زمین بظاہر
ظاهر او الا لوصل خبرهم	غیر آباد ہے۔ کہ اگر غیر آباد ہوتی
الینا غالبا ویحتمل ان یکون	تو غالبًا اسکا حال ہم تک پہنچتا
بیننا وبینهم بحار	اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہمارے

مفرقة وجبال شاهقة	اور وہاں کے باشندوں کے درمیان
وبواد بعيدة تمنع وصول	بڑے سمندر پہاڑ اور دور دراز
الخبر الينا غير ان احد	صحرا ایسے ہوں جو انکی خبر کو ہم تک
الربعين الجنوبيين قد	پہنچنے میں حائل ہوں لیکن یہ بیان
حكى فيه قليلا من العمارة	کیا گیا ہے کہ ایک جنوبی چوتھائی
(صـ۱۱۴ مطبوعہ ۱۲۷۱ھ لکھنؤ)	حصہ میں تھوڑی آبادی ہے۔

اگر ایک ہی شمالی چوتھائی آباد ہے تو پھر یہ مسئلہ مشتبہ رہا کہ دو شمالی ربعوں میں سے کون آباد ہے فوقانی یا تحتانی۔ تو چونکہ ربع مسکون ہی کے مسئلہ کو مسلمان مشتبہ سمجھے گئے تھے اس لیئے وہ اس کی علت بتلانے میں بھی پس و پیش کرتے تھے۔ اسلیئے انھوں نے صحیح طور سے یہ کہا کہ نیچے اور اوپر کی بحث اسلیئے فضول ہے کہ ہر ایک دوسرے کی نسبت سے اور اوپر ہے۔ تصریح کے شارح امام الدین لاہوری نے حاشیہ کی یہ عبارت نقل کی ہے۔

ان في تعيين هذا الربع	اس چوتھائی زمین کی تعیین
تعسرا بل تعذرا لان لو قيل	مشکل ہے بلکہ محال ہے کیونکہ اگر
هذا هو الربع الفوقاني	یہ کہا جائے کہ وہ فوقانی ربع ہی
لصدق على الآخر	تو یہ فوقانی ہونا تو دوسرے کو
(صفحہ ۵۵)	بھی کہہ سکتے ہیں۔

اسی کی شرح میں عصمت اللہ سہارنپوری نے کہا ہے۔

لان کل منهما فوقانی بالنسبة الی من علیه	کیونکہ ان میں سے ہر ایک اپنے اوپر نسبت سے فوقانی ہے۔

اسکے بعد تصریح کی عبارت حسب تحریر ملا عصمت اللہ حسب ذیل ہے

والحاصل انه لیس ههنا علامة یمتاز احدهما عن الآخر ولذالك تراهم یبهمون الکلام ویقولون المعمورا احد المربعین (باب ملا عصمة الله ص ۹۵)	حاصل یہ کہ یہاں کوئی علامت ایسی نہیں ہے جس سے ایک حصہ دوسرے سے ممتاز ہو سکے۔ اسلیے ہم دیکھتے ہیں کہ اہل ہیئت اس مقام پر مشتبہ طریقہ سے یہ کہہ دیتے ہیں کہ دو شمالی ربعوں میں سے ایک آباد ہے۔

ملا عصمت اللہ اور امام الدین بعد کے لوگ ہیں لیکن انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ اگلوں کی نقل ہے۔

ابن خلدون مغربی المتوفی ۸۰۸ھ نے مقدمہ میں ربع مسکون کے نظریہ کی تشریح کے بعد لکھا ہے۔

" اور یہیں سے حکما نے یہ اخذ کیا ہے کہ خط استوا اور جو اس کے پیچھے ہے آبادی سے خالی ہے اور ان حکما پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ یہ مقام تو مشاہدہ اور سیاحوں کے متواتر بیانات سے ثابت کیا ہے کہ آباد ہے۔ تو پھر اس دعوی پر دلیل کیسے قائم ہوگی۔ (یعنی دعوی ہی غلط ہے)

پھر قدیم حکما کی طرف سے یہ بات بنائی ہے۔

" بظاہر حکما کا مقصد یہ نہیں ہے کہ خط استوا کے پیچھے آبادی بالکل محال ہے جبکہ ان کے استدلال نے ان کو یہاں تک پہنچایا ہے کہ وہاں کی گرمی کی شدت کے سبب سے پیدائش کا فساد قوی ہے اور اس لیے آبادی اس میں محال ہے یا بہت کم ممکن ہے۔ اور وہ ایسا ہی ہے کیونکہ خط استوا اور جو اسکے پیچھے ہے گو اس میں آبادی ہے جیسا کہ بیان کیا گیا ہے مگر بہت کم ہے۔"

اس مسئلہ کو اس سے بہت پہلے ابن رشد المتوفی ۵۹۵ھ نے پیش کیا اور کہا کہ خط استوا کے دونوں طرف جب یکساں [illegible] ہے تو خط استوا کے جنوب میں کیوں آبادی نہ ہو۔

" ابن رشد نے کہا ہے کہ خط استوا معتدل ہے اور اسکے جنوب میں جو زمین ہے وہ ویسی ہی ہے جیسی اسکے شمال میں ہے۔ تو جس طرح خط استوا کے شمال میں آبادی ہے جنوب میں بھی ہوگی۔"

(مقدمہ ابن خلدون)

ابن خلدون اسی خیال کی مزید تشریح اور جواب دیتے ہوئے کہتا ہے

" لیکن یہ کہنا کہ خط استوا میں آبادی محال ہے تو متواتر بیان اسکی تردید کرتا ہے۔" (مقدمہ ص۴۳ مصر)

جو بات ابن رشد نے کہی وہی حسن بن احمد ہمدانی المتوفی ۳۳۴ھ ۹۴۵ء نے جزیرۃ العرب میں لکھی ہے۔

و اما ما خلف خط الاستواء الی الجنوب فان طباعه تکون علی طباع شق الشمال سواء فی جمیع احواله الا انه لا ما ذکرنا فی کتاب سرائر الحکمة من اختلاف حال الشمس فی راس اوجها ونقطة حضیضها (ص ۵ لیڈن)

لیکن خط استوا کے پیچھے جنوب تک اسکی طبعی کیفیت کے مانند ہر چیز میں ہوگی۔ لیکن صرف اسی قدر اختلاف ہوگا جس کو میں نے سرائر الحکمۃ میں لکھا ہے یعنی آفتاب کے نقطۂ اوج اور نقطۂ حضیض میں اختلاف سے جو اثر پیدا ہوتا ہے۔

اس کے بعد لکھا ہے کہ بحر اعظم کی موج و طغیانی کی شدت کے سبب سے ادھر جنوبی سمت (یعنی جنوبی افریقہ میں) سمندر کی طرف سے جانے کی کسی کو ہمت نہیں پڑتی۔

ہمدانی نے آفتاب کے نقطۂ اوج و حضیض کا جو فرق پیدا کیا تھا نصیر الدین طوسی المتوفی سنہ ۶۷۲ھ نے اسکو کمزور ثابت کیا اور کہا۔

فمن البعید ان یبلغ تاثیرها الی حد یصیر احد موضعین متساویین فی الوضع مسکونا والآخر غیر مسکون (تقویم البلدان ابو الفدا ص ۵)

یہ دور از قیاس ہے کہ آفتاب کی تاثیر اس حد تک پہنچ جائے کہ دو مقام جو وضع (پوزیشن) میں یکساں ہوں ان میں سے ایک آباد ہو اور دوسرا غیر آباد ہو۔

ادھر علما تو اس مناظرہ میں مصروف ہے کہ وہاں آبادی ہے یا نہیں؟

یا عقلاً ہو سکتی ہے یا نہیں؟ اور اُدھر کے کم لکھے پڑھے سیّاح اور جہاز راں خط استوا کو پار کر کے افریقہ کی ہر سمت میں تیر گئے۔

جنوبی حصہ میں افریقہ کا جہاں تک تعلق ہے عرب تاجر اور سیّاح اس کے گوشہ گوشہ سے واقف ہو چکے تھے۔ جہاں جہاں موجودہ زمانہ میں اہل یورپ پہنچے مسافران عرب کے نشان قدم برابر پائے۔ عملی عربی سیاح اور جہاز ران خط استوا کو پار کر کے افریقہ کے ایک ایک کونہ اور گوشہ میں پہونچے اور خط استوا سے نیچے راس الرجاء الصالح (گڈ ہوپ) تک سب چھان مارا۔ چنانچہ ابو عبد اللہ البکری کی صفۃ الافریقہ والمغرب ابن بطوطہ کے سفرنامہ کے آخری ابواب اور ابن خلدون کے مقدمہ اور تاریخ میں انکے حالات موجود ہیں لیکن اصلی باشندوں نے توحش اور جہالت اور حیوانیت کے سبب سے انکی طرف زیادہ توجہ نہیں کی۔

ابن خلدون جنوبی افریقہ کے بعض مقامات سلا، تکرور، غانہ اور سلطنت مالی کا نام لیکر کہتا ہے۔

> ”اور آج کے زمانہ میں یہ پوری سرزمین سوڈانی قوم کی مملکت میں شامل ہے اور ان کے ملک تک مراکش کے سوداگر جاتے ہیں ...... اور انکے پیچھے جنوب میں کوئی قابل ذکر آبادی نہیں ہاں کچھ آدم صورت انسان ہیں جو انسانوں کے مقابلہ میں جانوروں سے زیادہ قریب ہیں۔ وہ صحراؤں اور غاروں میں رہتے ہیں۔ اور گھاس اور غلہ بن پکائے کھاتے ہیں۔ اور ان میں ایک دوسرے کو

کھا جاتے ہیں وہ انسانوں کے شمار میں نہیں۔"

(مقدمہ صفحہ ۲۵ مصر)

مشرقی افریقہ تو عربوں کا وطن ہو گیا۔ زنجبار پر وہ قابض تھے اور سواحل میں مڈگاسکر (قنبلو) کے مقابل تک انکا بحری گذرگاہ تھا۔ مغربی افریقہ گائنا (غانہ) میں ان کی نوآبادی تھی۔ شمالی افریقہ تو ان کی عظیم الشان سلطنتوں کا مرکز ہے اور آج تک وہ اس پر قابض ہیں۔ اور جنوبی افریقہ کے حیوان نما انسانوں کا حال ابھی پڑھ چکے لیکن انھوں نے محنت کر کے ان میں سے اکثر جانوروں کو انسان بنایا اور کچھ کو انکے جانشین اہل فرنگ نے بعد کو انسان بنایا اور باقی آج بھی جانور

الغرض:۔

"افریقہ کی [illegible] میں عرب تاجر اور نوآباد پھیل گئے تھے۔ کانگو، نڈیلو کفرو یا (القفرہ) میں وہ آباد تھے۔ اور ان کے قدیم آثار موجود ہیں۔ سنہ ۱۹۰۹ء میں روڈیشیا شمالی ٹرانسوال میں ایک عرب کی قبر ملی ہے جس میں مرنے والے کا نام سلام اور تاریخ وفات سنہ ۹۵ھ ۱۴۰۰ء کھدی ہے۔ اسی طرح اہل جرمنی نے چند سال ہوئے مشرقی افریقہ کے اندرونی علاقہ میں قدیم شہر تو کاموس ٹانگا کے قریب قدیم عربی کتابیں پائیں جن کو وہ برلن عجائب خانہ میں لے گئے۔"

"پرتگالیوں کی تاریخ میں ہے کہ جب انکے جہازات جنوبی مشرقی سواحلی افریقہ، گڈھوپ اور نٹال کے درمیان سفر کرتے تھے تو

انھوں نے عربوں کو پایا جن کے جہازات سے ساحل بھرا ہوا تھا۔ اور [illegible] دریا کے ملک سے بہت سا سونا اپنے جہازوں میں لاد چکے تھے تاکہ وہ اپنے ملکوں کو لے جائیں[1]"

مغربی افریقہ میں نائجیریا کا وسیع خطہ عربوں کی نوآبادیوں کا مرکز تھا اور ہے۔ یہاں پر خصوصیت کے ساتھ ہم کو مغربی افریقہ کے ایک گوشہ سے جس کو عرب غانہ اور اہل یورپ گائنا (GUINEA.) کہتے ہیں۔ بحث ہے اور جو قدیم زمانہ سے سونے کی سرزمین ہے۔

غانہ

اہل عرب اس سونے کی سرزمین تک بہت پہلے پہنچ چکے تھے عربی جغرافیوں میں اسکا نام بار بار آیا ہے۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ ہر قوم میں اس ملک کا نام ہی سونا ہو گیا ہے۔ عربی میں خالص سونے کو تبر کہتے ہیں یہی تبر اس کا عربوں میں نام ہے چنانچہ یاقوت نے معجم البلدان میں غانہ کا حال غانہ سے زیادہ تبر میں لکھا ہے۔ یہ گائنا یورپ میں جاکر گنی کی صورت میں سونے کی اشرفی بن گئی۔

گائنا خط استوا کے جنوب میں مغربی افریقہ کے اس ساحل پر واقع ہے جہاں سے جنوبی امریکہ اور پرانی دنیا کا ایک طرح سے محاذ پڑتا ہے اسلئے اس موقع پر اسکی خاص اہمیت ہے۔

---

[1] یہ دونوں اقتباس مقتطف مصر اگست ۱۹۱۵ء کے مضمون الرحلات الافریقیہ القدیمہ سے ماخوذ ہیں۔

اہل عرب گانا کب پہونچے اس کی صحیح تاریخ معلوم نہیں لیکن قیاس ہے کہ دوسری صدی میں مصر اور نوبہ اور بجہ وغیرہ افریقی قبیلے یہاں کے رہنے کا خراج مصر میں ادا کرتے تھے۔ اور وہاں مسلمان عمال اور مزدور آباد ہو چکے تھے۔[۱] پانچویں صدی ہجری کے اندلسی جغرافیہ نویس ابو عبید عبد اللہ البکری المتوفی ۴۸۷ھ ۱۰۹۴ء نے کتاب "المسالک والممالک" کے حصہ افریقہ کتاب المغرب فی ذکر بلاد افریقیۃ والمغرب" میں گانا کا، وہاں کے قبائل کا، ان کے بادشاہ کا اور اس کی سلطنت کا پورا حال لکھا ہے اور وہاں کے مسلمانوں کی سکونت اور آمد و رفت کی اطلاع دی ہے۔ یہ حالات مصنف نے ۴۶۰ھ میں لکھے ہیں۔ شہر غانہ کے دو حصے تھے ایک میں مسلمان رہتے تھے جس میں ۱۲ مسجدیں تھیں۔ ایک جامع مسجد تھی ان مسجدوں میں امام و مؤذن اور علما و فقہا سکونت پذیر تھے۔ دوسرے میں بادشاہ اور اس کے ارباب حکومت رہتے تھے۔ بادشاہی عمارت کے پاس بھی ایک مسجد بنی تھی جس میں وہ لوگ فریضہ نماز ادا کرتے تھے۔ جو بادشاہ کے پاس آتے تھے۔ ملک کے دوسرے حصہ میں بھی مسلمانوں کی آبادیاں تھیں۔ بادشاہ اور اس کے قبیلہ کے لوگ اس وقت تک بت پرست تھے لیکن مسلمانوں کی پوری عزت کرتے تھے۔ لیکن اسی زمانہ میں بادشاہ نے ایک مسلمان کی تبلیغ سے اسلام قبول کر لیا۔ وہاں ایک

---

[۱] طبری واقعات ۲۳۵ھ

ایسی عرب قوم بھی آباد تھی جو بنو امیہ کے زمانہ میں فوج کی حیثیت سے آئی تھی اور یہیں رہ پڑی بعد کو وہ اپنا مذہب بھی بھول گئی۔[1]

اس بیان سے معلوم ہوا کہ عرب یہاں بنو امیہ ہی کے زمانہ میں یعنی پہلی صدی ہجری کے آخر یا دوسری صدی ہجری کے شروع میں پہنچ چکے تھے

چھٹی صدی ہجری میں غرناطہ کے ابو حامد اندلسی المتوفی ۵۶۵ھ نے جو اسپین سے لیکر چین تک سیاحت کر چکا تھا۔ اور بغداد میں اقامت گزین ہو گیا تھا۔ تحفۃ الالباب کے نام سے جغرافیہ اور عجائب عالم پر ایک کتاب لکھی ہے اس میں وہ غانہ کے متعلق لکھتا ہے۔

وبلادهم ما یلی المغرب	ان کا ملک مراکش کے اس حصہ سے
الاعلی المتصل بطنجة	جو طنجہ سے ملا ہوا ہے اور بحر ظلمات
ممتداً علی بحر الظلمات۔[2]	(اطلانتک) کے ساحل پر پھیلا

ہے۔ متصل ہے

ابو حامد کا یہ بیان بہت مبہم ہے۔ مراکش شمال میں ہے۔ اور غانہ اسکے جنوب میں۔ اور دونوں کے بیچ میں صحرائے افریقہ ہے لیکن اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس سے واقف تھا۔ بہرحال اسکے زمانہ میں ان اطراف کے پانچ قبیلے مسلمان ہو چکے تھے جن میں ایک غانہ کا قبیلہ تھا۔

---

[1] کتاب المغرب فی صفۃ افریقیہ و بلاد المغرب صفحات ۱۷۴۔ ۱۷۵۔ ۱۷۸ - ۱۷۹۔ مطبوعہ
الجزائر ۱۹۱۱ء [2] تحفۃ الالباب صفحات ۴۱ و ۴۲ میں۔

"ان کے بادشاہوں میں سے پانچ قبیلے جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے مسلمان ہو گئے ہیں۔ ان میں سے قریب تر غانہ ہے جس کی ریگ میں خالص سونا پیدا ہوتا ہے اور انکے یہاں سونا بہت ہے" (ص ۱۱ و ۲۴ پیرس)

اسکے بعد ادریسی مراکشی المتوفی سنہ ۵۶۰ھ نے سسلی میں بیٹھ کر شاہ سسلی کے حکم سے جغرافیہ کی مشہور کتاب نزهة المشتاق فی اختراق الآفاق لکھی۔ اس میں غانہ کے حال میں جیسا کہ ابن خلدون نے نقل کیا ہے لکھا ہے کہ غانہ میں علوی سادات کی سلطنت ہے۔

"کتنی میں جیسا کہ کہا گیا ہے' بنی صالح' نام علویوں کی سلطنت اور حکومت ہے رجار کی کتاب کے مصنف (ادریسی) نے کہا ہے کہ اسکے بانی کا نام صالح بن عبداللہ بن حسن بن حسین ہے"

ابن خلدون کہتا ہے کہ عبداللہ بن حسن کی اولاد میں صالح نام کوئی شخص معروف نہیں ہے۔ بہر حال ابن خلدون المتوفی سنہ ۸۰۸ھ کے زمانہ میں غانہ کا ملک سلطان مالی کے زیر حکومت تھا[1]

مشہور سیاح ابن بطوطہ جو اسی زمانہ میں تھا وہ اسی سلطان کے زمانہ میں تمانہ پہنچا تھا اس سلطان اور اسکی مملکت اور قوم کے حالات اس نے اپنے سفرنامہ کے خاتمہ میں بیان کیئے ہیں۔ یہ لوگ دیندار مسلمان تھے اور عربی زبان افریقہ کے دوسرے حصوں کی طرح یہاں بھی سرکاری تھی

---

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۴۶ مصر ذکر اقلیم اول۔

مذہبی دونوں حیثیتوں سے رواج پذیر تھی۔ یہیں سے ابن بطوطہ سلطان مراکش کی دعوت پر تمام دنیا کا چکر لگا کر اپنے ملک میں واپس گیا ہے[1]۔

ابو عبید بکری اندلسی ابوحامد غرناطی، یاقوت رومی جغرافیہ کی ان تینوں کتابوں میں غانہ کے سونے کی بڑی بڑی داستانیں ہیں کہ کس طرح عرب تاجر مراکش اور مغرب سے اونٹوں پر لاد کر نمک اور دوسرے معمولی سامان لے جاتے ہیں۔ اور وہاں سے سونا بھر کر واپس لاتے ہیں اس داستان کو یہاں زیادہ طول دینے کی ضرورت نہیں مگر اسکو یاد رکھنا چاہیئے کہ آخری نتیجہ میں یہ بات کام آئے گی۔

شمالی روس اور بحر بیرنگ

جنوب سے اب شمال کا رخ کیجئے۔ عرب چوتھی صدی کے شروع میں خلیفہ مقتدر باللہ کی خلافت میں انتہائی شمالی روس تک پہنچ چکے تھے جہاں رات صرف چار گھنٹوں کی ہوتی ہے۔ وہاں کا بادشاہ مسلمان ہوگیا تھا۔ اور خلیفہ سے خواہش کی تھی کہ اس کی اور اس کی قوم کی تعلیم کے لئے کچھ لوگ بھیجے جائیں۔ خلیفہ نے ابن فضلان کی سرکردگی میں ایک وفد وہاں روانہ کیا۔ وہ آذربائیجان ہوکر نہر اتل یعنی والگا طے کرکے انتہائی شمالی روس کے قدیم شہر بلغار میں پہنچا اور کچھ روز رہ کر وہاں سے واپس آیا۔ اس پورے سفر کی سرگزشت اس وقت

---

[1] سفرنامہ ابن بطوطہ آخری باب۔

مختصر طور سے معجم البلدان کے الفاظ بلغار اور روس میں درج ہے۔

آٹھویں صدی میں ابن بطوطہ شمالی روس کے اس سرے پر پہنچا تھا جس کے آگے شمالی قطب کی برف پوش زمین تھی اور جہاں بقول ابن بطوطہ برف پر چلنے کے لیے کتوں کی گاڑیوں کی ضرورت تھی۔ اور یہ کتے بہت بیش قیمت تھے۔ اس جگہ ابن بطوطہ آگے نہ بڑھا۔[1] یہ وہی سواری ہے جس سے آج کل کے بہادر بھی قطب شمالی کی سرزمین کو طے کرتے ہیں۔

روس کے انتہائی شمال پر دریائے بیرنگ ہے۔ اسکا ذکر بیرونی۔ نصیر الدین طوسی اور قطب الدین شیرازی نے کیا ہے۔ اور اسکا صحیح موقع بتایا ہے۔ بیرنگ ایشیا کی طرف آکر بحر الکاہل میں مل جاتا ہے۔ اور شمال کی طرف اسی آبنائے بیرنگ کی پتلی سی لکیر شمالی امریکہ (کناڈا) اور پرانی دنیا کے بیچ میں حائل ہے۔ مسلمانوں کا علمی قدم اس سمت میں اس پتلی لکیر تک آکر رک گیا تھا۔ جہاں سے شمالی امریکہ منجمد برفستان کے پردہ میں چند قدم پر رہ گیا تھا۔[2]

انتہائی آبادی[3]

مسلمانوں میں علم ہیئت اور ریاضی جغرافیہ کا علم زیادہ تر یونان سے آیا تھا۔ خصوصاً بطلیموس کی کتاب

---

[1] سفرنامہ ابن بطوطہ [2] تقویم البلدان ابوالفدا ص ۳۵ [3] تذکرہ نصیر طوسی۔ تفصیل کیلئے دیکھیے میری کتاب عربوں کی جہازرانی ص ۱۱۳ و ص ۱۱۶

الجغرافیہ اور مجسطی پر انھوں نے اپنی معلومات کی بنیاد کھڑی کی۔ بطلیموس نے خط استواء کو جو افریقہ سے گذرتا تھا خشکی میں انتہائی آبادی قرار دیا تھا کیونکہ اس کے خیال میں گرمی کی شدت کی وجہ سے انسانی آبادی اس کے بعد ممکن نہیں تھی۔ اور اسی طرح طول میں انتہائی آبادی افریقہ کے پار بحر محیط کے چند جزائر کو قرار دیا تھا۔ جن کو اہل عرب جزائر "خالدات" کہتے ہیں۔ جس کا صحیح ترجمہ "جزائر سعید" یا مبارکہ ہے جن کو بعض عرب اہل جغرافیہ اور اہل ہیئت نے اختیار کیا ہے اور جو اصل میں لاطینی لفظ (FORTUNATSE) کا معرب ہے۔ اسی یونانی لفظ کو البکری نے اپنے جغرافیہ میں فرطنا [illegible] نام سے لکھا ہے۔ اس سے مقصود جزائر کینری (CANARIS) ہیں۔

عام طور سے مشرقی اہل ہیئت و جغرافیہ ان کو مفقود اور پانی میں غرق سمجھتے ہیں۔ مگر مغربی جغرافیہ نویس اس سے پوری طرح واقف تھے ابو عبید عبد اللہ بن عبد العزیز البکری اندلسی المتوفی ۴۸۷ھ ۱۰۹۴ء لکھتا ہے:-

"اور بحر محیط میں طنجہ کے مقابل اور کوہ ایڈلٹ کے سامنے دو جزیرے ہیں جن کا نام فرطناتس یعنی ہمیشہ سرسبز رہنے والے (سعید) جزائر سعادات خالدات ہیں۔ ان کا یہ نام اسلئے پڑا کہ انکی پہاڑیاں قسم قسم کے میووں اور خوشبودار پھولوں سے معمور ہیں۔ یہ میوے اور پھول لگائے بغیر خود بخود اگتے ہیں ان کی زمینیں گھاس کی بجائے معطر پھولوں سے آباد ہیں۔ اور وہ بلاد بربر کے مغرب میں

دریائے مذکور میں متفرق طور پر واقع ہیں[۱]۔ دوسری طرف انتہائی آبادی جزیرۂ تولی کو بتاتے ہیں جسکو برطانیہ کے اطراف میں اب عام طور پر آئسلینڈ کہا جاتا ہے۔

زمین گول ہے اور جذب وکشش سے قائم ہے۔

اس مسئلہ سے بھی اہل عرب واقف تھے کہ زمین گول ہے اور جذب وکشش کے اصول پر قائم ہے کسی بیل کے سینگ یا ستون یا پہاڑ کی پشت پر یہ گیند رکھا ہوا نہیں ہے۔

ابن خرداذبہ المتوفی ۳۰۰ھ کہتا ہے:

"زمین کی شکل گول ہے جیسے گیند جو فضائے آسمانی میں اس طرح رکھا ہوا ہے جیسے انڈے کے اندر زردی اور ہلکی ہوا (نسیم) زمین کے چاروں طرف ہے۔ اور وہ چاروں طرف سے کشش کر رہی ہے آسمان تک، اسی طرح مخلوقات کے اجسام زمین پر ہیں۔ کہ وہی نسیم ان کے بدنوں میں جو ہلکا پن ہے اسکو کشش کرتی ہے۔ اور زمین اس کے ثقل کو کھینچتی ہے کیونکہ زمین مثل اس پتھر کے ہے جس کو لوہا کھینچتا ہے (یعنی مقناطیس)[۲]

اس عبارت میں زمین کی گولائی اور جذب وکشش کے علاوہ جس حقیقت کو نسیم جیسی ہلکی پھلکی ہوا سے ادا کیا گیا ہے۔ آج آپ اس کو

---

[۱] المغرب فی ذکر بلاد افریقیۃ للبکری ص۱۹۰ الجیریا۔

[۲] کتاب المسالک والممالک ص۴ لیڈن۔

بے تکلف "ایتھر" کہتے ہیں۔ نویں صدی کے آخر کا عرب جہاز ران ابن ماجد مقناطیس کے بیان میں کہتا ہے۔

وقیل ان السبع السموات	اور کہا گیا ہے کہ ساتوں آسمان
والارض معلقات بمقناطیس	اور زمین قدرت کے مقناطیس
القدرۃ	سے معلق ہے۔

(کتاب الفوائد ص۹ پیرس)

جذب کشش کے مسئلہ کو اہل جغرافیہ کے علاوہ دوسرے حکمائے اسلام نے بھی بیان کیا ہے مگر اس وقت ہمیں اس سے بحث نہیں۔

زمین کو گول تو تمام حکمائے اسلام نے تسلیم کیا مگر مجھے اس دعویٰ پہ وہ استدلال پیش کرنا ہے جو اہل جغرافیہ کے قلم سے نکلا ہے۔

ابن رستہ (سنہ ۲۶۶ھ) تیسری صدی ہجری میں تھا وہ زمین کے گول ہونے پر ستاروں کے طلوع و غروب اور ظہور و خفا سے اس طرح بحث کرتا ہے۔

"تمام اہل علم نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ زمین اپنے تمام اجزا کے ساتھ خشکی و تری کی گیند کی طرح ہے۔ اور دلیل یہ ہے کہ سورج چاند اور کل ستاروں کا طلوع و غروب زمین کے تمام کناروں میں ایک وقت نہیں ہوتا بلکہ مشرقی مقامات میں ان کا طلوع مغربی مقامات سے پہلے ہوتا ہے اور یہ حوادث فلکی سے ظاہر ہے جو آسمان میں ہوتے ہیں تو ایک ہی حادثہ زمین کے تمام اطراف میں مختلف مقامات میں ہوتا ہے جیسے چاند گرہن کہ اگر ایسے دو مختلف

شہروں میں ان کو رصد کیا جائے جو ایک مشرق میں ہو اور دوسرا مغرب میں تو مثلاً اگر مشرقی چندر گرہن کا وقت رات کے تیسرے گھنٹے میں ہو تو……

(ابن رستہ ص۱۲)

زمین کی گولائی پر آج کل جہازوں کے اولاً مستول پھر آہستہ آہستہ بڑھتے بڑھتے پورا جہاز نظر آنے سے جو استدلال کیا جاتا ہے اس سے بھی وہ واقف تھے۔ مسعودی لکھتا ہے:۔

"اور جہاز جب سمندر کے بیچ میں ہوگا تو دنباوند کے پہاڑ غائب ہو جائیں گے اور نظر نہیں آئینگے۔ اور جب دریا میں سو فرسخ کے قریب رہ جائے گا تو ذرا سا پہاڑ کا سر نظر آئے گا اور جیسے جیسے ساحل کے نزدیک ہوتے جائیں گے پہاڑ بڑا ہوتا جائے گا۔ اور یہ اس بات پر دلیل ہے کہ سمندر کا پانی گول شکل پر ہے۔ اور یہی بحر روم میں حال ہے۔ یہ شام کے پہاڑ جو انطاکیہ اور لاذقیہ اور طرابلس اور جزیرہ سائپرس کے ساحل پر ہیں کہ جہازیں نگاہوں سے پوشیدہ رہتے ہیں اور ساحل کے قریب آتے ہوئے آہستہ آہستہ نظر آتے ہیں"

(مروج الذہب ص۱۹۵ پیرس)

ابوبکر بن الفقیہ ہمدانی (سنہ ۲۹۰ھ) اپنے جغرافیہ کتاب البلدان میں لکھتا ہے۔

"کہتے ہیں کہ سمندر بھی گول ہے اور دلیل اس کی یہ ہے کہ جب تم ساحل سے بیچ سمندر میں چلے جاؤ تو ساحل کے پہاڑ اور

درخت آہستہ آہستہ تمھاری نظر سے غائب ہونے لگیں گے پھر جب بیچ سمندر سے ساحل کی طرف آؤ تو وہ آہستہ آہستہ پھر دیکھائی دینے لگیں گے۔ (ص۱۵۳ لیڈن)

یہ دلیل بعینہ وہی ہے جو آج بھی زمین کی گولائی پر عام طور سے پیش کی جاتی ہے۔

زمین کے فوقانی اور تحتانی حصّے اور رات اور دن

ہر چند کہ یہ مسئلہ عربی علم ہیئت میں آفتاب کے دَور اور حرکت کے سلسلہ میں عام طور سے مذکور ہے لیکن زمین کے تحتانی اور فوقانی حصوں کے تخصیص کے ساتھ ذکر کرنے میں بے توجہی کی گئی ہے۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ مسلمان اس مسئلہ ہی سے واقف نہ تھے۔ تیسری صدی ہجری کا مصنف ابن رستہ اپنی کتاب الاعلاق النفیسہ کے مقدمہ میں شب و روز کے چوبیس گھنٹوں اور جاڑے گرمی میں روز و شب کے گھٹنے اور بڑھنے کا ذکر کر کے کہتا ہے:۔

لان نصف الارض ابدا	کیونکہ نصف زمین میں ہمیشہ دن
نھار مضئ ونصفھا الیل	رہتا ہے اور دوسرے نصف میں
مظلم یدوران علیھما	اندھیری رات اور یہ شب و روز
(ص۹ لیڈن)	اس زمین پر گردش میں ہیں۔

چوتھی صدی کے آغاز کا مصنف مسعودی مروج الذہب میں اس کی تشریح ان الفاظ میں کرتا ہے:۔

" زمین کی آبادی کا آغاز جزائر خالدات سے شمار کرتے ہیں۔ جو مغربی بحر اوقیانوس میں واقع ہیں یہ چھ آباد جزیرے ہیں اور آبادی کی انتہا چین کی انتہائی آبادی پر ہے۔ ان دونوں کے درمیان ۱۲ گھنٹوں کی مسافت ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آفتاب جب چین کے انتہائی حصہ میں ڈوبے گا تو ان جزیروں میں جن کا ذکر ابھی ہوا اور جو مغربی بحر اوقیانوس میں واقع ہیں۔ دن ہوگا۔ اور جب ان جزیروں میں رات ہوگی تو اقصائے چین میں دن ہوگا اور یہ زمین کا نصف دائرہ ہے۔ اور یہی آبادی کا طول ہے جس سے وہ واقف ہوئے ہیں (جلد ۱ صفحہ ۱۸ پیرس)

کرۂ ارض کے دوسری جانب آبادی ربع مسکون کا نظریہ ٹوٹ جانے کے بعد کرۂ ارض کی دوسری جانب آبادی کا تخیل بہت قریب ہوگیا۔ یہ تخیل قدیم سے قدیم تیسری صدی ہجری کے عرب جغرافیہ نویسوں میں ملا ہے:۔

ابن خردازبہ المتوفی ۳۰۰ھ اپنے جغرافیہ میں لکھتا ہے:۔

الا ان العمارة فی کرة	کرۂ زمین میں آبادی خط استوا
الارض بعد خط الاستواء	کے بعد ۲۴ درجہ تک ہے باقی
اربع وعشرون درجة	کو بحر محیط نے ڈبا دیا ہے
ثم الباقی قد غمره البحر	تو ہم زمین کے شمالی ربع پر آباد
الکبیر فنحن علی الربع الشمالی	ہیں اور جنوبی ربع گرمی کی شدت
من الارض والربع الجنوبی	کے سبب سے ویران ہے

خراب لشدة الحرنية	اور زمین کے دوسرے نصف
والنصف الباقی الذی	میں جو ہمارے نیچے ہے کوئی
تحتنا لا ساکن فیہ	آباد نہیں۔

(ص۵ لیڈن)

اس اقتباس کا آخری فقرہ قابل التفات ہے کہ وہ زمین کی دوسری جانب کو کم از کم خشک اور آبادی کے قابل سمجھتا ہے۔ گو اسکی آبادی کا اسکو کوئی علم نہیں۔

اس کے بعد اسی کے ایک معاصر ابن رستہ (۳۶۶ھ) کے قلم سے عجیب و غریب حقیقت تراوش ہوگئی ہے وہ غلطی کے ساتھ اس قدر تسلیم کرتا ہے۔

وان الناس نزلوا فی النصف	اور آدمی نصف شمالی میں آباد ہیں
الشمالی بین القبة وبنات	قبہ اور بنات النعش کے بیچ میں
النعش وذالک مقسوم علی	اور وہ سات اقلیموں پر منقسم ہے
سبعة اقالیم وباقی ذلک	اور باقی حصہ غیر آباد ہے اور
غامر مسکون وینزل فی النصف	نصف جنوبی میں جس کو خدا
الجنوبی من شاء اللہ من	چاہے اپنی مخلوقات سے آباد کرے
الخلق (الاعلاق النفیسہ ابن رستہ ص۹ لیڈن)	

ابن رستہ ربع شمالی کے بجائے نصف شمالی کی آبادی کا قائل ہے اور جنوب کی نسبت مشتبہ ہو کر کہتا ہے "وہاں اپنی خلق میں سے جس کو چاہے بسائے" یہ پیشین گوئی انکشاف امریکہ سے پوری ہوئی۔

بیرونی نصیر طوسی، قطب الدین شیرازی اور انکے تلامذہ کے سوال وجواب اور رد و اعتراض سے لوگوں میں یہانتک ہمت ہوئی کہ طوالع الانظار کے مشہور مصنف اور ابن فضل اللہ العمری (مسالک الابصار فی ممالک الامصار کے مصنف) کے استاذ ابوالثنا محمود بن ابی القاسم اصفہانی المتوفی ۷۴۹ھ ۱۳۴۸ء نے اس نظریہ کے پیش کرنے کی جرأت کی۔

لا امنع ان یکون ما انکشف	میں اسکو ممکن سمجھتا ہوں کہ ہماری
عند الماء من الارض	طرف زمین کا جو حصہ کھلا ہے
من جہتنا منکشفا من الجہۃ	وہ دوسری طرف سے بھی کھلا ہو
الاخری ولا امنع ان یکون	اور اسکو بھی ممکن کہتا ہوں کہ
بہ من الحیوان والنبات	اس میں بھی وہی حیوان نبات
والمعادن مثل ما عندنا	اور معدنیات ہوں جیسے ہمارے
او من انواع واجناس اخری	حصے میں ہیں یا اور دوسرے
(مسالک الابصار جلد ۱ ص ۱۳۱ مصر)	قسم کے ہوں۔

اس سے زیادہ تصریح اور کیا ہوگی۔ اسی لئے شاید ابن فضل اللہ نے ربع کے بجائے نصف ارض کو مکشوف قرار دیا۔

والبحر المحیط بنصف الارض	اور پانی نصف زمین کو چاروں طرف
احاطۃ متصلۃ دائرۃ بہ	سے کمربند کی طرح گھیرے ہوئے ہے
کالمنطقۃ لا یظہر منہا الا	زمین کا آدھا ہی حصہ کھلا ہے اور یہ
نصفہا وھو ما دار علیہ	وہی ہے جس پر آفتاب دائرۃ النہار

الشمس في قوس النهار	میں پھرتا ہے۔ اس کی مثال اس
مثل بيضة مغرقة في	انڈے کی ہے جو پانی میں ڈوبا ہو
ماء انكشف منها ما انكشف	تو اس سے کھل جاتا ہے جو کھل
وانغمس ما انغمس	جاتا ہے اور ڈوب جاتا ہے جو
(مسالک الابصار صفحہ ۳ جلد ۱)	ڈوب جاتا ہے۔

لیکن اس سلسلہ میں صحیح بات وہ ہے جو بیرونی نے اس سے تین سو برس پیشتر کہی تھی کہ اس قسم کے امور استدلال نہیں بلکہ مشاہدہ پر مبنی ہیں

جعلوا العمارة في احد الربعين	اس فن کے عالموں نے دو شمالی ربعوں
الشماليين لا ان ذالك	میں سے ایک ربع کو آباد مانا ہے
موجب امر طبعي فمزاج الهواء	اسلئے نہیں کہ اسکا کوئی طبعی سبب
واحد لا يتباين۔ ولكن امثاله	ہے کیونکہ زمین کے ہر طرف ہوا کا
من المعارف موكول الى الخبر	مزاج یکساں ہے لیکن بات یہ ہے
من جانب الثقة فكان الربع	کہ اس قسم کے معلومات کسی ثقہ کی
ذو الضمت هو ظاهر الامر	خبر اور اطلاع پر مبنی ہوتی ہیں۔
والاولى بان يوخذ به الى ان	اسلئے آباد حصہ چوتھائی ماننا بظاہر
يرد خبر بخلافه	درست ہے لیکن بہتر یہ ہے کہ اس
(تقويم البلدان ابو الفداء ص۱۱)	نظریہ کو اس وقت تک مانا جائے
	جب تک کسی نئی اطلاع سے اسکی تردید
	نہ ہو جائے۔

ان علما کو اپنے استدلال و جواب سوال میں مصروف رہنے دیجئے۔

اور آئیے دوسری طرف ان جاہل جہاز رانوں کی کوششوں پر ایک نگاہ ڈالیں جو اپنی جانوں کو خطرہ میں ڈال کر بحر ظلمات کی شناوری میں مصروف ہیں

(۲)

ماورائے بحر ظلمات عرب کے بے آب ریگستان سے اسلامی فتوحات کا جو سیلاب چھٹی صدی عیسوی کے آخر میں اٹھا تھا وہ ساتویں صدی عیسوی کے وسط میں افریقہ و مغرب اقصیٰ اور اندلس کے صحراؤں اور میدانوں سے گذر کر بحر ظلمات کے ساحل پر آ کر رکا۔ مگر بلند ہمت عرب کشور کشاؤں کی ہمت اب بھی اس فطری روک کے پاس آ کر کم نہ ہوئی۔ مغرب اقصیٰ کے فاتح عقبہ نے بحر ظلمات کے پانی میں گھوڑا کھڑا کر کے کہا کہ "خداوندا اگر مجھے معلوم ہوتا کہ اسکے بعد بھی تیرا کوئی ملک ہے تو میں ذوالقرنین کی طرح وہاں بھی تیری توحید کی دعوت لیکر جاتا (المونس فی اخبار تونس ص۲۸)

اندلس کا فاتح طارق فتح کرتا ہوا آگے بڑھتا جاتا ہے۔ اسکا آقا موسیٰ اس کو روکتا ہے۔ وہ جواب دیتا ہے کہ جب تک بحر محیط کی دیوار ہمارے قدم نہ روک لیگی ہم آگے بڑھتے جائیں گے[1]

ماورائے بحر ظلمات سفر کا تخیل عربوں اور مغربی و افریقی مسلمانوں میں ذوالقرنین کے قصہ کے سلسلہ میں پیدا ہوا۔ یہ کہانی اتنی پھیلی کہ علم ہیئت کی کتابوں تک میں درج ہے ___ کہتے ہیں کہ ملک مغرب میں پہونچکر اپنا جہاز بحر ظلمات کی تحقیق حال کے لئے روانہ کیا

---

[1] نفخ الطیب جلد ۲ ص۱۱۳ مصر

وہ اس پار کے ایک جہاز کو گرفتار کر کے لے آیا۔ جس پہ ماورائے بحر ظلمات کے کچھ باشندے سوار تھے۔ ذوالقرنین نے ان سے انکے ملک کا حال دریافت کیا۔ رصدگاہ مراغہ کا عالم ہیئت شارح چغمینی اس قصہ کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہے:۔

> "یہ ہو سکتا ہے کہ ہمارے اور ان کے درمیان میں بڑے بڑے دریا اور اونچے اونچے پہاڑ اور صحارٰی حائل ہوں جو ان کی خبر ہم تک نہیں آنے دیتے۔ ہاں دو جنوبی ربعوں میں سے ایک میں کچھ آبادی بیان کی جاتی ہے اور وہ جو ذوالقرنین کے زمانہ کا قصہ بیان کیا جاتا ہے وہ بظاہر بے اصل معلوم ہوتا ہے"
>
> (مقالۂ ثانیہ فی بیان الارض)

لیکن اس قسم کی کہانیوں کی تعداد روز بروز بڑھنے لگی چنانچہ اسپین و افریقہ کے سواحل میں مغرورین و مغترین (فریب خوردہ) کے نام سے ایک جماعت ہی قائم ہو گئی۔ جو اپنے کو مصیبتوں میں ڈال کر اس بحر محیط کے سفر کے لئے روانہ ہوئی تھی۔ پھر وہ اس میں فنا ہو جاتی تھی یا کامیاب واپس آتی تھی۔

تیسری صدی کے آخر اور چوتھی صدی ہجری کے شروع (نویں صدی عیسوی کے آخر اور دسویں صدی عیسوی کے شروع) میں مسعودی اپنی مروج الذہب میں اس قسم کے واقعات کے لئے اپنی دوسری تصانیف کا حوالہ دیتا ہے۔

وقد أتينا على ذكرها في كتابنا اور ہم نے اپنی کتاب آخر الزمان

فی اخبار الزمان و فی اخبار من غرّر و خاطر بنفسه و من نجا منهم و من تلف و ما شاهدوا و ما رأوا۔

میں اور ان لوگوں کے حالات میں ان واقعات کو بیان کیا ہے جنھوں نے اپنے آپکو فریب دیا اور اپنے آپ کو جوکھوں میں ڈالا اور ان میں سے جو بچا اور جو ہلاک ہوا اور انھوں نے جو دیکھا اور مشاہدہ کیا

اس کے بعد کہتا ہے :۔

فاذا منهم رجل من اهل الاندلس يقال له خشخاش وكان من فتيان قرطبة واحداثهم فجمع جماعة من احداثها وركب بهم مراكب استعدها فی هذا البحر المحيط فغاب فيه مدة ثم انثنى بغنائم واسعة وخبره مشهور عند اهل الاندلس

(جلد ۱ ص ۱۵۸ پیرس)

اور ان میں اندلس کے رہنے والوں میں سے ایک شخص تھا جس کو خشخاش کہکر پکارا جاتا تھا وہ قرطبہ کے نوجوانوں میں سے تھا۔ اس نے قرطبہ کے اور نوجوانوں کی ایک جماعت بنائی اور ان کو لے کر ان کشتیوں میں سوار ہوا جن کو اس نے بحر محیط میں اس غرض کے لیے تیار رکھا تھا وہ ایک زمانہ تک غائب رہا۔ پھر بہت سا مال غنیمت لے کر لوٹا۔ اس کا واقعہ اندلس والوں میں مشہور ہے۔

ادریسی المتوفی سنہ ۵۶۰ھ نے نزہتہ المشتاق میں اندلس کے جغرافیہ میں

تین موقعوں پر ان مغرورین یعنی فریب خوردہ جہاز رانوں کا ذکر کیا ہے (صفحات ۵۵- ۱۶۵- ۱۸۴) یہ بھی لکھا ہے کہ امیر المومنین علی ابن یوسف بن تاشفین کے امیر البحر احمد بن عمر معروف بہ رقم الاوز (نقش بط) نے بحر ظلمات کے ایک جزیرہ پر فوج کشی کی تھی مگر کامیابی کے پہلے ہی وہ مر گیا (ص ۵۵)

ادریسی ایک موقع پر بحر ظلمات کے ذکر میں لکھتا ہے :-

> اس بحر ظلمات کے پیچھے جو کچھ ہے اس کو کوئی نہیں جانتا اور نہ کسی آدمی کو صحیح واقفیت ہے کیونکہ اس کو عبور کرنا سخت مشکل ہے اس کی فضا میں بڑی تاریکی اور اسکی موجیں نہایت سخت اور اس کے خطرات بہت اور اس کے جانور خطرناک۔ اور اسکی ہوائیں ہیجان انگیز ہیں۔ اس میں بہت سے جزیرے ہیں کچھ آباد، کچھ سمندر کے اندر اور کوئی جہاز ران اسکو عرض میں قطع نہیں کرتا اور نہ اس میں گھستا ہے۔ البتہ اسکے ساحل کے طول کے کنارے کنارے اس سے لگ کر چلتا ہے (ص ۱۶۵)

اب بحر ظلمات میں یہ کون سے جزیرے ہیں ؟ کیا امریکن جزائر ویسٹ انڈیز۔ فاؤنڈ لینڈ۔ گرین لینڈ وغیرہ ہو سکتے ہیں۔

لشبونہ (لسبن ساحل پرتگال) کے ذکر میں ادریسی ان فریب خوردہ جہاز رانوں کا ایک دلچسپ قصہ سناتا ہے۔ کہتا ہے :-

" اور اسی شہر لسبن میں فریب خوردہ لوگ اسلئے بحر ظلمات میں سوار ہوئے تھے تاکہ پتہ لگائیں کہ اس میں کیا ہے اور کہاں جا کر

ختم ہوتا ہے۔ شہر لسبون میں ایک پھاٹک یا گلی (درب) ہے جس کا
نام فریب کھانے والوں کا درب ہے اور انکا قصہ یہ ہے کہ آٹھ
آدمیوں نے جو آپس میں سب چچا کے بیٹے تھے باربرداری کا ایک
جہاز بنایا اور اس میں پانی اور توشہ اتنا رکھ لیا جو مہینوں کے
لئے کافی تھا پھر اس جہاز میں سوار ہو کر ایک مناسب موسم میں
روانہ ہوئے۔ گیارہ دن کے بعد ایک ایسے پانی میں پہنچے جو سخت
موجوں والا تھا۔ وہاں کی ہوائیں مکدر تھیں۔ روشنی ماند تھی
تو انھوں نے یہ سمجھ لیا کہ اب ہلاکت قریب ہے تو اپنے بادبانوں
کو دوسرے ہاتھ کی سمت پلٹ دیا۔ اور سمندر میں جنوب کی طرف
چلتے رہے۔ تو بکریوں والے ایک جزیرہ میں پہونچ گئے۔ وہاں
بے شمار بکریاں تھیں جن کو کوئی پکڑنے والا یا چرانے والا نہ تھا۔
تو وہ جزیرہ میں آئے۔ وہاں چشمہ ملا اور جنگلی انجیر۔ انھوں نے
ان بکریوں میں سے کچھ کو ذبح کیا تو انکا گوشت بہت ہی کڑوا
نکلا جس کو وہ نہ کھا سکے۔ ان کی کھالیں لے لیں اور جنوب کی
سمت میں ۱۲ دن اور چلے ان کو ایک جزیرہ ملا جہاں آبادی اور
کھیتی تھی تو وہ اس جزیرہ کو دیکھنے چلے۔ ابھی کچھ ہی دور چلے تھے
کہ چھوٹی چھوٹی کشتیوں نے ان کو گھیر لیا اور ان کو پکڑ کر جہاز
ایک ساحلی شہر کی طرف لے گئے۔ وہاں ایک گھر میں جا کر اتارا
وہاں سرخ رنگ (اشقر) کم لیکن سیدھے بال لمبے قد کے
آدمی دیکھے۔ ان کی عورتوں میں عجیب خوبصورتی تھی۔ تو وہ لوگ

تین دن ایک گھر میں قید رہے۔ چوتھے دن انکے پاس ایک آدمی آیا
جو عربی میں باتیں کرتا تھا۔ تو اس نے ان کا حال دریافت کیا۔
اور یہ کہ کیوں آئے اور کہاں سے آئے اور تمہارا وطن کہاں ہے۔ انھوں
نے اپنا پورا حال بتایا۔ اس نے ان سے بھلائی کا وعدہ کیا اور بتایا کہ
وہ بادشاہ کا ترجمان ہے۔ دوسرے دن ان کو بادشاہ کے سامنے
پیش کیا۔ اس نے انکا حال پوچھا تو وہی بتایا جو کل ترجمان کو
بتا چکے تھے کہ وہ اس سمندر میں اسلئے گھسے تھے کہ دیکھیں اس میں
کیا کیا عجائبات ہیں۔ اور اس کے حالات کیا ہیں۔ اور اس کی حد
دریافت کریں۔ یہ سنکر بادشاہ ہنسا اور ترجمان کے ذریعہ سے انکو بتایا
کہ اس کے باپ نے اپنے غلاموں کو یہ حکم دیا تھا کہ وہ سمندر کے
عرض میں ایک مہینہ تک چلتے رہیں مگر کوئی نتیجہ نہیں نکلا اور وہ
ناکام واپس آئے۔ پھر بادشاہ نے ترجمان سے کہا کہ ان سے بھلائی
کا وعدہ کرے۔ اور بادشاہ کے ساتھ حسن ظن پیدا کرے۔ اس نے
ایسا ہی کیا پھر وہ اس قیدخانہ میں لے آئے گئے۔ یہاں تک کہ وہ
موسم آیا جب پچھوا ہوا چلتی ہے۔ تو ان کو ایک کشتی میں بٹھا کر
اور آنکھوں پر پٹیاں باندھ کر ایک رات تک سمندر میں چلاتے رہے
ان کا گمان ہے کہ تین دن اور تین رات وہ چلے ہونگے۔
یہاں تک کہ وہ ایک خشکی میں پہنچائے گئے۔ وہاں ان کی مشکیں
کسی گئیں اور ساحل پر چھوڑ دیئے گئے [illegible] تک کہ دن نکلا اور
روشنی ہوئی۔ اور ہم بندھے ہوئے [illegible] سخت تکلیف اور بدحالی

میں تھے پھر ہم نے لوگوں کی آوازیں سنیں تو چیخے تو وہ لوگ پاس آئے اور مشکیں کھولیں اور ہمارا حال دریافت کیا۔ ہم نے بتایا۔ یہ لوگ بربر تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ تم جانتے ہو کہ تمہارے وطن کا یہاں سے کتنا فاصلہ ہے۔ انھوں نے کہا نہیں انھوں نے کہا دو مہینہ کی مسافت۔ یہ سن کر ان فریب خوردہ جہازرانوں میں سے ایک کی زبان سے وا اسفی (ہائے میرا افسوس) نکل گیا تو اس مقام کا نام اسفی پڑ گیا اور وہ مغرب اقصیٰ کے بندرگاہ کا نام ہے[1]

جزئی اغلاط اور دونوں کے اندازہ سے قطع نظر کر کے کیا ہم اس مقام کو جہاں تک یہ فریب خوردہ جہازران پہونچے تھے شمالی امریکہ کا کوئی گوشہ سمجھیں اور سرخ رنگ کے انسان وہی تو نہیں جن کا نام غلطی سے ریڈ انڈینس (لال ہندوستانی) رکھ دیا گیا ہے جو وہاں کے اصلی باشندے ہیں۔

ابن خلدون المتوفی ۸۰۸ھ آٹھویں صدی میں بحر محیط کے ایک سفر کا حال لکھتا ہے جس میں اہل فرنگ کے چند جہاز بحر محیط کے کسی جزیرہ میں اتفاقاً پہونچ گئے تھے۔ چونکہ بحر محیط کے اندر یا انتہا پر جزائر خالدات کے علاوہ کوئی اور نام معلوم نہ تھا اسلئے اس کے اندر کی ہر آبادی کو اور خشکی کو جزائر خالدات کہہ دیتے تھے چنانچہ وہ مقدمہ میں کہتا ہے۔

---

[1] نزہۃ المشتاق فی اختراق الآفاق صفۃ افریقیۃ والاندلس ۱۸۴ - لائیڈن

"بحر محیط میں بہت سے جزیرے ہیں جن میں تین بڑے اور مشہور ہیں اور کہا جاتا ہے کہ وہ آباد ہیں۔ اور ہم کو خبر معلوم ہوئی ہے کہ اس صدی (آٹھویں صدی ہجری، چودہویں صدی عیسوی) کے بیچ میں اہل فرنگ کے جہاز ادھر سے گذرے اور انھوں نے وہاں لوٹ مار کی۔ اور وہاں کے کچھ باشندوں کو پکڑ کر لائے اور مراکش کے سواحل پر ان کو بیچا اور وہاں سے وہ سلطان کے پاس پہونچے جب ان لوگوں نے عربی سیکھ لی تو انھوں نے اپنے جزیرہ کا حال بتایا کہ وہ کاشتکاری کے لئے زمین سینگ سے کھودتے ہیں اور ان کے یہاں لوہا نہیں ہے۔ جو کھاتے ہیں اور انکے مویشی بھیڑیں ہیں۔ اور لڑائی میں پتھر کے ہتھیار استعمال کرتے ہیں اور آفتاب کو پوجتے ہیں۔"

اس کے بعد ابن خلدون کہتا ہے اور صحیح کہتا ہے

ولا یوقف علی مکان ھذہ الجزائر الا بالعثور لا بالقصد الیھا۔ (ص۴۵)	ان جزیروں کا ٹھیک پتہ نہیں معلوم اتفاقاً وہ مل جاتے ہیں۔ بالارادہ نہیں ملتے۔

اس کی وجہ یہ بتاتا ہے کہ جہاز ہوا کا رخ جاننے، ستاروں کی سمت معلوم کرنے اور سواحل کے بحری نقشوں کی مدد سے چلتے ہیں۔

وھذا کلہ مفقود فی البحر المحیط (ص۴۵)	اور یہ تمام سامان بحر محیط میں مفقود ہیں۔

"اسی لیے جہاز اس کے بیچ میں ہو کر نہیں چلتے۔ کیونکہ اگر سواحل کا

منظر آنکھوں سے دور ہو جائے تو واپس آنے کی راہ کا بہت کم پتہ چلتا ہے ساتھ ہی اس سمندر کی فضائیں اور اس کے پانی کی سطح پر اتنے بخارات رہتے ہیں جو جہازوں کو چلنے نہیں دیتے اور آفتاب کی روشنی پہونچنے نہیں پاتی۔ اسی لئے اس میں راہ پانا اور اس کا معلوم ہونا مشکل ہے۔" (مقدمہ ص۴۵)

ان تمام قصوں کو ممکن ہے کہ دلچسپ کہانیوں ہی کی صورت میں تسلیم کیا جاتا لیکن آج کل امریکہ کے کولمبس کی دریافت کی جو تنقیدی تاریخیں لکھی جا رہی ہیں انھوں نے ان کہانیوں کو سنجیدہ تاریخ بنا دینے کی سند پیدا کر دی ہے۔

نئی تحقیقات امریکہ کے انکشاف کی جو تنقیدی تاریخیں وقتاً فوقتاً لکھی گئی ہیں اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نئی اور پرانی دنیا میں کولمبس سے پہلے سے تعلقات قائم تھے۔ ان تعلقات کی تعمیر میں کون کون قوموں نے حصہ لیا۔ اس کی دریافت تاریخی اور اثری ذریعوں سے اب تک کی گئی تھی لیکن ابھی حال میں ہارورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر لیو وینر (LEOWIENER) کی ایک کتاب تین جلدوں میں شائع ہوئی ہے اس کا نام "افریقہ اور امریکہ کی دریافت" ہے۔ اس میں نہایت واضح طور سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ کولمبس امریکہ کا پہلا دریافت کرنے والا ہرگز نہیں۔ موصوف نے امریکہ میں پرانی آنے والی قوموں کی دریافت کا ایک نیا طریقہ اختیار کیا ہے۔ انھوں نے امریکہ کے پرانے باشندوں کی اصلی

زبان کی فیلالوجیکل تحقیقات کے ذریعہ سے پتہ لگایا ہے کہ امریکہ کے باشندوں کی پرانی زبان وقتاً فوقتاً کن کن زبانوں سے مانوس ومتاثر ہوتی رہی ہے۔ وینیر صاحب چھبیس السانی زبانوں میں بہ آسانی گفتگو کر سکتے ہیں۔ اور امریکہ کی پرانی زبان کے بڑے ماہر ہیں۔" اس کتاب کا خلاصہ انگریزی رسالہ "ورلڈ ٹوڈے" کے فروری ۱۹۲۶ء میں چھپا تھا۔ جس کا عربی ترجمہ المقتطف اگست ۱۹۲۶ء میں اور اردو ترجمہ معارف اگست ۱۹۲۶ء اور پھر اگست ۱۹۲۷ء میں طبع ہوا۔

وینیر کی تحقیقات کا حیرت انگیز نتیجہ یہ نکلا ہے کہ امریکہ کی اصلی زبان میں انگریزی، فرانسیسی، ہسپانی اور پرتگالی زبانوں سے بہت پہلے جس زبان کے الفاظ ہیں وہ عربی زبان ہے۔ یہ الفاظ ان کی تحقیق کے مطابق ۱۲۹۰ء کے قریب اس میں داخل ہوئے ہیں اور کولمبس نے امریکہ کی دریافت کا شور اسکے ٹھیک دو سو برس بعد مچایا ہے۔ وینیر نے کاغذی دستاویزوں سے ثابت کیا ہے کہ کولمبس سے پہلے بحر اوقیانوس میں تجارتی جہازرانی ہوتی تھی مگر تاجر وسوداگر بادشاہوں کے ڈر سے اپنی ان بحری مہموں کو چھپاتے تھے۔

کولمبس کے خود ذاتی بیانات بھی حقیقت کی پردہ دری کرتے ہیں وہ امریکہ کے تیسرے سفر سے واپسی کے بعد بیان کرتا ہے کہ اسے وہاں زنگی سوڈانی باشندوں سے سابقہ پڑا بلکہ پہلے سفر کے بعد ہی وہ کہتا ہے کہ وہاں کے اصلی باشندوں نے اسے گنی (یعنی وہی مغربی افریقہ کے

طلائی سکے جس کو ایک خاص مقدار میں تانبہ ملا کر بناتے تھے) دکھلائی گونینس
اس وقت کی افریقہ کی زبان میں سونے کے ان ٹکڑوں کو کہتے تھے جن کی شکل
میں سونا ساحل گنی (غانہ) سے یورپ میں لایا جاتا تھا۔ قدرتی طور پر سونے
کے یہ ٹکڑے دیکھ کر کولمبس متحیر ہو گیا کیونکہ وہ دراصل اسی سونے،
ہاتھی دانت اور قیمتی سامان کی تلاش میں یہاں تک آیا تھا۔ اس نے امریکہ
کے باشندوں سے دریافت کیا کہ انھوں نے وہ سونا کہاں سے پایا۔ اسکے
جواب میں انھوں نے کہا "ہم نے یہ سونا کالے سوداگروں سے لیا ہے جو
جنوب مشرق سے یہاں آئے تھے" کولمبس کو گمان ہوا کہ وہ سونے کی اصلی کان
بتانے سے گریز کرتے ہیں تیسرے سفر میں اس نے پھر وہی سوال کیا اور
وہی جواب پایا۔ اور آخر بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ ان امریکیوں
کے جواب درست تھے۔ ابتدائی گونینس جو فرانسیسی اور پرتگالی گنی کے
ساحل سے لاتے تھے خالص سونے کے نہیں ہوتے تھے بلکہ غانہ والے اس میں
اسی کے برابر تانبہ ملا دیتے تھے جب کولمبس کی لائی ہوئی گونینس کا کیمیائی
امتحان کیا گیا تو اس میں سونے اور تانبے کا وہی تناسب نکلا جو غانہ
(گنی) کے لائے ہوئے گونینس میں تھا۔

یہ طلائی ٹکڑے دراصل افریقہ ہی سے آئے تھے ایسے ہی جو حبشی
اسکو وہاں ملے وہ افریقہ ہی سے آئے ہونگے۔ جہازوں کے کپتانوں کے ہر سفر
سے پایا جاتا ہے کہ ان غلامی حبشیوں کی موجودگی ضروری تھی۔ وہ بطور
ترجمان استعمال کیے جاتے تھے۔ کولمبس بھی ان میں سے چند کو پہلے سفر میں
ساتھ لے گیا تھا۔ امریکہ جا کر اسے معلوم ہوا کہ ایسے حبشی وہاں پہلے سے

موجود ہیں یہی وہ لوگ تھے جن کو جنوب مشرق کے سیاہ سوداگر کہا گیا تھا۔ انہی کے ساتھ غانہ کے سکے امریکہ پہونچے تھے اور انہی کے ساتھ عربی الفاظ عربی پودے اور عربی تہذیب وہاں پہنچی۔

پہلے آثار قدیمہ کے ماہر وینر کا یہ تنہا بیان تھا اور اب بالونکے محقق بھی انکے ساتھ مل گئے ہیں اور دونوں کا متفقہ دعوی ہے کہ امریکہ میں عربی تہذیب کا اثر کولمبس سے بہت پہلے پایا جاتا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نئی دنیا افریقی عربی تجارت سے بہت حد تک متاثر ہو چکی تھی۔

امریکہ کی پرانی قوموں میں دو ممتاز نام ملتے ہیں "ازٹ" اور "مایہ" جو افریقہ کی عربی تہذیب کی حامل تھیں معلوم نہیں انکی اصلیت کیا ہے مگر یہ نام صحیح عربی ناموں کی تحریف معلوم ہوتی ہے۔ پہلا نام ازد ہے اور دوسرا نام معاویہ ہے۔ ازد کی نسبت پہلے ہم لکھ چکے ہیں[1] کہ یہ لوگ ابتدائے اسلام میں عمان سے افریقہ اور مڈگاسکر کے بحری جہاز ران تھے اور بہادری سے اپنے جہاز بحر بربرہ میں چلایا کرتے تھے۔

بہرحال رسالہ مذکور وینیر کی تحقیق کا خلاصہ آگے ان الفاظ میں دیتا ہے

"ازٹ اور مایہ کی تہذیبیں دراصل امریکہ میں افریقہ کی عربی تہذیب کی نقلیں تھیں اور انکا زمانہ ۵۱ھ سے ۱۲۰۰ء تک قرار دیا جاتا ہے"

ہم نے مغرورین کے سفر کا جو زمانہ لکھا ہے وہ اسی کے قریب قریب ہوتا ہے۔

"عربی تہذیب نویں صدی عیسوی میں اپنے معراج پر تھی اور سنہ ۱۰۰۰ء میں

---

[1] عربوں کی جہازرانی ص ۱۶۰

صحرائے اعظم کو عبور کر کے افریقہ کے مغربی منڈینگو (MINENIGO) کا تجارتی صوبہ قائم کر چکی تھی اسکے مقابل میں امریکہ کا صوبہ میچوکن[1] (MICHOACAN) تھا جو خلیج مکسیک کے ساحل پر واقع تھا عربی الفاظ کی آمیزش سب سے پہلے میچوکن میں پائی جاتی ہے اور وہ الفاظ منڈینگو کی زبان میں ملتے ہیں اور یہ امر خاص طور پر ذکر کے قابل ہے کہ یہ الفاظ ایسے ہیں جو ایک تجارتی کارندہ یا سیاح استعمال کرلیتا ہے مثلاً جادو، ادویہ، مذہب اور نظام حکومت کے متعلق یہ نتیجہ کہ منڈینگو اور میچوکن کے درمیان آمد و رفت بھی لابدی ہے ہر طرح تازہ تحقیقات سے اسکی تائید ہوتی ہے۔ ارث اور مایہ کی تہذیبوں کا یک لخت انحطاط اسکا ایک اور ثبوت ہے۔ چونکہ یہ ایک طرح کی نوخیز تہذیبیں تھیں جس وقت انکا اپنے اصلی مرکز سے قطع تعلق ہو گیا ان میں تنزل آنا شروع ہو گیا۔ یہ امر کہ یہ تعلق صرف تجارتی تھا۔ اس بات سے ثابت ہوتا ہے کہ عربی تہذیب کا اثر میچوکن میں داخل ہو کر صرف تجارتی راستوں کے آس پاس ہی پایا جاتا ہے۔ اور یہ صرف خالص عربی کا اثر تھا۔"

اگر مسٹر وینر کی ان لسانی تحقیقات کے نتائج درست ہیں تو ہم نے انکی تصدیق کے لئے جو مقدمات گذشتہ صفحوں میں فراہم کئے ہیں وہ بھی قابل قبول ہیں۔

پہلے عربوں کی امریکہ میں آبادی

اس نظریہ کو سن کر لوگوں کا سچا سوال تھا کہ اگر یہاں کولمبس سے پہلے

---

[1] مکسیکو میں ایک ریاست بحر الکاہل (پاسفک) سے ملحق۔

عربوں کی آمد و رفت تھی تو امریکہ میں انکے نشانات کیوں نہیں ملتے اور انکی کبھی نو آبادی کا پتہ کیوں نہیں لگتا۔ مگر خدا کی قدرت دیکھیے کہ عین اس وقت جب یہ سطریں زیر تحریر ہیں امریکہ کے عربی اخبار "الہدیٰ" نے ایک نیا انکشاف دنیا کے سامنے پیش کیا۔ جسکی صدائے بازگشت سے دنیا گونج گئی۔ اور خود ہندوستان کے اردو اخبارات نے اسکے اقتباسات دسمبر ۱۹۳۰ء میں شایع کیے۔ براعظم امریکہ میں وہاں کی مہذب ریاستوں اور متمدن ملکوں کے علاوہ بہت سے ایسے پہاڑی مقامات، جنگل اور گاؤں ہیں جہاں اس براعظم کے پرانے باشندے آباد ہیں اور جو اب تک اپنی وہی پرانی قبائلی زندگی بسر کر رہے ہیں اور جہاں تک اب تک کبھی یوروپین سیاح کے قدم نہیں پہونچے ہیں خصوصیت کے ساتھ یہ مقامات مکسیکو کے علاقہ میں زیادہ ہیں۔ اخبارات راوی ہیں

"ایک شامی عرب تاجر مکسیکو کے چاپاس اور ٹباسلا کے صوبوں میں پھیری کرکے سوداگری کا مال بیچتا تھا۔ حال میں اتفاقاً اسکا گذر ایک کوہستانی علاقہ میں ہوا جہاں آمد و رفت جاری نہیں تھی۔ چلتے چلتے وہ ایک جنگل میں پہنچا وہاں ایک قبیلہ دکھا۔ رات ہو چکی تھی۔ سوداگر نے اسپینی زبان میں ان جنگلی باشندوں سے شب بھر رہنے کی درخواست کی۔ اسکے جواب میں ایک شخص نے عربی میں کہا کہ ہم لوگ تمھاری بولی نہیں سمجھتے۔ عرب سوداگر اس جنگل میں عربی زبان سن کر حیرت میں آگیا۔ اس نے ان سے عربی میں گفتگو کی اور انھوں نے کہا کہ وہ صابیوں کے اس جنگل میں آباد ہیں اور

[illegible] ۲۲ دسمبر ۱۹۳۰ء و المساء ۲۷ر شعبان ۱۳۴۹ھ - ۱۶ر جنوری ۱۹۳۱ء پیام کلکتہ ۲۸ر دسمبر ۱۹۳۰ء

عربی کے سوا دوسری کوئی زبان نہیں جانتے"

سو اگر مذکور کا بیان ہے کہ یہ قبیلہ اب تک اپنی عربی رسم و رواج پر قائم ہے اور خالص عرب ہے یہ خبر میکسیکو کی حکومت کو معلوم ہوئی تو اس نے ایک کمیشن اس عرب قبیلہ کی تحقیق حال کے لئے روانہ کیا ہے

یہ قبیلہ چار سو برس سے زیادہ سے یہاں آباد ہے اور دوسرے ہمسایہ قبیلوں سے الگ تھلگ زندگی بسر کرتا ہے۔

اس خبر سے عرب جغرافیہ نویسوں کے بیانات اندلس اور پرتگال کے عرب مغررین (فریب خوردہ جہاز رانوں) کی کہانیوں کی تصدیق ہوتی ہے

اس سلسلہ کی آخری خبر یہ ہے کہ لبنان کے عیسائی قانسل انطون یوسف بشارہ نے جنہوں نے میکسیکو میں سکونت اختیار کر لی ہے مصر کے اخباروں میں پچھلے سال یہ اطلاع شائع کی ہے اور جو الفتح مصر مورخہ ۲۳ جمادی الاولیٰ ۱۳۵۴ھ ص ۴۳ میں چھپی ہے کہ وہ میکسیکو میں اپنی زمین واقع ریو گرینڈی (میکسیکو) میں کھدائی کرا رہے تھے کہ انکو دو معدنی ٹکڑے ملے جو تحقیق کے بعد عربی سکے ثابت ہوئے اس دریافت کا وہاں کے علمی حلقوں میں بڑا چرچا ہے۔

کولمبس اور امریکہ

یہ تحقیق تو الگ ہی مشہور یوں ہی ہے کہ کولمبس پہلا شخص ہے جس نے اس نئی دنیا کو پرانی دنیا سے ملا مگر اس نے جو کچھ پایا اتفاقیہ پایا کہ ع آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے۔

کولمبس ہندوستان اور چین کی تلاش میں تھا کہ امریکہ پہنچ گیا کسی علمی استدلال سے وہ اس نتیجہ پر نہیں پہنچا۔ اور بقول ایک اطالوی عالم ہیئت اور مستشرق کرلو نلینو کے کہ کولمبس عربوں کی مقدار مسافت

اور میل کے صحیح اندازہ کے نہ جاننے کی مبارک غلطی سے امریکہ پہونچ گیا"
فاضل اطالوی عالم کی اصل عبارت عربی کا ترجمہ یہ ہے:-

"لاطینی کتابوں کے عربی ترجمونکے ذریعہ سے مامون نے ایک درجہ فلکی کی پیمائش کا جو اندازہ نکالا تھا یعنی ۵۶ ۲/۳ میل وہ یورپ میں بھی مشہور ہوا اور جس طرح یونانی اور سریانی کتابوں کے عربی ترجمے کے ذریعہ سے یونانی میل کی مقدار نہ جاننے سے اہل عرب نے غلطی کی اسی طرح چودہویں اور پندرہویں صدی میں عربی میل کی صحیح مقدار نہ سمجھنے کے سبب اہل یورپ غلطیوں میں مبتلا ہوگئے انہی میں کرسٹوفر کولمبس امریکہ کا پتہ لگانے والا بھی تھا۔ اس نے ایک درجہ کے ۵۶ ۲/۳ عربی میل کو لاطینی ۵۶ ۲/۳ میل سمجھ کر مغربی یورپ اور ایشیا کے شرقی سواحل کی مسافت اس سے بہت کم سمجھی جو حقیقتاً ہے۔ اگر یہ غلطی نہ ہوتی تو کبھی ممکن نہ تھا کہ مغربی یورپ سے اوقیانوس میں چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں بیٹھ کر صرف چند مہینوں کی خوراک لیکر چین پہونچنے کا تخیل کرتا آخر اس سفر سے رک کر وہ اس غلطی کی بدولت امریکہ جدید بر اعظم میں پہونچ گیا۔ جس نے ایک نئے انسانی دور ترقی کا آغاز کیا۔ یہ غلطی کیسی مبارک تھی جس نے دنیا کو عظیم الشان فوائد سے مالا مال کر دیا[1]

کولمبس اس وقت ظاہر ہوا جب اہل اسپین اندلسی عربوں سے آخری لڑائی لڑ رہے تھے اور انکو اپنے ملک سے نکال رہے تھے۔ اسکا زمانہ اسپین اور پرتگال میں گذرا ایک معمولی ملاح سے جہاز ران تک پہونچا وہ ہیئت جغرافیہ اور سفرنامہ کی کتابیں پڑھا کرتا تھا۔ ایک اسپینی خاتون سے شادی کی۔ اس ذریعہ سے اسپین کے ایک عیسائی خانقاہ کے جغرافیہ داں

---

[1] خطبات علم الفلک عند العرب ص ۲۹۳

زاہب نے ملاچھر اسکا پیشہ یہ ہوگیا کہ وہ جہاز رانوں کیلئے بحری نقشے تیار کرکے فروخت کرتا تھا اور بحری مسافروں اور جہاز رانوں سے معلومات جمع کرتا تھا۔ عکین ابی عربی اور اسپینی لڑائی کے زمانہ میں وہ ملکۂ اسپین سے نئے جزیرہ اور نئے راستوں کے لئے مدد کا طالب ہوا۔ اس زمانہ میں اسپین اور پرتگال کے عیسائی موروں (مسلمان عربوں) کو نہ صرف اسپین بلکہ تمام سواحل و جزائر سے نکالنے کے لئے ہر طرف بحری بیڑے بھیج رہے تھے۔ سواحل بحر محیط سے لیکر سواحل افریقہ سے یہاں تک کہ عرب اور ہندوستان کے سواحل تک سے عرب جہاز رانوں کو لڑ لڑ کر نکال رہے تھے۔ اور ان سے بحری نقشے حاصل کر رہے تھے۔ وہ سونے کی کان والے افریقی ساحل تک بھی گیا تھا۔ جہاں افریقی اور زنگی ملاح بہ کثرت پرتگالیوں کو ملتے تھے۔

بہرحال اس زمانہ میں یورپ اور خصوصاً اسپین اور پرتگال میں علم ہیئت، انشاء، جغرافیہ اور بحری سفر کے معلومات جو کچھ تھے وہ عربی تصنیفات یا ان کے تراجم کے ذریعہ تھے جیسا کہ اس عہد کی تاریخوں میں مورخین نے بیان کیا ہے۔ اور اس طرح کولمبس اپنے نظریہ کی ترتیب و تکمیل میں تمام تر عربوں ہی کی تحقیقات سے مستفید ہوا۔

تمت بالخیر